عہدِ رفتہ کے ممتاز

اقبال شناس



پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

عہدِ رفتہ کے ممتاز اقبال شناس

مؤلف
ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم
(ایم فل اقبالیات، پی ایچ ڈی اُردو)

تلاش اِس کی فضاؤں میں کر نصیب اپنا
جہانِ تازہ مری آہِ صبح گاہ میں ہے

(اقبال)

عہدِ رفتہ کے ممتاز اقبال شناس

مؤلف

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

مثال پبلشرز
رحیم سینٹر، پریس مارکیٹ، امین پور بازار، فیصل آباد

کتاب	:	عہدِ رفتہ کے ممتاز اقبال شناس
مؤلف	:	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم
حروف نگاری	:	ذوالفقار احسن، محمد طارق طیب
حروف خوانی	:	پروفیسر غلام عائشہ
قانونی مشیر	:	شیخ اظہر امین ایڈووکیٹ
خطاطی	:	پرویز اختر حذیفہ
پیش کش	:	محمد علی تبسم، ارسلان رشید
اشاعت	:	۱۴ر اگست ۲۰۱۸ء
صفحات	:	۳۳۰
قیمت	:	۱۰۰۰ روپے

برائے رابطہ

نظریۂ پاکستان اکادمی سرگودھا
بزمِ فکرِ اقبال سرگودھا
پاکستان ادب اکادمی سرگودھا
319-Y، علامہ اقبال کالونی سرگودھا
فون: 048-3711717، ای میل: drharoonsgd@gmail.com

اہتمام

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد
+92-41-2615359- 2643841, Cell:0300-6668284
email: misaalpb@gmail.com

شوروم

مثال کتاب گھر صابریہ سینٹر، گلی نمبر 8، منشی محلہ، امین پور بازار، فیصل آباد

انتساب

ندامت کے چراغوں سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
اندھیری رات کے آنسو بھی اکثر بات کرتے ہیں

☆ اچھا وقت اُنھی کا ہوتا ہے جو کسی کا برا نہیں سوچتے۔

☆ صدقہ مصیبت کو قریب آنے نہیں دیتا لیکن ہم صدقہ مصیبت آنے کے بعد دیتے ہیں۔

☆ عہدِ رفتہ کے ممتاز اقبال شناسوں کا پیغام نسلِ نو تک پہنچانا ایک صدقۂ جاریہ ہے۔

☆ دُعائیں دینے والے سے بڑھ کر کوئی سخی نہیں اور دعائیں سمیٹنے والے سے بڑھ کر کوئی خوش نصیب نہیں۔

نذرِ اقبال

قائداعظم تری سوچوں کے پردوں کا ثمر
عظمتِ ارضِ مقدس تیری آہوں کا اثر
دیکھ کر حیلہ گرانِ اہلِ مغرب کے فسوں
تو نے دوڑایا عروقِ ملتِ بیضا میں خوں
دست گیر و غمگسار و مہرباں تجھ پر سلام
اے ہمارے شاعرِ خُلد آشیاں تجھ پر سلام

ہارون الرشید تبسم

فہرست

اپنی بات

ادب، زندگی کے تغیر و تبدل سے کشید ہوتا ہے۔ تخلیق کار خونِ جگر کی نمو سے اپنے خیالات صفحۂ قرطاس پر بکھیرتا ہے۔ تخلیقی عمل بڑی مشکل سے پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ جس طرح ایک اشک، دل کے لہو سے نمودار ہوتا ہے اسی طرح لفظ ذہن کی گہرائیوں سے لبوں کی دہلیز پر پھڑ پھڑانے لگتے ہیں اور پھر کاغذ کی زینت بنتے ہیں۔ شاعری اور نثر میں کمالات رکھنے والے تخلیق کار اپنی تخلیقات سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ فن کار بالائے زمین سے زیرِ زمین منتقل ہو جاتا ہے اس کا فن زندہ رہتا ہے۔ یہ امر باعثِ افسوس ہے کہ معاشرہ تخلیق کاروں کو جلد بھول جاتا ہے جب کہ ان کے فنون سے استفادہ کرتا ہے لاتعداد اشعار آوارہ پنچھی کی طرح اڑتے پھرتے ہیں لیکن ان کے خالق کا پتہ نہیں چلتا۔ اسی طرح بہت سے نثر پارے اپنے تخلیق کاروں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ معاشرتی ناہمواریوں میں یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ تصویر منظر عام پر ہے لیکن مصور غائب ہو گیا ہے۔ طالبِ علم اور بہت سے دیگر قارئین شاعروں، ادیبوں سے واقف نہیں لیکن ان کی تحریروں سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ تعلیمی و ادبی حلقوں میں بہت سی تخلیقات موجود ہیں لیکن ان کے اہلِ قلم نامعلوم ہیں یہی وجہ ہے کہ بہت سے اشعار اصل شاعر کے بجائے دوسروں کے نام سے مقبول ہو گئے ہیں۔

اقبالیات کے سلسلہ میں بھی یہی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ اقبالیاتی کتب پر مختصر نام سے اقبال شناس کی شخصیت کا پتہ چلتا اور نہ ہی اس کے اسلوب بیان کا پس منظر معلوم ہوتا ہے۔ راقم الحروف (ہارون الرشید تبسّم) کی اقبالیات کے حوالے سے بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مختلف کتابوں کی

ترتیب وتدوین اور تحقیق کے دوران کتابوں کے مؤلفین اور مصنفین کے نام تو موجود ہیں لیکن ان کا تعارف عنقا ثابت ہوا۔ زیرِ نظر کتاب ''عہدِ رفتہ کے ممتاز اقبال شناس'' کے علاوہ بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن کے مرتبین کا تعارف کوشش کے باوجود دستیاب نہ ہوسکا۔ راقم الحروف نے متعدد اقبال شناسوں کو خطوط تحریر کیے لیکن مجموعی طور پر سرد مہری کا مظاہرہ سامنے آیا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر منیر سلیچ، اکٹر طاہر حمید تنولی، اشرف ذکی اعوان، ڈاکٹر ایوب صابر، چودھری عنایت علی، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، اکٹر نذیر احمد تبسم، پروفیسر ڈاکٹر اباسین یوسف زئی، ڈاکٹر طالب حسین سیال اور سید قیصر علی شاہ کی معاونت سے اہم معلومات میسر آئیں۔

''آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل'' کے مصداق ہم محسنین ادب اور اقبال شناسوں کو فراموش کر رہے ہیں۔ پاکستان میں اقبال شناسوں کی کمی نہیں ہے لیکن رفتگاں کے لیے کام کرنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ ''عہدِ رفتہ کے ممتاز اقبال شناس'' میں جو مرحومین شامل ہیں، ان کی علمی و ادبی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے اُمید ہے کہ اقبالیاتی محققین اس کتاب سے استفادہ کر سکیں گے۔

لفظوں کو حُسن سوچ کو رعنائی دے گیا
اقبال میری قوم کو بینائی دے گیا

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسّم
۳۱۹ وائی علامہ اقبال کالونی سرگودھا
0483-711717
drharoonsgd@gmail.com
۱۰/ اگست ۲۰۱۸ء

OOO

آغا اشرف

(۱۹۱۴ء۔۱۳؍اگست ۱۹۹۶ء)

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال مصور پاکستان کی حیثیت سے ہر پاکستانی کے دل میں مکیں ہیں۔ بہت سے اقبال شناسوں نے علامہ اقبال کے تصورِ آزادی اور قیامِ پاکستان کے خواب کو مختلف کتابوں میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔ وہ احباب جنھوں نے فکرِ اقبال کے شعری ونثری خزینہ میں قیامِ پاکستان کے محرکات کو نسل نو تک پہنچانے کے لیے کوشش کی ان میں آغا اشرف بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے سیال کوٹ کے بعد لاہور کو اپنا مسکن بنایا۔ آغا اشرف نے اسی شہر میں ۱۹۱۴ء کو آنکھ کھولی۔ ابتدائی تعلیم لاہور سے حاصل کی۔ آغا اشرف معروف اُردو، پنجابی ادیب، ڈرامہ نگار فلمی اداکار اور چھوٹی بڑی ۲۰۰ سے زائد کتب کے مصنف و مرتب تھے۔ انھیں وطنِ عزیز سے گہری محبت اور انسیت تھی۔ اس کی جھلک ان کی کتاب ''جہاد پاکستان'' اور ''اقبال اور پاکستان'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی دیگر کتابوں میں ''افق سے افق تک''، ''کرن کرن اندھیرا''، ''لمحوں کے بھنور''، ''لہو لہو مٹی''، ''ایک جنگ ایک المیہ''، ''بدلاں دی چھاں''، ''ہمارے غازی ہمارے شہید''، ''اسلام اور غلامی''، ''عارفین اسلام''، ''فاتحین اسلام''، ''دیس سے باہر''، ''سرورِ کونین ﷺ'' اور ''دل ایک دیا'' شامل ہیں۔

انھوں نے اپنی زندگی کا ایک طویل حصہ لاہور میں گزارا۔ علمی و ادبی تقریبات میں حصہ لیتے رہے۔ ان کی متعدد کتب اسلامی موضوعات پر ہیں۔

''اقبال اور پاکستان'' میں دو موضوعات تفصیل سے موجود ہیں۔ اقبال، ان کے

سیاسی نظریات، ملی شاعری، اور ایک آزاد خود مختار اسلامی مملکت کا قیام۔ ڈاکٹر علامہ اقبال ۱۹۳۸ء میں ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ ان کے وصال کے صرف نو سال بعد اسلامی جمہوریہ پاکستان دنیا کے نقشے پر اُبھرا۔ کوئی بھی تحریک سالارِ کارواں کے بغیر پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتی۔ علامہ اقبال نے ایک نقشہ کھینچا جس میں قائداعظم نے اپنی محنت سے وہ رنگ بھر دیے کہ جن کی چمک سے آج ہم آزاد فضا میں سانس لے سکتے ہیں۔

ڈاکٹر علامہ اقبال کی روح ہم سے سوال کرتی ہے کہ کیا ہم نے پاکستان کو اقبال کے خوابوں کی تعبیر عطا کی۔ اگر ایسا اب تک نہیں ہوا تو کب ہوگا؟ یہ کتاب ایسے ہی جذبات و احساسات کا آئینہ ہے جسے آغا اشرف نے بہت ہی مخلصانہ انداز میں اگلی نسل کے لیے پیش کر دیا ہے۔ ہماری نئی نسل پاکستان کے قیام اور اس سلسلہ میں ہونے والی جدوجہد، قربانیوں کو بالکل بھول چکی ہے۔ ضرورت اس امر ہے کہ نسل نو کو پاکستان اور پاکستانیت سے آگاہ کیا جائے۔ یوں تو ان کی اقبال شناسی ہمیشہ زندہ رہے گی لیکن ایک کتاب کا تذکرہ بہت ضروری ہے۔

"اقبال اور پاکستان"

ناشر: نذیر سنز پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۰ء، صفحات ۱۳۶، قیمت ۱۵۰ روپے

OOO

آغا شورش کاشمیری

(۱۹۱۷ء۔۱۹۷۵ء)

اس کائنات میں کچھ لوگ مثل آفتاب، روشنی لٹاتے ہیں۔ جب وہ اس دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہوتے ہیں تو اُن کی یاد کا اُجالا اُن کے مداحوں کے اذہان کو منور رکھتا ہے۔ شورش کاشمیری کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔

جنوری ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ جب راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 سرگودھا میں جماعت ہشتم کا طالب علم تھا۔ میرے اردو کے استاد محترم چودھری محمد شفیع نے کلاس کو بتایا کہ ملک کے معروف صحافی، مقرر، دانش ور اور تحریکِ پاکستان کے نامور کارکن آغا شورش کاشمیری سرگودھا تشریف لا رہے ہیں۔ اُنھوں نے آغا شورش کاشمیری کے فن خطابت کے بارے میں یوں تفصیل سے اظہارِ خیال کیا کہ دل بے اختیار اُنھیں ملنے پر مجبور ہو گیا۔ اُن دنوں مجھے تحریر و تقریر کا جنون تھا۔ سکول سے فارغ ہو کر میں اپنے چچا زاد مرزا محمد ادریس کے ہمراہ شورش کاشمیری کے دیدار کے لیے سرگرداں ہوا۔ کسی نے کہا کہ وہ ڈپٹی ظفر اللہ یا احسان اللہ باجوہ کے گھر تشریف لے گئے ہیں۔ کسی نے بتایا کہ وہ سید مسعود زاہدی ایڈووکیٹ کی کوٹھی پر ہیں۔ کسی نے اطلاع دی کہ وہ ملبرو ہوٹل میں قیام پذیر ہیں۔ سڑک گردی کرتے کرتے ہم مسلم بازار بالمقابل جامع مسجد، جمعیت علماء اسلام کے دفتر کے آگے اُن کی گفت گو سننے میں کامیاب ہو گئے۔ شورش کاشمیری کے دیدار اور خطاب سننے کا شوق مزید بڑھنے لگا۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۷۱ء کو گورنمنٹ کالج سرگودھا میں ینگ سپیکرز یونین کے زیرِ اہتمام ایک محفل مشاعرہ کے سلسلہ میں مجھے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے ساتھ رابطہ کے لیے لاہور جانا پڑا۔

وائی ایم سی ہال میں مجھے دوسری مرتبہ آغا شورش کاشمیری کے سحر انگیز خطاب سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔

آغا شورش کاشمیری کی ادبی قدر و منزلت اور شخصی عظمت کی جستجو میں معروف صحافی صلاح الدین ندیم کا کردار میرے لیے ایک نئے جذبے کا محرک بنا۔ صلاح الدین ندیم نے شورش کاشمیری کے تاریخ ساز پرچہ ''چٹان'' میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۵ء تک کام کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ موصوف نے سرگودھا پریس کلب کے پلیٹ فارم سے مجاہد ختم نبوت ﷺ کی یاد میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ مجھے اس تقریب کی نقابت کا اعزاز حاصل ہوا۔ صلاح الدین ندیم کی شورش کاشمیری سے شناسائی اور قربت میرے لیے باعث رشک تھی۔ ندیم صاحب نے اپنے اخبار ''میقات'' میں آغا شورش کاشمیری سے اپنی حسین یادوں کو سپردِ قلم کرنے کا سلسلہ شروع کر کے اہل سرگودھا کو شورش کاشمیری کی ولولہ انگیز خدمات سے آگاہ کیا۔

شورش کاشمیری کی متعدد تخلیقات میری ذاتی لائبریری کی زینت ہیں۔ سماجی رہنما الحاج میاں محمد انور نے بتایا کہ لائل پور میں وہ شورش کاشمیری سے ملتے رہے اور گورنمنٹ کالج سرگودھا کے آڈیٹوریم میں بھی شورش کاشمیری دو مرتبہ خصوصی خطاب کے لیے تشریف لائے۔ مولانا محمد صادق سے بھی شورش کاشمیری کے حوالے سے بہت کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ صلاح الدین ندیم کا سپاس گزار ہوں کہ جن کے توسط سے مجھے اردو ادب کے اس کوہ گراں کے خزینۂ علم و عرفان تک میری رسائی ہوئی۔

شورش کاشمیری صرف ایک نام نہیں ۔۔۔ کردار سازی، حق و صداقت اور کلمہ حق کا ادارہ تھے۔ ہزاروں، لاکھوں احباب نے اُن کی زندگی اور اُن کے خیالات بے کراں سے استفادہ کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شورش علم و آگہی کا ایک ایسا سمندر تھے جس میں گوہر ہائے آبدار کے لیے متلاشی ہمیشہ سرگرداں رہیں گے۔ مولانا ظفر علی خاں، حمید نظامی، ایم آر کیانی، پروفیسر منور مرزا اور شورش کاشمیری کے نام حق گوئی و بے باکی کی چٹان پر ہمیشہ کندہ رہیں گے۔ وقت کے جھونکے اِن ناموں کو کبھی نہیں مٹا سکیں گے۔

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

آغا شورش کاشمیری کی پوری زندگی اِس شعر کی تصویر نظر آتی ہے اور میری اِن سے بے پناہ عقیدت کی وجہ بھی یہی ہے۔

آغا شورش کاشمیری ۱۶/اگست ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ وہ کل چھ بہن بھائی تھے، جن میں اُن کا نمبر دوسرا تھا۔ جب اُن کی عمر ایک سال ہوئی تو بڑے بھائی خالق حقیقی سے جا ملے۔ سات آٹھ سال کے بعد اُن کی والدہ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ بچوں کی تربیت کے لیے اُن کے والد نے اُن کی خالہ سے دوسری شادی کی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ اس لیے اُن کی تعلیم و تربیت کا سہرا اُن کی دادی کے سر جاتا ہے۔ اُن کی دادی نے اُنھیں ماں کا پیار دیا، مگر پھر بھی اُن کے دل سے محرومی دور نہ کر سکیں۔ آغا صاحب کی پوری زندگی مشکلات کا سامنا کرتے گزری۔ اُنھوں نے محبّت کی محرومی کا انتظام وقت سے لیا۔ اُنھوں نے حالات سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے وقت ہی کو بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔ سنگلاخ چٹانوں کے باوجود وہ عزم و استقلال کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے۔ اُن کے من میں اقبال کا شاہین بننے کا شوق تھا۔

اُنھوں نے ابتدائی تعلیم لاہور میں حاصل کی۔ وہ شروع سے ہی کم گو اور شرمیلی طبیعت کے مالک تھے۔ سیاست میں دل چسپی بچپن ہی سے اُن کے مزاج میں رچ بس گئی تھی۔ اُنھوں نے زندگی کا ہر روپ دیکھا۔ انسانوں کو وحشی درندہ اور اپنوں کو بے گانہ بنتے دیکھا۔ وہ کسی رشتے سے ہمدردی کی توقع کیے بغیر محنت کرتے رہے۔ مشقِ سخن بھی جاری رہی اور حالات کی چکی پیسنے کا عمل بھی رواں دواں رہا۔ اِن حالات میں ہر ذی رُوح انقلابی سرشت کا حامل ہو جاتا ہے۔ وہ جب پروان چڑھے تو انگریزوں، سکھوں اور ہندوؤں کی مسلمانوں کے خلاف سازشیں جاری تھیں۔ قبضہ گروپ کے خلاف نکلنے والے جلوسوں میں اُنھوں نے بھرپور شرکت کی۔ اِن جلوسوں میں پولیس کے لاٹھی چارج سے سیکڑوں لوگ زخمی ہوتے اور نہتّے مسلمانوں پر انگریز افسر ظلم و ستم روا رکھتے، معصوم بچوں اور بچیوں کو جنسی تشدد کا نشانہ بناتے۔ اُنھوں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اِن حالات نے بغاوت کے جذبے کو مزید اُبھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ گفتار، تحریر اور کردار کے دھنی تھے۔ وہ ذخیرۂ الفاظ کے آغا نہیں بل کہ آقا تھے۔ لفظ اُن کے سامنے دست بدستہ رہتے کہ وہ اُن سے کیا کام لیں۔ وہ حادثاتی طور پر سیاست میں آئے اور پھر لوگوں کے دلوں اور ذہنوں پر چھاتے چلے گئے۔ سیاست کی وجہ سے اُنھیں کئی بار جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑا۔ حکومت کی طرف سے دی جانے

والی تکلیفیں اور صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں مگر آفرین! راہِ حق کے اس مجاہد کے قدم نہ ڈگمگائے۔ حالات کی چٹانیں قلم سے کاٹنے والے میرے ممدوح آغا شورش کاشمیری ۲۵ ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو جنت الفردوس کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

اُن کی زندگی میں ہی اُن پر بہت سے مضامین اور مقالے لکھے گئے۔ اُنھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ اُن کی تصانیف اُن کی ذاتی زندگی کی عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ اُن کے تخلیقی سرمایہ اور اسلامی جذبوں کی ترجمان ہیں۔ اُن کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔

شب جائے کہ من بودم۔ بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل۔ پس دیوار زندان۔ فن خطابت۔ تحریکِ ختم نبوت ﷺ۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ۔ موت سے واپسی۔ تمغۂ خدمت۔ اُس بازار میں۔ ابوالکلام آزادؒ۔ اقبال اور قادیانیت۔ اقبالی جرم۔ ظفر علی خان۔ میاں افتخار الدین۔ نورائن۔ حمید نظامی۔ فیضانِ اقبال۔ مجموعہ ہائے کلام۔ گفتنی ناگفتنی۔ چہ قلندرانہ گفتم۔ الجہاد والجہاد۔

اِن تمام کتابوں پر مفصل تبصرہ کے لیے پی ایچ ڈی سطح کے مقالے کی ضرورت ہے۔ ایم اے اُردو، ایم اے سیاسیات اور ایم اے صحافت کے کئی ایک مقالات مختلف یونی ورسٹیوں میں لکھے جا چکے ہیں۔ اُن کی چند ایک کتابوں کا تعارف نذر قارئین ہے۔ ''بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل''، سوانح عمری ہے جس میں آغا شورش کاشمیری نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ اس میں اُن کی کتاب زندگی کا ہر صفحہ پیچ و خم میں اُلجھا نظر آتا ہے۔ وہ جن حالات سے گزرے وہ اُن کے ذہن اور دل پر جو اثرات مرتب کرتے رہے، کتاب کے صفحات پر منتقل ہوتے گئے۔ اُنھوں نے حیات شورش کے کٹھن حالات، تجربات، مشاہدات کی روشنی قاری تک پہنچا دی ہے۔ اس کتاب کے پہلے صفحے پر اُن کے یہ الفاظ ''میں کیا اور میری سوانح کیا؟ یہ کہانی صرف اس لیے لکھ دی ہے کہ دوسروں کو عبرت ہو'' ہمارے ذہنوں کو منتشر کر دیتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ کچھ لوگ ساری عمر زندگی کے سمندر میں غوطہ زن خوشیوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں، مگر اُن کے ہاتھ میں خالی سیپ کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا۔ مگر پھر بھی اپنی ہمت، کوشش اور حوصلے کی وجہ سے اُن کی ذات دوسروں کے لیے ایندھن اور توانائی کا کام دیتی ہے۔ اِن عالی مرتبت لوگوں کی ہمت اور حوصلہ اُنھیں عظمت کی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ ''بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل''، آغا صاحب نے کسی داد و تحسین کے حصول کے لیے رقم نہیں کی بل کہ یہ کتاب اُمید کی شمع ہے،

اُن لوگوں کے لیے جو کٹھن حالات اور زندگی کی پیچیدگیوں سے گھبرا جاتے ہیں۔ آغا صاحب کی اس کتاب کا انتساب ''مستقبل کے نام'' شاید کہ آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد'' ہے۔

وہ ساری زندگی، حالات کے پیچ و خم میں اُلجھے رہے مگر طویل سیاہ رات کے بعد نکلنے والے امید کے سورج کے منتظر رہے اور آخر کار اُن کا انتظار آزادی کے سورج کے طلوع ہونے پر ختم ہوا۔ یہ اُن کی سچی لگن کا نتیجہ تھا۔ غرضیکہ آغا صاحب کی یہ کتاب اُن کی پوری زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف اُن کی اپنی سوانح عمری ہے بل کہ بہت سے ایسے لوگوں کے حالات و واقعات بھی ہیں؛ جنھوں نے آزادی کے لیے بیش بہا قربانیاں دیں اور نامساعد حالات کے باوجود برداشت اور حوصلے کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ مذکورہ کتاب صرف ایک سوانح عمری نہیں بل کہ تحریکِ پاکستان کی خونچکاں داستان کی لفظی تصویر کشی ہے۔

آغا صاحب نے حکومت کے ناروا سلوک کے علاوہ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی۔ اُن کی کتاب ''موت سے واپسی'' جیل کے دن اور جیل کی راتوں پر مشتمل ایک رپوتاژ ہے۔ یہ رپورتاژ کہیں افسانوی رنگ رکھتی ہے تو کہیں اس پر ناول کا گماں ہوتا ہے۔ خطوط اپنی مقصدیت کے بہاؤ میں قاری کا ذہن تسخیر کر لیتے ہیں۔ انھوں نے کتاب میں اُن تمام حالات اور مشکلات کو پیش کیا جس سے اُنھیں قید کے دوران نبٹنا پڑا۔ اُنھوں نے ہر مشکل کا جواں مردی اور بلند حوصلے نے مقابلہ کیا۔ اُنھوں نے مایوسی کے اندھیروں میں ڈوبنے کی بجائے اپنی ہتھیلی پر ہمیشہ امید کا دیا جلائے رکھا اور اس چراغ کو حالات کی تیز و تند آندھیوں سے بچانے کی کوشش میں سرگرداں رہے۔ اُن کی کتاب ''موت سے واپسی'' ہمارے دل میں آغا صاحب کے لیے عقیدت کے جذبے کو مزید تقویت پہنچاتی ہے۔ جیل میں اُنھیں قید تنہائی میں رکھا گیا۔ وہ ذیابیطس کے مریض تھے۔ دورانِ علاج اُنھیں زہر دے کر قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔ بیماری کے باوجود وہ کئی دن بھوک ہڑتال پر رہے مگر سرکار کے سامنے سر نہ جھکایا۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے سر کٹوا سکتے تھے مگر سر جھکانے پر کبھی رضامند نہ ہوئے۔ یہ کتاب اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ مقصد نیک ہو اور دل میں لگن اور جذبہ سچا ہو تو جیت حق اور سچ کی ہوتی ہے۔ ''موت سے واپسی'' میں علمی، ادبی اور سیاسی خطوط آغا صاحب کے ذوقِ سخن اور لفظوں پر حکمرانی کے غماز ہیں۔ کئی ایک انگریزی وار دو خطوط، مکتوب نویسی کی تاریخ میں اہمیت کے حامل ہیں۔

''تحریکِ ختم نبوت ﷺ'' ۲۵۶ صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔ یہ کتاب ''شہیدانِ تحریکِ ختم

نبوت ﷺ کے نام" منسوب ہے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

عاشقِ رسول ﷺ، مجاہد تحریکِ ختم نبوت ﷺ آغا شورش کاشمیری نے ناموسِ رسالت ﷺ کے لیے جو قربانیاں دیں۔ وہ تاریخ ختم نبوت ﷺ میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ قادیانیوں کی ریشہ دوانیوں کا یہودیوں کی سازشوں اور غلام محمد کی مکارانہ چالوں کے بارے میں یہ کتاب مختلف حوالہ جات سے مزین ہے۔ کتاب میں پیر طریقت حضرت مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف، علامہ محمد اقبال، ظفر الملت مولانا ظفر علی خان، امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ بخاری اور بطل حریت آغا شورش کاشمیری کی تصاویر بھی نمایاں ہیں۔ کتاب کو ہندوستان میں برطانوی حکومت، میرزا غلام احمد ایک استعماری ضرورت، دینی احتساب کے عالمانہ معرکے، سیدنا مہر علی شاہ کی ضرب ید اللٰہی، علامہ اقبال کا تاریخی بیان، تحریک راست اقدام، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی دار ورسن کی تماشا گاہ میں، تحریک راست اقدام کے بعد، چٹان نے تحریک پیدا کی، قادیانی جاسوس، قومی اسمبلی کا تاریخی فیصلہ ایسے ابواب پر مشتمل یہ تاریخی سرمایا ہمارے ایمان وایقان کو حرارت عطا کرتا ہے۔ یہ کتاب درحقیقت آغا شورش کاشمیری کی زینت کون و مکاں محمد عربی ﷺ سے دلی عقیدت کا اظہار ہے۔

شعری مجموعہ "گفتی ناگفتی" آغا شورش کاشمیری کے شعری سفر کا منہ بولتا اظہار ہے۔ ۲۸۸ صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعے کا انتساب مولانا ظفر علی خان کے نام کیا گیا ہے۔ "گفتی" کے دیباچے میں غلام رسول مہر کے تاثرات شامل ہیں جب کہ "ناگفتی" کے عنوان سے شورش کاشمیری نے شعر کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اُنھوں نے اپنے ہم عصر شعراء کرام کے رویوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ کتاب کے پہلے ۷۴ صفحات اردو ادب میں ملی شاعری اور مقصدیت پر سیر حاصل بحث ہے۔ آغا صاحب کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں، جو اُنھوں نے مختلف موضوعات پر لکھیں۔ اِن نظموں میں آغا صاحب کی ذاتی زندگی کا عکس ابھرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے وہ تمام جذبات واحساسات بھی شامل ہیں جن کا اظہار اُنھوں نے اپنے اردگرد پرورش پانے والی اخلاقی ومعاشرتی کمزوریوں کے ردِعمل کے طور پر کیا۔ حالات کی چیرہ دستیاں، سیاسی رہنماؤں کے ظالمانہ رویے اور منافقت، جاگیردارانہ نظام کی تلخ روایات، معاشرے میں عورت کی بے حرمتی، غربت اور طوائف، یہ سب

آغا شورش کاشمیری کی نظموں میں شامل ہیں۔اُن کی نظموں میں معاشرتی رویوں پر گہرا طنز ملتا ہے۔ وہ منفی معاشرتی رویوں کو مثبت رنگ میں ڈھالنے کے لیے پیغام عمل دیتے ہیں۔وہ آزادی کے خوابوں کو تعبیر دینا چاہتے ہیں۔ بجھے ہوئے منظر کو منور کرنے کے خواہاں ہیں۔دعا جو بے ٹھکانہ ہے، اُسے تاثیر کے روپ میں دیکھنے کے تمنائی ہیں۔وہ سیاسی رہنماؤں کی سوچ بدلنے کا عزم رکھتے تھے۔ منافق لوگوں کے کالے من دھونے کی خواہش رکھتے تھے۔آغا صاحب نے اپنی نظموں میں بہت سے بظاہر امن پسند اور عظیم لوگوں کے چہروں سے عظمت کا نقاب اٹھا کر اُن کا اصل چہرہ دکھایا ہے۔ جاگیردارانہ نظام میں ہونے والے مظالم اور جاگیرداروں کے مکروہ چہروں کی نقاب کشائی کی ہے۔ اُن کی نظمیں اُن کے دل میں پرورش پاتی رہیں۔اُنھوں نے زندگی اور موت کو بہت قریب سے دیکھا وہ سیاسی رہنما جو اُن سے دوستی کے دعوے کرتے تھے مشکل وقت میں کس طرح اُن سے کتراتے رہے۔وہ لکھتے ہیں:

بہت قریب سے دیکھا ہے رہنماؤں کو
بہت قریب سے کچھ راز پائے ہیں میں نے

تاریخ اِس بات کی گواہ ہے کہ کتنے ہی عظیم لوگ اِس دنیا میں پیدا ہو کر انقلاب کی راہیں کھول گئے۔مگر وقت کی گرد نے اُن کے ناموں کو ہمیشہ کے لیے فراموش کر دیا۔اسی بات کو آغا صاحب اپنی نظم ''سوال'' میں بہت دل پذیر انداز میں پیش کرتے ہیں:

اُبھر اُبھر کے کئی آفتاب ڈوب گئے
نکھر نکھر کے کئی ماہتاب ڈوب گئے

اُن کے فن اور اُن کی شخصیت کو کسی بھی صورت علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔اُن کا فن اُن کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔''گفتی نا گفتی'' بھی اُن کی ایک ایسی ہی تصنیف ہے۔ اُنھوں نے ہر دکھ سکھ میں اپنے اصولوں کی پاسداری کی اور کبھی ہمت نہ ہاری۔اُنھیں خدا کی ذات پر مکمل بھروسا تھا وہ لکھتے ہیں:

زر پرستوں کو ہے انکار تو انکار کریں
میرا ایماں ہے غریبوں کا خدا آج بھی ہے

آغا شورش کاشمیری ظلمت کے اندھیروں میں اُجالے کا سفیر بننا چاہتے تھے۔وہ اپنی

ذات کے غارِ حرا میں خیالات کا ایک ہجوم اکٹھا کر لیتے، جو اُنھیں انقلاب برپا کرنے پر اُکساتا۔ اپنی ایک نظم ''عروس البلاد'' میں اِن خیالات کا اظہار کچھ یوں ملتا ہے:

حلقہ بگوش گردشِ دوراں رہا ہوں میں
آہنگِ انقلاب کا عنواں رہا ہوں میں

آغا صاحب نئی تہذیب کے نام پر پھیلنے والے حیا سوز مناظر اور عصمت فروشی کے دھندوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے۔ وہ عورت کی عظمت کی نیلامی کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ عورت جو ماں ہے اور اس کے قدموں تلے جنت ہے۔ بہن ہے تو اس کی شفقت بے کراں ہے۔ بیوی ہے تو اس کی محبت پُر خار راہوں میں ایسی خوشبو ہے جو انسان کو مسحور کر دے اور راہ کے کانٹوں کی چبھن کو وہ فراموش کر کے منزل کی طرف گامزن رہے، مگر جب یہی عورت امراء و روسا اور جاگیرداروں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئی ہے تو عرش بھی اِس کی بے حرمتی پر غم کی تصویر بن جاتا ہے۔ شورش کاشمیری عورت کی عظمت کو زوال کے گڑھوں میں گرنے نہیں دیتے۔ وہ معاشرے کی توجہ اس انداز میں مبذول کرواتے ہیں:

آج کل تہذیب کے اس ارتقائی دور میں
دین فطرت سے بغاوت کے تقاضے عام ہیں
دعوت دامِ ہوس ہے گیسوؤں کا پیچ و خم
ریشمی سینوں کی مخروطی چٹانیں خام ہیں

''چہ قلندرانہ گفتم'' اُن کی نظموں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۶۶ء میں منظر عام پر آیا۔ ۱۴۸ صفحات پر مشتمل یہ شعری تحفہ اُن کے تصوف اور دینی لگاؤ اور وطن دوستی کا اظہار ہے۔ خدا اور اُس کے رسول ﷺ سے عقیدت ہر مسلمان کے دل میں موجزن ہے مگر ہر کسی کا اظہار کا طریقہ جدا ہے۔ کبھی کوئی ساری عمر کی عبادت و ریاضت کے بعد بھی وہ درجہ نہیں پا سکتا' اور کوئی ایک پل کے عمل سے خدا کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ آغا شورش کاشمیری کی روحانیت سے بھرپور شاعری کے مطالعے سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے:

کلیدِ حمد و ثنا لا الٰہ الّا اللّٰہ
خلاصہ ہائے دعا لا الٰہ الّا اللّٰہ

رسول پاک ﷺ کی ذات سے عقیدت و محبّت آغا صاحب کے رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے۔ اُن کی نظم ''آرزو'' میں حضور ﷺ کی ذات سے عقیدت و محبّت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ اُن کے یہ اشعار میری اس بات کی غمازی کرتے ہیں :

قدوم سرورِ کونینؐ کی عظمت بحمد اللہ
میں خاک رہ گزر ہوتا تو پھر بھی کیمیا ہوتا
دماغ و دل چمک اٹھتے رخِ پُر نور کی ضو سے
نظر اٹھتی جہاں تک جلوہٗ خیر الوریٰ ہوتا
بہر عنوان اُس ذات گرامی پر نظر رہتی
کبھی اُن پر کبھی اُن کے غلاموں پر فدا ہوتا
رسول اللہؐ کے ادنیٰ غلاموں کی ثنا لکھتا
کلام اللہ کے الفاظ میں نغمہ سرا ہوتا

''چہ قلندرانہ گفتم'' میں آغا صاحب نے اُن لوگوں کی جھلک بھی دکھائی ہے، جو حکماء کے ہاتھوں کٹھ پتلیاں بن چکے تھے۔ اُنھیں اپنی عزت و غیرت اور ناموس کا کوئی پاس نہ تھا۔ نئی تہذیب نے ہماری بنیادوں کو بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔ اپنی نظم ''کہرام'' میں لکھتے ہیں:

شرع کے نام پہ اسلام کے بت خانے میں
ان فقیہوں میں ہر اک شخص خدا ہے یارو
خوف سے وقت شناسوں کی زبانیں چپ ہیں
کالی راتوں میں کوئی راہنماء ہے یارو
جن کے محلوں میں غریبوں کا لہو جلتا ہے
اُن سے پوچھو تو سہی ، اُن کا خدا ہے یارو

آغا صاحب نے اپنی اس کتاب میں اُن لوگوں کو نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ جنھوں نے مسلمانوں کو بھٹکنے سے بچایا اور ہر قدم پر اُن کی رہنمائی کی۔ اُن لوگوں میں قائداعظمؒ محمد علی جناح، صاحبزادہ فیض الحسن، علی اللہ، ابوالکلام آزاد اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم کے نام سرفہرست ہیں۔ اِس کے علاوہ اُنھوں نے اپنے اردگرد رہنے والے سنگ دل، سفاک اور ظالم لوگوں پر طنز بھی کیا ہے۔

لکھتے ہیں:

نہ خوف آہ انھیں ہے نہ ڈر ہے ناموں کا
''بڑا کلیجہ ہے اُن دل دکھانے والوں کا''

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ آغا صاحب اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے۔ اُنھوں نے اپنے ہم عصروں سے تجربات کشید کیے، اپنے بزرگوں سے اقوال زریں سمیٹے، اور آنے والے وقت کو اصولوں کی دولت سے مالا مال کیا۔ اُن کا قلم، تلوار سے کہیں زیادہ تیز تھا۔ قید و بند کی صعوبتیں اُن کے لیے زندگی کا ایک امتحان تھیں۔ اُنھوں نے قلم کی عزت کا پاس رکھا۔ وہ حالات کی دہلیز پر سرنگوں ہونے کے بجائے بڑی استقامت کے ساتھ مخالف قوتوں کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرتے رہے۔ ایسے عہد ساز لوگ دراصل اپنے الفاظ ہمارے اذہان کے لیے بازگشت کی صورت چھوڑ جاتے ہیں۔ اقبال ان کی تقریروں کا اہم حوالہ تھا۔ اُن کی شعلہ نوائی میں کلامِ اقبال کے منتخب اشعار ولولہ انگیزی کا باعث رہے۔ ''فیضانِ اقبال''، ''اقبال اور قادیانیت'' ایسی کتب کے علاوہ اُن کے مضامین اُن کی اقبال شناسی کے اہم محرکات ہیں۔ اقبالیات کے حوالے سے ان کی یہ کتاب بہت مقبول ہے۔

"اقبال پیامبرِ انقلاب"

ناشر: فیروز سنز لمیٹڈ لاہور، اشاعت ۱۹۶۸ء، صفحات: ۱۹۴، قیمت ۵ روپے

ooo

آغا یمین، ڈاکٹر

(۲۲/اپریل ۱۹۲۴ء۔۲۰۰۶ء)

پروفیسر ڈاکٹر آغا یمین خان نکتہ سنجی، روشن خیالی، تحقیق اور خیال آفرینی کے پیکر تھے۔ ۱۹۹۳ء میں راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد سے ایم فل اقبالیات کا طالب علم تھا تو آغا یمین خان میرے ایک کوڈ کے لیے ٹیوٹر مقرر ہوئے۔ انھوں نے بحیثیت ٹیوٹر میرے مشقی کام کے لیے جس طرح عرق ریزی کا مظاہرہ کیا، وہ قابلِ تقلید اور ستائش ہے۔ میڈم ارشاد فضل اور خاکسار، ان کی رہنمائی میں ایک سال تک کام کرتے رہے۔ آغا یمین نے جب پروفیسر منور مرزا اور ڈاکٹر خالد حمید یزدانی کی رفاقت کا تذکرہ کیا تو ان سے راہِ عقیدت مزید ہموار ہوگئی۔ گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج سرگودھا میں منعقدہ یومِ اقبال ۲۱/اپریل ۱۹۹۲ء کی ایک تقریب میں بھی ان کی گفت گو سننے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر آغا یمین نسل نو تک فکر اقبال کی تفہیم کے لیے بھرپور جدوجہد کرتے رہے۔ انھیں دشت اقبالیات میں ایک عرصہ تک صحرانوردی کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کا خزینہ اقبال دوسروں کے لیے ہمہ وقت کھلا رہتا۔ ہرچند اقبالیات پر ان کی کتابیں منظر عام پر نہ آسکیں لیکن اخبارات ورسائل میں ان کی اقبالیاتی تحریریں آج بھی محققین کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ انھوں نے اس عالم رنگ و بو میں ۲۲/اپریل ۱۹۲۴ء (یہ تاریخ پیدائش اُن کے فرزند خرم صاحب سے حاصل کی) میں آنکھ کھولی۔ مختلف علاقہ جات سے گزرتے ہوئے وہ لاہور مقیم ہوگئے۔

پاکستان کے فارسی ادب کے نامور دانش ور آغا یمین خان شاعر، ادیب اور محقق کے طور معروف ہوئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے سابق استاد شعبہ فارسی کے صدر رہے۔ وہ تمام عمر فارسی زبان وادب کی ترویج وترقی کے لیے سرگرداں رہے۔ ڈاکٹر آغا یمین خان تدریس کے شعبے میں

آنے سے قبل صحافت کے شعبے سے وابستہ تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ڈاکٹر سید نذیر احمد کے زمانے میں آئے وہ نہ صرف فارسی زبان وادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ بل کہ اپنے شاگردوں سے بھی انتہائی محبّت وشفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے فارسی کی کلاسوں کی اجراء بھی ہے۔ یہاں سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور میں چیئر مین فارسی رہے۔ ان کی ڈاکٹریٹ کا مقالہ امریکہ، برطانیہ اور دنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں محفوظ ہے۔

ڈاکٹر صاحب کواللہ تعالیٰ نے چار بیٹوں سے سرفراز کیا جن میں سے دو بفضلہٖ تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ ایک لندن میں میڈیکل کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں اور اپنی فیملی کے ہمراہ لندن میں مقیم ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں آغا یمین خان اپنے صاحبزادے ڈاکٹر فاروق یمین کی دعوت پر انگلستان بھی گئے مگر پاکستان کی محبّت میں جلد ہی واپس آ گئے۔ دوسرا بیٹا ائیر فورس میں پائلٹ آفیسر تھا۔ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران شہادت سے سرفراز ہوا۔ تیسرا بیٹا یونی ورسٹی کا طالب علم تھا۔ یونی ورسٹی کی طرف سے سوات کے سیاحتی وتعلیمی دورے پر گیا، ٹریفک کے حادثے کے دوران شہید ہو گیا چوتھا بیٹے نے ایم کام کیا ہوا ہے اور ایک مالیاتی فرم میں آفیسر ہے۔ اُن کے فرزند خرم کے مطابق پروفیسر ڈاکٹر آغا یمین خان ایک طویل عرصہ تک ''امروز''، ''مشرق''، ''نوائے وقت''، اور انگریزی اخبارات میں بھی لکھتے رہے۔ وہ تحریکِ پاکستان کے ایک سرگرم کارکن تھے۔ ان کی علمی ادبی، ملّی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان کی طرف سے گورنر مخدوم سجاد حسین قریشی نے ان کو تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا۔ وہ ایک محبّ الوطن انسان تھے۔ اپنے وطن عزیز کی محبت سے سرشار ہو کر انھوں نے یہ ملی نغمہ تخلیق کیا۔ ''پاکستان جان ما جان ما ایمان ما'' تحریر کیا جو کہ فریدہ خانم کی مدھر آواز میں ریکارڈ کیا گیا۔ اس نغمے نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ انھوں نے انگریزی زبان میں شاعری کی جسے بہت سراہا گیا۔ وہ نہ صرف فارسی زبان بل کہ انگریزی اردو اور پنجابی کے قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کا انتقال ۷ جون ۲۰۰۶ء بروز بدھ کو ہوا۔ ان کی آخری آرام گاہ بی بلاک فیصل ٹاؤن قبرستان میں ہے۔

''اقبال اور نژادِ نو'' (مقالات)

بزمِ اقبال کلب روڈ لاہور، صفحات: ۱۴۷، قیمت ۱۸ روپے، اشاعت جون ۱۹۸۶ء

ooo

آل احمد سرور، پروفیسر

(۱۹۱۱ء۔۲۰۰۲ء)

پروفیسر آل احمد سرور اردو میں محتاج تعارف نہیں ہیں وہ بحیثیت شاعر اور نقاد بلند مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ وہ ۹ راگست ۱۹۱۱ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ آگرہ اور علی گڑھ یونی ورسٹی میں تعلیم پائی۔ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ وہاں سے ۱۹۴۶ کو لکھنؤ یونی ورسٹی چلے گئے۔ لکھنؤ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو فارسی میں ریڈر کے عہدے کا چارج لیا۔ جون ۱۹۵۴ میں سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد شعبے کی سربراہی آل احمد سرور کے حصے میں آئی۔ نومبر ۱۹۵۵ میں آل احمد سرور لکھنؤ چھوڑ کر دہلی چلے آئے۔ آل احمد سرور کے والد مولوی کرم احمد تھے۔ دوران طالبِ علمی میں جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا، اس وقت وہ ایم اے او کالج علی گڑھ سے ایف اے پاس کر چکے تھے اور بی اے کرنے کی تمنا رکھتے تھے مگر والد کی ناگہانی وفات کے سبب انھیں سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے ملازمت کرنی پڑی۔ وہ محکمہ ڈاک میں ملازم ہو گئے۔ ان کی چھوٹی سی زمین داری بھی تھی جس سے کچھ آمدنی ہو جاتی تھی۔ ۳۰ راپریل ۱۹۵۸ کو جب رشید احمد صدیقی ریٹائر ہوئے تو انھیں شعبے کی صدارت سونپی گئی۔ اگست ۱۹۵۸ سے انھیں پروفیسر بنا دیا گیا۔ بقیہ کام ملازمت سے انجام پاتا تھا۔ ملازمت کی مدت میں ان کا تبادلہ مختلف جگہوں پر ہوتا رہا۔ میرٹھ، پیلی بھیت، سیتاپور، گونڈا، علی گڑھ وغیرہ مقامات پر اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔

ان کے والد مولوی کرم احمد کو مذہب سے خاص لگاؤ تھا، جو انھیں وارثت میں ملا تھا، ان کی زندگی شریعت محمدی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ صرف مذہبی نہ تھے بل کہ

وقت کے، تقاضوں سے پوری طرح باخبر تھے اور دنیا کے نشیب و فراز خوب سمجھتے تھے۔ قدرت نے انھیں ذہن رسا بھی عطا کیا تھا ساتھ ہی کتابوں کے مطالعے میں ان کا خاصا وقت صرف ہوتا تھا۔ ان کی شادی بدایوں کے ایک رئیس خاندان میں ہوئی۔ خسر کا نام مولوی حامد بخش اور اہلیہ کا نام تنویر فاطمہ تھا۔ مولوی حامد بخش کا شمار بڑے زمین داروں میں ہوتا تھا۔ وہ بدایوں میں میونسپلٹی کے چیئر مین بھی تھے۔ آل احمد سرور کی والدہ تنویر فاطمہ اپنے پانچ بھائیوں میں سب سے زیادہ مانوس مولوی وحید بخش سے تھیں اور ان کا زیادہ تر قیام انھیں کے گھر پر رہتا تھا۔ یہ قبول صورت اور اپنی چار بہنوں میں سب سے چھوٹی تھیں اپنے بھائیوں سے انھیں کچھ ایسی انسیت تھی کہ اپنی اولاد پر بھی خاطر خواہ توجہ دیناان کے لیے مشکل تھا۔ تنویر فاطمہ کے بطن سے اٹھارہ بچوں نے جنم لیا یہ اپنی لڑکیوں پر لڑکوں سے زیادہ مہربان رہتی تھیں۔ تقریباً چونسٹھ پینسٹھ برس کی عمر میں فروری ۱۹۵۶ میں اس جہانِ فانی سے سدھاریں اور بدایوں کے اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئیں۔

ہائی اسکول کے بعد انھوں نے سینٹ جانس کالج آگرہ میں فرسٹ ائیر سائنس میں داخلہ لیا۔ یہ بات ۱۹۲۸ء کی ہے ان کے والد کا خیال تھا کہ ایف ایس سی کرنے کے بعد انھیں ڈاکٹری کی تیاری کرائیں لہٰذا آل احمد سرور اپنے بڑے چچا کے یہاں آگئے جو اس وقت آگرہ میں مقیم تھے اور شاہ گنج کے قریب رہتے تھے۔ کالج کی دوری یہاں سے ڈیڑھ میل تھی۔ فرسٹ ائیر کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کرنے پر انھیں ٹامس اسکالر شپ ملا۔ آل احمد سرور یوں تو پڑھنے میں ٹھیک تھے مگر طبیعات میں ان کی طبیعت نہیں لگتی تھی۔ سینٹ جانس کالج آگرہ میں اسرار الحق مجاؔز اور معین احسن جذبؔی بھی پڑھتے تھے، یہ دونوں آل احمد سرور سے ایک سال جونیئر تھے۔ جذبؔی اس وقت ملاؔل تخلص کرتے تھے۔ ان دونوں کی شاعری کالج میں بہت مقبول تھی۔ سیکنڈ ائیر کا امتحان پاس کرنے کے بعد آل احمد سرور کی طبیعت سائنس سے اچاٹ ہوگئی۔ وہ تھرڈ ائیر میں آرٹس میں داخلہ لینا چاہتے تھے۔ پروفیسر مہاجن نے بھی کوششیں کیں اور سمجھایا کہ آرٹس ہی پڑھو مگر اپنے چچا کے اصرار پر ایسا نہیں کیا او ربی ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت سینٹ جانسن کالج کا تعلیمی ماحول بہت عمدہ تھا۔ ۱۹۳۲ء میں بی ایس سی کا نتیجہ نکلا تو باوجود سخت محنت کرنے کے آل احمد سرور کو سیکنڈ کلاس نصیب ہوئی۔ جس سے وہ بہت دل برداشتہ ہوئے اور اسی وقت یہ فیصلہ کرلیا کہ سائنس چھوڑ کر انگریزی سے ایم اے کریں گے۔

آل احمد سرور کا گھرانہ خالص مذہبی تھا۔ سبھی چھوٹے بڑے نماز کے پابند تھے اور اس کی

تاکید کی جاتی تھی۔ البتہ سویرے کی نماز پر زور نہیں دیا جاتا تھا جس کی وجہ سے سرور صاحب صبح کی نماز یا تو قضا پڑھتے تھے یا پھر گول کر جاتے تھے۔ روزہ رکھنا سب کے لیے لازمی تھا اور اس میں کبھی کسی نے کوتاہی نہیں کی۔ بدایوں کی جامع مسجد میں مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا عبدالقادر، سید سلیمان ندوی اور مولانا آزاد سبحانی کے خطبات دل چسپی سے سنتے۔

آل احمد سرور کو مطالعے کا ذوق بچپن سے ہی تھا۔ ان کے والد خود بھی مطالعے کے بڑے پابند تھے اور مختلف موضوعات جن میں ادبیات کا حصہ غالب ہوتا تھا، فرصت کے اوقات میں پڑھتے تھے۔ نذیر احمد کے ناول، طلسم ہوشربا، فسانہ آزاد، باغ و بہار، الف لیلہ، تاریخ ابنِ خلدون اور مختلف شعرا کے دواوین اِدھر اُدھر بکھرے ہوتے۔ سرور صاحب نے کم عمری میں چھپ چھپ کر ان کا مطالعہ کیا تھا۔ سینٹ جانس کالج آگرہ کی لائبریری سے بھی اکثر کتابیں گھر لے جایا کرتے جن کو بڑے غور و فکر کے ساتھ پڑھتے۔ ''آبِ حیات'' اور ''گلِ رعنا'' کا مطالعہ انہی دنوں انھوں نے کیا تھا۔

سرور صاحب کی ملازمت کا آغاز ۱۹۳۴ سے ہوتا ہے جب انھوں نے انگریزی سے ایم اے پاس کیا تو ان کے استاد صدر شعبہ انگریزی ہیڈ و ہیرس نے ان سے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو دو برس کے لیے شعبے میں آجائیں اس لیے کہ غلام سرور اتنی مدت کی چھٹی پر انگلستان جا رہے ہیں۔ سرور صاحب نے حامی بھر لی اور آخرکار اکتوبر میں اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ جولائی ۱۹۳۶ء میں ان کا تقرر شعبہ اردو میں ہوا۔ یہ جگہ جلیل قدوائی کے جانے سے خالی ہوئی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں مولانا احسن مارہروی سینئر لیکچرر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تو ان کی جگہ پر آل احمد سرور کا تقرر ہو گیا۔ یہ تقرری ہر طرح مبارک ثابت ہوئی اور آل احمد سرور نے اپنی محنت اور لگن سے شعبے کے وقار میں اضافہ کیا۔ ۱۹۴۴ء تک وہ علی گڑھ میں مقیم رہے۔ اس مدت میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے انھیں رام پور چلے جانے کا مشورہ دیا جہاں انٹر کالج میں پرنسپل کا عہدہ خالی پڑا تھا۔ اس وقت رام پور میں کرنل بشیر حسین زیدی چیف منسٹر تھے اور خواجہ غلام السیدین مشیر تعلیمات ہو کر آنے والے تھے۔ آل احمد سرور پہلے اس کے لیے تیار نہیں ہوئے لیکن جب ڈاکٹر ذاکر حسین نے نشیب و فراز سمجھاتے ہوئے اپنی بات پر اصرار کیا تو یہ راضی ہو گئے ۱۲ مارچ ۱۹۴۵ء سے انھوں نے چھٹی لی، اسی تاریخ کو رام پور پہنچے اور دوسرے دن انٹر کالج کے پرنسپل کا چارج لے لیا۔ یہاں آتے ہی انھوں نے انتظامی امور کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیوں کی جانب خصوصی توجہ دینی شروع کی۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں یوم اقبال دھوم دھام کے ساتھ منایا۔ جس میں

رشید احمد صدیقی، ذاکر حسین، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور مولوی عبدالسلام خاں جیسے دانش وروں نے شرکت فرمائی۔ ۴۵ء میں ہی جے پور میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے وہاں کا سفر کیا۔ اس سفر کے دوران لکھنؤ اسٹیشن پر آل احمد سرور کی ملاقات نورالحسن ہاشمی سے ہوئی جنھوں نے بتایا کہ لکھنؤ یونی ورسٹی میں اردو ریڈر کی جگہ نکلی ہے اور اس کے لیے انھیں درخواست دینی چاہیے۔ مولوی عبدالحق نے بھی اس کے لیے آمادہ کیا کہ لکھنؤ اردو کا مرکز ہے جہاں رہ کر بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ آل احمد سرور نے اس جگہ کے لیے درخواست دی اور اس کے لیے ان کا انتخاب بھی عمل میں آ گیا۔ نواب رام پور انھیں رخصت کرنے کے لیے تیار نہ تھے مگر کسی نہ کسی طرح انھوں نے اجازت لے ہی لی اور ۲۰ اگست لکھنؤ کے لیے روانہ ہوگئے۔

جون ۱۹۵۴ء میں سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد شعبے کی سربراہی آل احمد سرور کے حصے میں آئی۔ وہ فروری ۱۹۵۵ء تک اسی عہدے پر رہے۔ اس درمیان وائس چانسلر رادھا کمل مکرجی نے ایک آڈر کے ذریعہ سید یوسف حسین موسوی کو صدر بنایا۔ موسوی، آل احمد سرور سے کافی جونیئر تھے اور شعبہ فارسی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس ناانصافی کے ردِعمل میں آل احمد سرور نے استعفادے دیا۔ یونی ورسٹی میں اس استعفیٰ کی وجہ سے شور مچ گیا۔ اخباروں میں آل احمد سرور کی حمایت میں بیانات شائع ہونے لگے۔ یونی ورسٹی کونسل کی میٹنگ میں اکثریت اس بات پر متفق تھی کہ استعفیٰ واپس لیا جائے، آخرکار جب یہ بات طے پائی کہ یونی ورسٹی کے قوانین میں اس بات کی صراحت کردی جائے کہ پروفیسر کی عدم موجودگی میں سینئر ریڈر کو ہی شعبے کی سربراہی تفویض ہوگی تو سرور صاحب نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔ آل احمد سرور ۲۰۰۲ء میں انتقال کر گئے۔

آل احمد سرور کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ انھوں نے تعلیمی میدان میں عظیم الشان خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ اردو میں کثرت سے لکھا ہے۔ آل احمد سرور نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک بڑا حصہ کتابی صورت میں منظرعام پر آچکا ہے۔

''ہماری زبان'' میں لکھے گئے ان کے اداریے بھی خاص تعداد میں ہیں جس سے کئی جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔ آل احمد سرور کا اولین شعری مجموعہ ''سلسبیل''، جو ۱۹۳۵ء میں منصۂ شہود پر آیا جس میں شاعر کا تعارف رشید احمد صدیقی نے کرایا تھا۔ ''انجمن اردوئے معلیٰ''، علی گڑھ کی جانب سے اشاعت پذیر ہوا۔ اسے سرور نے چار ابواب میں منقسم کیا ہے۔ باب اول کا عنوان ''فردوسِ نظر''، جس

میں سیر کشمیر کے تاثرات قلم بند ہیں۔اس کے تحت دس منظومات شامل کی گئی ہیں۔باب دوم ''نقش ہائے رنگ رنگ'' کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔اس میں متفرق عنوانات سے بارہ نظمیں ہیں۔باب سوم ''لالہ صحرا'' کے عنوان سے ہے۔باب چہارم ''تغزل'' کے سرنامے کے ساتھ موجود ہے۔اس حصہ میں ۲۷ غزلیات شامل ہیں۔

''تنقیدی اشارے'' آل احمد سرور کی پہلی تنقیدی کتاب ہے۔''نئے اور پرانے چراغ'' آل احمد سرور کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔اسے ۱۹۴۶ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس ''کتاب گھر'' نئی دہلی نے شائع کیا۔''تنقید کیا ہے؟'' آل احمد سرور کے مضامین کا مختصر اور بحیثیت مجموعی تیسرا مجموعہ ہے۔''ادب اور نظریہ'' آل احمد سرور کے تنقیدی مضامین کا چوتھا مجموعہ ہے۔اسے ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے ۱۹۵۴ء میں شائع کیا ہے۔''نظر اور نظریے'' آل احمد سرور کی ایک فکر انگیز کتاب ہے۔اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۳ء میں اور دوسرا ۱۹۸۲ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی سے شائع ہوا۔ ''مسرت سے بصیرت تک'' ۱۹۷۴ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی سے طبع ہوئی۔''پہچان اور پرکھ'' آل احمد سرور کے شائع ہونے والے تنقیدی مجموعوں میں آخری ہے جسے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی نے ۱۹۹۰ میں شائع کیا ہے۔

آل احمد سرور کی تنقید کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ کبھی کسی سیاسی یا ادبی غیر ادبی نظریے کے اسیر نہیں رہے۔انھوں نے تنقید نگار کا جو فریضہ تھا اس پر عمل پیرا رہنا زیادہ ضروری سمجھا۔اسی لیے ترقی پسند تحریک کے وقت بھی انھوں نے اپنے کو متشدد قسم کا مارکسی نہیں بنایا اور جدیدیت کے دور میں بھی ان کے ہاں ایک لچک قائم رہی اور وہ جدیدیوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

اس کے لیے سب سے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہا آل احمد سرور کی تنقیدی کتابوں پر مرتکز ہو کر ان کے مشمولات پر غور کیا جائے۔ان کی پہلی کتاب ''تنقیدی اشارے'' ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔اس میں نصف مضامین شخصیات کے متعلق ہیں۔ایک چوتھائی تاریخی اور تبصراتی مطالعے ہیں۔ اس کتاب کے مضامین کے بارے میں انھوں نے ریڈیو سے نشر ہونے کی بعض مجبوریوں کا بھی ذکر کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مضامین اپنی شگفتگی اور سادہ نظری کے سبب ہی مقبول ہو سکے۔

وہ بالکل ابتدا سے ہی مغربی مصنفین و مفکّرین کے کارناموں سے واقفیت رکھتے تھے اور ظاہر ہے اُردو تنقید کی ویران سرزمین کو شاداب بنانے، اردو قارئین کو نئے نئے فن کاروں کے بارے

میں اطلاعات فراہم کرنے کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا تھا، جیسا کہ یہ اہم کام ہے، اس میں بے اعتدالیوں کے امکانات بھی موجود ہیں اور اُن کے یہاں بعض اوقات ایسی مثالیں مل جاتی ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ادب کو پرکھنے کے معاملے میں انھوں نے ادبی معیاروں کے ساتھ ساتھ غیر ادبی انسلاکات پر بھی توجہ دی۔ اولاً یہ خصوصیت ترقی پسند تحریک کے اثر سے آئی ہوگی لیکن اُن کی اپنی شخصیت کے نہاں خانے میں اسے سجا سنوار کر اسے ایک ایسی خوبی بنا لیا جس میں ان کا کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اب حالت یہ ہے کہ ترقی پسند نقاد انھیں اپنے طور پر لیتے ہیں اور جدید نقاد اپنے معیار و آداب کے تحت قبول کرتے ہیں۔

جب اُنھوں نے لکھنا پڑھنا شروع کیا، اس وقت اگر ایک جانب روس کے انقلاب کی وجہ سے مارکسزم کا سورج نصف النہار پر تھا اور اسی لیے اس سے اثر قبول کرنا تھا اسی طرح دوسری جانب ہندوستان میں آزادی کی جنگ چل رہی تھی اور ہزاروں ادیب و شاعر اس میں مختلف طریقے سے کام آرہے تھے۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز کو دیکھیے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ مارکسزم اور جنگِ آزادیِ ہند دونوں تحریکوں سے استفادہ کرنے والی جماعت ترقی پسندوں کی تھی۔ انھوں نے جواہر لال نہرو، مولوی عبدالحق، پریم چند، آچاریہ نریندر دیو، حسرت موہانی، ٹیگور وغیرہ سے جو تعاون حاصل کیا تو اس کے پیچھے یہی اہم بات تھی۔ یہ تحریک ہندوستان کی سیاسی آزادی کے لیے بھی کام کر رہی تھی اور ادب کی مقصدیت کو بھی سامنے لا رہی تھی۔ اردو کے چند بڑے ناقدین میں آل احمد سرور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

"دانشور اقبال"

ناشر: سید وقار معین، طابع: گنج شکر پریس، لاہور صفحات: ۲۸۸، اشاعت: ۲۰۱۶ء

ooo

ابوالحسن علی ندوی، مولانا، سیّد

(۲۴ نومبر ۱۹۱۴ء۔۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء)

ابوالحسن علی ندوی نے ممتاز عالم دین، مفکّر، مصنّف اور محقق کی حیثیت سے شہرت پائی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۲۴ نومبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام حکیم سید عبدالحفیظ ہے۔ قرآن پاک کی ابتدائی تعلیم اپنی والدہ سے گھر پر حاصل کی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے تعلیم مکمّل کرنے کے بعد وہیں تفسیر وادب عربی کے استاد کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی۔ نظامتِ تعلیم وتربیت اور ثقافتی سرگرمیوں کا شعبہ بھی سنبھال لیا۔ تصانیف وتحقیقات بکثرت ہیں۔ زیادہ مشہور تصانیف ہیں ''تاریخ دعوت وعزیمت'' (چھ جلدیں)، ''مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش''، ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر''، ''نبیٔ رحمت ﷺ''، ''معرکۂ ایمان و مادیت''، ''منصبِ نبوت''، ''پرانے چراغ''، ''تعمیرِ انسانیت''، ''نقوشِ اقبال'' اور ''حدیث پاکستان'' شامل ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مختلف موضوعات پر پچاس کے لگ بھگ کتابیں تصنیف کیں۔

تاہم اقبال کے حوالے سے ان کا کام زیادہ مقبول عام ہوا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے علامہ اقبال کے افکار کو اہلِ عرب تک پہنچانے کا بیڑہ اُٹھایا اور اس مقصد کے لیے انھوں نے ''روائع اقبال'' کے نام سے کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب کی اشاعت بیروت اور دمشق میں ہوئی۔ کتاب کی تصنیف کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ عربی کے علاوہ دوسری کوئی زبان نہیں جانتے علامہ کی شاعری میں جگمگاتے افکار کے جگنوؤں کی مدد سے راستے کا تعین کر سکیں۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر شمس تبریز خان نے ''نقوش اقبال'' کے نام سے اس کا ترجمہ پیش کیا ہے تاکہ عربی سے نابلد

لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔

شمس تبریز نے کتاب کے ترجمہ کے علاوہ کچھ اضافہ بھی کیا ہے جس میں ''اقبال اور وطنیت'' اور ''عورت اقبال کے کلام میں'' کے عنوان سے مضامین شامل ہیں۔ کتاب کا مقدمہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے انھوں نے اس امر پر زور دیا ہے کہ سید صاحب اقبال کے پورے کلام کا عربی میں ترجمہ کریں تاکہ علامہ کے کلام سے اہلِ عرب بھی بھرپور فائدہ اٹھا سکیں۔ تراجم کی روایت قدیم ہے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا کلام آفاقی نوعیت کا ہے۔ انھوں نے اسلامی جذبوں کی بھرپور انداز میں نمائندگی کی ہے۔ کلام اقبال کا عربی ترجمہ بہت بڑی علمی وادبی خدمت ہے۔ یہ کتاب عربی زبان وادب میں اپنی نوعیت کی منفرد ہے کہ شاعر اسلام اردو سے عربی زبان میں بولنے لگا ہے۔ عربی زبان مسلمانوں کے اتحاد کی آئینہ دار ہے۔ عالم اسلام کو اس زبان پر خاص توجہ دینی چاہیے۔ آج یورپ اپنے سکے کی وجہ سے اتحاد کے پلیٹ فارم پر آچکا ہے۔ اسی طرح ہمیں عالم اسلام میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے کے لیے اردو انقلابی کتب کا عربی میں ترجمہ بہت ضروری ہے۔ ''روائع اقبال'' نے جہاں اقبال کو عرب میں روشناس کروایا ہے وہاں ''نقوشِ اقبال'' اقبالیاتی ادب کے طالب علموں کی رہنمائی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں جب حج کے لیے مکہ تشریف لے گئے تو بیت الحرام کے دروازے کو آپ کے لیے دو دن کے لیے کھول دیا گیا۔

ابوالحسن علی ندوی نے ۲۳ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ بمطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو ۸۵ سال کی عمر میں رابیرلی (انڈیا) میں وفات پائی۔ ان کی اقبالیاتی ادب میں مقبول کتاب کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

''نقوشِ اقبال''

پبلشرز : مجلس نشریاتِ اسلام کراچی، اشاعت: ۱۹۸۸ء، صفحات: ۳۲۰

○○○

ابواللّیث صدیقی، ڈاکٹر

(۱۵ جون ۱۹۱۶ء۔ ۷ ستمبر ۱۹۹۴ء)

پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اردو زبان و ادب کے ممتاز ادیب، نقاد، محقق اور ماہر تعلیم سابق استاد شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج لاہور کی حیثیت سے ہمارے دلوں میں آج بھی زندہ ہیں۔ پنجاب یونی ورسٹی کے در و دیوار ان کی خدمات کے گواہ ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی موجودگی میں میری ان سے تین ملاقاتیں یادگار ہیں۔ حکیم محمد سعید کے زیر سرپرستی ہونے والی شام ہمدرد میں ان کا کلیدی کردار ہوا کرتا تھا۔ انجمن ترقی اردو سرگودھا کے بانی صدر مولانا اخگر سرحدی ان کی قومی زبان کے لیے خدمات کو ہدیۂ تحسین پیش کرتے تھے۔ میجر آفتاب (کراچی والے) بھی ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے لیے رطب اللسان رہتے تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۱۵ جون ۱۹۱۶ء کو اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ تاہم ان کا آبائی وطن بدایوں ہے۔ ابتدائی تعلیم آگرہ اور بدایوں سے حاصل کی۔ مسلم یونی ورسٹی میں جب آنرز کی کلاسیں شروع ہوئیں تو ابواللیث صدیقی نے بھی داخلہ لیا اور شعبۂ اُردو سے پہلے پی ایچ ڈی ہونے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ انھوں نے حصولِ علم کے بعد درس و تدریس کا شعبہ اپنایا۔ شعبۂ اُردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۸ء تک وابستہ رہے۔ ان کا دس سالہ دور اردو زبان کے فروغ اور ادبی اعتبار سے یادگار رہے۔ ابواللیث صدیقی کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کے سربراہ بھی رہے ہیں۔ اس کے علاوہ مدیر اعلیٰ اردو لغت بورڈ کراچی میں ان کی علمی و ادبی خدمات (۱۹۶۲ء سے لے کر ۱۹۸۴ء) ناقابلِ فراموش ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی میں گہرے ادبی روابط رہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا شام دوستاں میں ڈاکٹر مشفق خواجہ اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے۔ ان کی کتب میں ''لکھنؤ کا دبستان شاعری''، ''کلیاتِ مصحفی''، ''آج کا اردو ادب''، ''غزل اور متغزلین''، ''تاریخ زبان وادبیات اُردو''، ''تاریخ اصول تنقید''، ''جدید اردو ادبیات''، ''اُردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ''، ''تجربے اور روایت''، ''ملفوظات اقبال''، ''اقبال اور مسلک تصوف''، ''جمال القواعد''، ''تنقید وتبصرہ امراؤ جان ادا'' اور ''اُردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ'' ایسی نایاب کتب شائع ہوئیں۔ پاکستان آنے کے بعد انھوں نے کولمبیا یونی ورسٹی میں لسانیات کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی اور کراچی یونی ورسٹی میں اپنی تدریسی خدمات دیں۔ کراچی یونی ورسٹی میں بیس سال تدریس اردو کے لیے گراں قدر گہر علم و آگہی نچھاور کرتے رہے اور پروفیسر ایمریطس کے عہدہ جلیلہ پر بھی فائز رہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے تقریباً پچاس سے زائد پی ایچ ڈی مقالوں کی نگرانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔

پروفیسر ابواللیث صدیقی نے اردو لغت بورڈ کے مُدیرِ اعلیٰ کی حیثیت میں تحقیقی سرگرمیاں محققین کے لیے مینار نور ثابت ہوئیں۔ انھوں نے اردو لغت کی پہلی چھ جلدوں پر کام کیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جہاں لسانیات، تاریخ ادب، تنقید ادب پر گراں قدر محنت کی ہے وہاں انھوں نے فکرِ اقبال کی تفہیم کے لیے بھی جدو جہد کی۔ پروفیسر ابواللیث صدیقی نے تقریباً بیس کے قریب نادر اور نایاب موضوعات پر کتب بھی اردو ادب کے دامن میں ڈالی ہیں۔ ان کا یہ علمی و ادبی سرمایہ آج بھی کشتگانِ علم وادب کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

''اقبال اور مسلک تصوف'' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی وہ شاہکار کتاب ہے جس میں انھوں نے تصوف کے بارے میں علامہ اقبال کے نظریات کا احاطہ کیا ہے۔ مصنّف نے علامہ اقبال کے فرمودات اور اشعار کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ علامہ صوفیاء کے نظریات کے قائل بھی تھے اور خود بھی سلسلۂ قادریہ میں بیعت تھے۔ پہلے حصے میں ایرانی اور ہندی پس منظر میں تاریخِ تصوف کا جائزہ لیا گیا ہے جب کہ اسی باب کے دوسرے حصہ میں تاریخ تصوف ہندی، یونانی اور اسلامی پس منظر پر نظر ڈالی گئی ہے۔ تیسرے حصہ میں برعظیم میں تاریخ تصوف اسلام پر بحث ملتی ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۷ ستمبر ۱۹۹۴ء کو ہمیں داغِ مفارقت دے گئے انھیں جامعہ کراچی میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے اقبالیاتی سرمایہ میں دو کتابوں نے

شہرت دوام حاصل کی۔

"ملفوظاتِ اقبال" (مع تعلیقات وحواشی)

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان ۹۰۔بی۔۲۔گلبرگ ۳ لاہور، اشاعت ۱۹۷۷ء

"اقبال اور مسلکِ تصوف"

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: ۱۹۷۷ء، صفحات: ۶۴۷، قیمت: ۱۷ روپے

ooo

ابو محمد مصلح

مولوی ابو مصلح ضلع شاہ پور (صوبہ بہار، انڈیا) میں پیدا ہوئے اور وہیں اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی انھوں نے لوگوں کی زندگیوں کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنے کے لیے تبلیغ دین کا کام ایک مشن سمجھ کر کیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ قرآن کی اشاعت اور دین کی تبلیغ کے سلسلہ میں شاہ پور سے حیدر آباد آ کر آباد ہوئے۔ قرآن پاک کا ابدی پیغام لوگوں تک پہنچانے میں انھوں نے بہت محنت کی۔ قریہ قریہ، شہر شہر جا کر انھوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتابِ ہدایت ورشد کا پیغام دینے میں زندگی گزار دی۔ انھوں نے حیدر آباد میں ہی ''دی قرانک ورلڈ'' کے نام سے اردو اور انگریزی زبان میں اسلامی میگزین کا اجراء کیا۔ یہ رسالہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ ابو محمد مصلح کے اس رسالہ نے کئی لوگوں کو دین کے راستے کی طرف متوجہ کیا۔ ان کا رسالہ ہندوستان بھر میں مقبول رہا۔ اسے مذہبی حلقوں میں خاصی پذیرائی حاصل تھی۔

حضرت علامہ محمد اقبال کے ساتھ ایک دلی وابستگی رکھتے تھے۔ علامہ محمد اقبال ۱۹۲۹ء میں جب عثمانیہ یونی ورسٹی میں خطبات کے سلسلہ میں حیدر آباد پہنچے تو مولوی ابو مصلح نے نذیر یار جنگ کے ہمراہ اقبال سے ملاقات کی۔ علامہ محمد اقبال ان کے مشن اور کام کے بارے میں جان کر خوش ہوئے۔ اقبال نے فرمایا کہ آپ کی تحریک سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟

مولوی ابو مصلح اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ۱۹۳۶ء کو حیدر آباد سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے اور بادشاہی مسجد کے ایک حجرہ میں مقیم ہوئے۔ وہاں مختلف مکتبہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ قرآن کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ انہی دنوں وہ اقبال کے در دولت پر بھی حاضری دیتے اور

اقبال سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کا بھی موقع نصیب ہوا۔ مولوی ابو مصلح نے ایک ملاقات پر علامہ محمد اقبال کو اپنی چند کتابیں اور رسائل دیں اور ایک ایسے قاعدے کا ذکر کیا جس کی مدد سے بچوں کو قرآن بڑی آسانی سے پڑھایا جا سکتا تھا۔ علامہ محمد اقبال نے ان کے کام کی بے حد تعریف کی اور وہ قاعدہ عبداللہ چغتائی کے ذریعے مولوی صاحب سے حاصل کیا تا کہ اس کی مدد سے جاوید اقبال کو قرآن پڑھایا جا سکے ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال کے انتقال کی خبر انھیں جب ملی تو ایسے لگا جیسے ان پر بجلی گر گئی ہو، وہ سکتے میں آ گئے اور پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اقبال کے ساتھ انھیں محبت اور عشق تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اب ان کے مقاصد اور مشن کو سمجھنے والا کوئی نہیں رہا۔ لہٰذا اقبال کی وفات کے بعد لاہور کو خیر باد کہہ کر کے حیدر آباد آ گئے۔ حیدر آباد پہنچ کر انھوں نے ''اقبال اور قرآن'' کے نام سے ایک نہایت عمدہ کتاب تصنیف کی۔

ڈاکٹر علامہ اقبال نے جس ماحول میں آنکھ کھولی، وہ خالصتاً اسلامی تھا۔ ان کے والد یعنی نور محمد اور ان کی والدہ امام بی بی بہت نیک سیرت تھے۔ علامہ اقبال قرآن پاک خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔ قرآن پاک اور عشقِ رسول ﷺ اقبال کی شاعری کے اہم ماخذ ہیں۔ ان کے اردو اور فارسی کلام میں قرآنی آیات کا استعمال ملتا ہے۔ ابو محمد مصلح نے کلامِ اقبال کا عمیق مطالعہ کیا۔ انھوں نے اقبال کی شاعری و نثر سے قرآنی حوالے یک جا کر کے ''قرآن اور اقبال'' اپنی قرآن پاک سے محبت اور اقبال سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ قرآن پاک سے تلمیحات اخذ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ حد ادب اور قرآن کی عظمت کا پاس رکھنا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ علامہ اقبال نے اس نازک مرحلے کو جس انداز سے طے کیا ہے، وہ ان کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے۔ ابو محمد مصلح کا یہ ادبی کارنامہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

''قرآن اور اقبال''

پبلشرز: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، صفحات: ۲۰۰، قیمت: ۱۵۰روپے

ooo

احمد دین، مولوی

(۱۸۶۶ء۔۱۹۲۹ء)

مولوی احمد دین ۱۸۶۶ء میں لاہور میں ڈاکٹر الہٰ دین کے ہاں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گوجرانوالہ میں حاصل کی۔ پھر ان کے والدِ گرامی کا تبادلہ لاہور ہوا تو اپنے خاندان کے ہمراہ لاہور سکونت اختیار کر لی اور اپنے بیٹے احمد دین کو سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں داخل کروایا۔ یہاں سے احمد دین نے میٹرک کا امتحان نمایاں نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے پہلے ایف اے اور پھر گریجوایشن مکمل کی۔ مولوی احمد دین ایم اے کرنا چاہتے تھے مگر قسمت انھیں قانون کی تعلیم کی طرف لے آئی۔ انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا۔ ''پیسہ اخبار''، ''اردو اخبار'' اور ''غم خوار عالم'' ایسے اخبارات میں کام کیا۔ ان کی علمی و ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز اسی ''پیسہ اخبار'' سے ہوتا ہے۔ ان کی چند کتابیں بھی ''پیسہ اخبار'' کی خادم التعلیم اسٹیم پریس لاہور نے شائع کیں۔ احمد دین ''اردو اخبار'' میں بھی کام کرتے رہے۔ اس اخبار کے ساتھ ان کی وابستگی کے بارے میں معروف محقق، کالم نگار اور نقاد مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

> ''احمد دین کی ملازمت کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ وہ اردو اخبار کے لیے مضامین بھی لکھتے تھے اور ادارے کے لیے کتابیں بھی تحریر کرتے تھے۔ اس زمانے میں احمد دین نے جو کتابیں لکھیں، ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی اور اس ادارے کی طرف سے شائع ہونے والی بعض کتابوں پر مصنف کا نام بھی نہیں ہوتا تھا۔ ''مؤلفہ و مرتبہ کار پردازانِ اردو اخبار'' لکھا جاتا تھا۔ اس قسم کی ایک کتاب ''دوست محمد خاں'' کے بارے میں ثبوت ملا ہے۔۔۔ یہ

احمد دین کی تصنیف ہے ممکن ہے ایسی اور کتابیں بھی شائع ہوئی ہوں، جن پر احمد دین کا نام بطور مصنف درج نہ ہو۔"

احمد دین نے زندگی میں دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے پانچ لڑکے اور دو لڑکیوں نے جنم لیا۔ دوسری بیوی سے چار لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ ان میں سے تین بیٹے خواجہ ریاض احمد، خواجہ امتیاز احمد، اور خواجہ اعجاز احمد اور ایک بیٹی محمود ممتاز موجود ہیں۔ باقی کا انتقال ہو چکا ہے۔

مولوی احمد دین علامہ کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔"اقبال" علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔"اقبال" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۳ میں منظرِ عام پر آئی، دوسری بار ۱۹۲۶ء میں منظرِ عام پر آئی۔ مشفق خواجہ نے لکھا ہے کہ"۱۹۲۳ء تک جب کتاب طبع ہوئی، اقبال کے اردو کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ احمد دین نے اپنی کتاب میں اقبال کا وہ تمام کلام شامل کر لیا تھا، جو'مخزن' اور بعض دوسرے رسائل میں نیز انجمن حمایت اسلام کی رودادوں میں شائع ہوا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب اقبال اپنے اردو کلام کی اشاعت کی طرف متوجہ تھے اور اسی مقصد سے کلام پر نظر ثانی کر رہے تھے۔

مولوی احمد دین کا شمار بلند پایہ وکلاء میں ہوتا تھا۔ اقبال کے نہایت قریبی دوست تھے۔ انھیں اقبال کے بہت نزدیک رہنے کا موقع ملا۔ مولوی احمد دین کے استاد مکرم مولانا محمد حسین آزاد نے ان کے ہاں علمی و ادبی ذوق بے دار کر دیا تھا۔ حکیم شہباز الدین کی بیٹھک میں ہونے والی شعری نشستوں میں اقبال سے ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات ان کی وفات تک طویل ہوتی چلی گئی تھی۔

احمد دین، انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسوں میں شریک ہو کر تقریریں اور مقالے بھی پڑھتے رہے۔ ۱۹۰۴ء کو شائع ہونے والی سالانہ روداد میں ان کا ایک مضمون"راز و نیاز" شامل ہے۔ ان کی کتب میں"ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب، افواج دنیا، اسرار حرم، اقوام ترکی، عبدالقادر جیلانی، عربستان اور اہلِ عرب، مہد الاسلام، ابوالفضل کے سوانح عمری، سوانح عمری حاتم طائی، آسمان کی سیر، حیات ٹوڈرمل، جلال الدین اکبر، لیلیٰ یا محاصرہ غرناطہ، درمکتوم یعنی حیات زیب النساء، مہاتما بدھ، شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ، دوست محمد خاں، سرگذشت الفاظ اور اقبال شامل ہیں۔ پانچ کتب ایسی ہیں جن کے بارے میں یقین ہے کہ یہ کتب بھی احمد دین کی ہی ہیں ان میں"ملا دو پیازہ"، "راجہ بیربر"، "حیات نور جہاں و جہانگیر"، "سوانح حضرت علیؓ"، "مہاراجہ سیواجی مرہٹہ" ان کے

بارے میں مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

"یہ پانچوں سوانح عمریاں ہیں۔احمد دین کی متعدد تصانیف اسی نوعیت کی ہیں، اس لیے قیاس ہے کہ یہ بھی انھیں کی تصانیف ہوں گی۔ان کتابوں میں سے ایک سوانح عمری حضرت علی راقم کی نظر سے گزری ہے اس پر بطور مصنف احمد دین کا نام درج نہیں ہے بل کہ "مرتبہ و مؤلفہ کار پردازان دفتر اردو اخبار" لاہور لکھا ہوا ہے۔یہی الفاظ کتاب "دوست محمد خاں پر بھی لکھے ہیں۔"

چوں کہ "اردو اخبار" مرتبہ و مؤلفہ کار پردازانِ اردو اخبار" درج ہوتا تھا لہٰذا ایسی کئی کتابیں ہیں جو کہ مولوی احمد دین نے لکھیں اور ان پر یہی الفاظ درج ہوتے تھے۔ممکن ہے کہ مذکورہ بالا پانچ کتابیں بھی مولوی احمد دین کی ہی ہوں۔

مولوی احمد دین انجمن حمایت اسلام کے فعال رکن اور اسلامیہ کالج کمیٹی کے سیکرٹری بھی رہے۔اس وجہ سے بھی ان کا تعلق اقبال کے ساتھ رہا۔۱۹۲۱ء میں اقبال کو ایک مقدمہ کے سلسلہ میں کشمیر جانا پڑا تو انھوں نے مولوی احمد دین کو بھی ساتھ لیا کیوں کہ مولوی احمد دین دیوانی مقدمات کے بڑے ماہر وکیل تصور کیے جاتے تھے۔اقبال کا خیال تھا کہ مولوی احمد دین ان کے ساتھ دیں گے۔ یہی وہ دن تھے جب مولوی احمد دین کو اقبال کے بہت قریب رہنے کا موقع نصیب ہوا اور انھوں نے اقبال کی شاعری کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔انھوں نے اقبال کی شاعری کا فکری وفنی جائزہ لیا۔اور ایک شان دار کتاب لکھی، جسے انھوں نے "اقبال" کا عنوان دیا۔اقبال کی زندگی میں چھپنے والی یہ پہلی کتاب تھی۔اس سے قبل وہ ایک کتاب "سرگزشت" کے نام سے بھی لکھ چکے تھے جس پر انھیں ایک ہزار روپے انعام بھی ملا تھا۔

مولوی احمد دین کی کتاب "اقبال" پڑھ کر علامہ محمد اقبال کو "بانگ درا" کو مرتب کرنے کا خیال آیا۔علامہ محمد اقبال ازراہِ مذاق کہا کہ میں تو ابھی نظر ثانی کر کے کتاب شائع کرنے ہی والا تھا کہ مولوی احمد دین اقبال کو فروخت کرنے لگ گئے ہیں۔یہ بات اڑتے اڑتے جب مولوی احمد دین کے پاس پہنچی تو انھیں دکھ ہوا اور پبلشر سے ساری کتاب منگوا کر اسے آگ لگا دی۔اقبال کو جب اس بات کا علم ہوا تو بڑا افسوس کا اظہار کیا اور مولوی صاحب سے باقاعدہ معذرت کی اور انھیں دوبارہ یہ کتاب چھاپنے کے لیے راضی کیا۔

مولوی احمد دین آخر عمر میں بیمار رہنے لگے اور ان کی بیماری بڑھتی چلی گئی۔ اقبال اکثر ان کی تیمار داری کے لیے ان کے در دولت پر حاضری دیتے رہتے۔ بالآخر مولوی احمد دین ۱۹۲۹ء کو انتقال کر گئے۔ اقبال بھی سخت بیمار تھے ڈاکٹر نے انھیں جنازے میں شرکت کی بھی اجازت نہ دی۔ اقبال کو اس کا سخت صدمہ رہا جس کا اظہار انھوں نے خواجہ بشیر کو اپنے ایک خط میں بھی کیا وہ لکھتے ہیں:

"مجھے یہ افسوس زیست بھر رہے گا کہ مرحوم کے لیے جو آخری دعا کی گئی اس میں شریک ہونے سے محروم رہا۔"

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی زندگی میں لکھی جانے والی پہلی کتاب لکھنے کا اعزاز مولوی احمد دین کو حاصل ہوا مشفق خواجہ کی کاوشوں سے ۱۹۲۰ء کے بعد یہ نادر کتاب بار دگر منظر عام پر آئی۔

"اقبال"

پبلشرز: انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان، اشاعت: ۱۹۷۹ء، صفحات: ۵۲۷، قیمت: ۴۰ روپے

○○○

احمد ندیم قاسمی

(۱۹۱۶ء۔۲۰۰۶ء)

شاعر، ادیب، دانش ور، افسانہ نویس، کالم نویس، نقاد اور صحافی، احمد شاہ المعروف احمد ندیم قاسمی (تمغۂ امتیاز) ۲۰ نومبر ۱۹۱۶ء کو انگہ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت انگہ ضلع سرگودہا میں شامل تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اٹک (کیمبل پور) میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان شیخوپورہ میں پاس کیا۔ ایف اے اور بی اے کی ڈگریاں صادق ایجرٹن کالج بہاول پور سے حاصل کیں۔ زمانۂ طالبِ علمی ہی سے انھیں تحریر وتقریر کا شوق تھا، اس لیے مختلف جرائد ورسائل میں شائع ہونے لگے۔ ۱۹۳۵ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد ہفت روزہ ''تہذیبِ نسواں'' میں مترجم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ زندگی کے کئی نشیب وفراز دیکھے۔ زلف روزگار سنوارنے کے لیے بہت سے کام کیے۔ ریفارمز کمشنر لاہور میں بطور محرر خدمات انجام دیں۔ قارئین یہ بات پڑھ کر حیران ہوں گے کہ وہ احسان دانش کی طرح بندہ مزدور تھے۔ انھوں نے اوکاڑہ میں ٹیلی فون آپریٹر کی حیثیت میں بھی ایک عرصہ تک کام کیا۔ شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں سے راہ رسم ووفا اسی دور سے شروع ہوئی۔ وہ اردو ادب کے محسن اور اہلِ ادب کے لیے ایک سائباں کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی ہمہ صفت شخصیت ادبی کوہ گراں کی مانند تھی۔ پاکستان اور پاکستان سے باہر وہ پاکستانی ادب کا ایک بہت بڑا حوالہ تھے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات کی طرح متعدد شاگرد اردو ادب کے سپرد کر کے حیات جاوید پائی۔

احمد ندیم قاسمی نے مختلف جرائد اور اخبارات میں بھی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۲ء میں

ہفت روزہ ''پھول'' کو پھول جیسے بچوں تک پہنچانے کی ذمہ بخوبی نبھائی اور اسی سال معروف ہفت روز ''تہذیبِ نسواں'' کے بھی ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ دونوں رسائل کو خوب متعارف کروایا۔ ۱۹۴۳ء میں ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' کے ارباب اختیار نے ان کی خدمات حاصل کر لیں۔ چوں کہ احمد ندیم قاسمی بنیادی طور پر لگن اور جوش و جذبہ سے کام کرتے تھے، اس لیے اپنے اصولوں کے خلاف کوئی بات بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی نے ۱۹۴۵ء میں تینوں رسائل کی ادارت کو خیر باد کہہ دیا۔ ۱۹۴۷ء میں ماہنامہ ''سویرا'' کے چند شمارے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ ۴۹۔۱۹۴۸ء میں انھوں نے قومی شہرت یافتہ ادبی مجلّہ ماہنامہ ''نقوش'' کی ادارت سنبھالی۔ وہ ترقی پسند ذہن کے مالک تھے۔ اس لیے انھیں قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین صوبہ پنجاب کا جنرل سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ ترقی پسند تحریک کی عمر ابھی چند سال تھی، اس لیے ترقی پسندوں کو بہت سی رکاوٹوں اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس قبیلے کے کئی اہل قلم کو پس دیوار زنداں جانا پڑا۔ معروف افسانہ نگار ابراہیم جلیس کی طرح مئی ۱۹۵۱ء میں احمد ندیم قاسمی کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت چھ ماہ کے لیے نظر بند کر دیا گیا۔ قاسمی صاحب ۱۹۵۳ء میں پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے زیر اہتمام شائع ہونے والے اخبار روزنامہ ''امروز'' لاہور اور کراچی کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔

۱۹۵۸ء میں انھیں ایک بار پھر پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت سال بھر کے لیے نظر بند کر دیا گیا۔ ۱۹۵۸ء کی نظر بندی کے بعد انھوں نے ''فنون'' کا اجراء کیا۔ انھوں نے فنون کو خونِ جگر کی نمو عطا کی۔ آج عالمی سطح پر ''فنون'' کا اپنا انفرادی مقام ہے۔ انھیں ۱۹۷۴ء میں مجلس ترقی ادب کا ناظم مقرر کیا گیا۔ مجلس ترقی ادب لاہور کے سربراہ کی حیثیت سے انھوں نے بہت سا علمی و ادبی کام کیا۔ اس ادارہ کی متعدد کتب اہل تحقیق کے لیے سرمایہ ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں انھیں بزم اقبال کا اعزازی سیکرٹری تعینات کیا گیا۔ اقبال کے حوالے سے ان کی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

ان کے ادبی سرمایہ میں ''رم جھم، جلال و جمال، کپاس کا پھول، دشت وفا، آنچل، آبلے، سناٹا، چوپال، بگولے، محیط، آس پاس، طلوع و غروب، در و دیوار، سیلاب و گرداب، شعلہ و گل'' ایسی کتابیں ہیں جن پر اردو ادب ہمیشہ ناز کرتا رہے گا۔

روزنامہ ''جنگ'' میں ان کا کالم ''رواں دواں'' ایک عرصہ تک شائع ہوتا رہا۔ ان کے شعری مجموعوں ''محیط، دشت وفا، شعلہ و گل، جلال و جمال اور رم جھم'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ

انسانی عظمت کے مبلغ تھے۔انھیں غربت کا احساس تھا۔وہ بے چراغ جھونپڑیوں میں روشنی دیکھنے، طبقاتی کشمکش اور استحصال اجرت کے بارے میں ان کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے:

میں ایک ذرہ سہی کائنات بھر میں رہوں　　　نظر نہ آؤں کہ ایک حلقہ شرر میں رہوں
ندیم کوئی میرے فن کا اجر کیا دے گا　　　میں خاک چاٹ کے بھی تشنہ ہنر میں رہوں

اور ایک جگہ لکھتے ہیں:

مر کر بھی نہ ہوں گے رائیگاں ہم　　　بن جائیں گے گرد کارواں ہم
ہم گونج ہیں ساز ارتقا کی　　　ہیں عصر جدید کی زباں ہم

ان کے ہاں خیالات کا تنوع ہے۔وہ عالمگیر سوچ کے حامل ہیں۔ظلم واستبداد کی چکی میں پستے ہوئے انسانوں کو وہ انقلاب کا درس دیتے ہیں۔فیض احمد فیض، احسان دانش اور ڈاکٹر علامہ اقبال کے نظریہ انقلاب کی طرح احمد ندیم قاسمی ایک ایسے انقلاب کے مبلغ تھے جو مستحق کو اس کا حق عطا کرے۔کلمہ حق بلند کرنے میں ان کا اپنا ہی مقام تھا۔ان کے افسانے بھی ان کی شاعری کی طرح انسان کے گرد گھومتے ہیں۔وہ زمین سے تعلق پر فخر کرتے ہیں۔مٹی سے وفا ہی درحقیقت اپنی ذات سے وفا ہے۔ارضِ پاک کے حوالے سے ان کے شہرت دوام شعر ملاحظہ ہوں:

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا ہی رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو

ایک شام روزنامہ ''امروز'' کے سرگودھا میں نمائندہ خصوصی مرحوم اجمل اعوان کے ہمراہ احمد ندیم قاسمی راقم الحروف (ہارون الرشید تبسّم) کے گھر واقع کوٹ فرید سرگودھا پر تشریف لائے۔یخ بستہ ماحول میں انھوں نے تقریباً ایک گھنٹہ ملاقات کا شرف بخشا۔دوران ملاقات بہت سے ادبی امور پر بات ہوئی۔سرگودھا اور لاہور کے مابین ادبی سرد جنگ کا تذکرہ بھی ہوا۔ان رسائل کے بارے میں بھی گفت گو ہوئی جو دونوں ٹیموں کو برسر جنگ کرنے میں محرک ثابت ہو رہے تھے۔احمد ندیم قاسمی وہ خوش قسمت ادیب ہیں جن کے چاہنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ان کی ادبی خدمات کے کئی حوالوں پر اب تحقیقی کام کا آغاز ہوگا۔خلیل جبران نے کیا خوب کہا ہے کہ جو لوگ لفظوں کی حرمت کی

خاطر اپنی جان دے دیں، ان کے مرنے کے بعد ان کی قبر پر لکھ دو" یہ وہ لوگ ہیں جو مرے نہیں ہیں۔"
احمد ندیم قاسمی عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اہلِ ادب ان کے تخلیقی سرمایہ پر فخر کرتے رہیں گے۔ اُن کے ادبی جریدہ "فنون" میں فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں پر مضامین شائع ہوئے۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی کتاب "اقبال شناسی اور فنون" میں وہ تمام مضامین اکٹھے کر دیئے۔ روز نامہ جنگ میں قاسمی صاحب کے اقبالیاتی مضامین بھی قابلِ ذکر ہیں۔

احمد ندیم قاسمی ۱۰ جولائی ۲۰۰۶ء بروز پیر اس دار فانی سے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ جب ان کے انتقال کی خبر ٹی وی پر نشر ہو رہی تھی تو ساتھ ہی پی آئی اے کے فوکر طیارہ کے حادثہ کی خبر بھی شامل تھی جو ملتان کے قریب سورج میانی کے مقام پر گر کر تباہ ہو گیا اور اس میں پینتالیس افراد جاں بحق ہو گئے۔ راقم الحروف (ہارون الرشید تبسّم) کے شعور پر یہ بازگشت بھی سنائی دے رہی تھی کہ احمد ندیم قاسمی کا تعلق کچھ عرصہ تک ملتان سے بھی رہا۔ وہ ملتان میں بطور ایکسائز انسپکٹر خدمات انجام دیتے رہے۔ ادبی ذوق کی وجہ سے وہ نگاہ ناز پر بھی ٹیکس عائد کرنے کا سوچتے ہوں گے کیوں کہ یہ بھی تو ایکسائز کے زمرے میں شامل ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا اقبالیاتی تحفہ قابل ذکر ہے۔

"فلسفۂ اقبال"

پبلشرز: بزمِ اقبال، لاہور، اشاعت: ۱۹۸۴ء، صفحات: ۳۵۱، قیمت: ۳۰ روپے

ooo

اعجاز الحق قدوسی

(جولائی ۱۹۰۵ء۔۱۹فروری ۱۹۸۶ء)

ممتاز مؤرخ، محقق، نقاد، شاعر، اقبال شناس اعجاز الحق قدوسی جولائی ۱۹۰۵ء میں مشرقی پنجاب کے شہر جالندھر میں پیدا ہوئے۔ جب کہ ان کا آبائی وطن ضلع سہارن پور (یو پی) میں قصبہ گنگوہ ہے۔ اعجاز الحق قدوسی اردو زبان وادب کا بہت بڑا حوالہ ہیں۔ ان کا شجرہ نسب قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی ۱۹۴۴ء خانقاہ قدوسیہ گنگوہ، ضلع سہارن پور، یو پی، انڈیا) کی اولاد سے ملتا ہے۔ گنگوہی نے چوراسی ۸۴ سال عمر پائی۔ آپ کی عمر کا بڑا حصہ ریاضتوں، مجاہدوں، عبادتِ الٰہی، رشد و ہدایت اور مریدوں کی اصلاح و تربیت میں گزرا۔ آپ سلسلہ عالیہ چشتیہ صابریہ میں حضرت حکیم قمیس احمد کیف قدوسی (متوفی ۱۹۶۱ء) سجادہ نشین درگاہ شریف شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی سن ۱۹۴۴ء) سے بیعت ہوئے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم اپنے ننھیال قصبہ انبیٹھ ضلع سہارن پور میں مولانا شفیق احمد انبیٹھوی سے حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک مدرسہ مجددیہ سرہند شریف میں تعلیم پاتے رہے۔ پھر علوم شرقیہ کی تکمیل کے بعد ۱۹۲۰ء میں انھوں نے دینی درس گاہ مظاہر العلوم سہارنپور سے اکتسابِ علم کیا مولانا اسداللہ رام پوری، مولانا عبدالرحمٰن کیمبل پوری، مولانا ثابت علی، مولانا منظور احمد وغیرہ سے اکتساب فیض کرتے رہے۔

اچھی ملازمت کی تلاش میں اپنے ایک عزیز کے ساتھ حیدر آباد دکن چلے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے بچیوں کے لیے پہلی کتاب ''مسلمان بیبیاں'' تصنیف کی۔ اس نے اسلامی سیرت واخلاق کو موضوع بنا کر بچیوں کے لیے بارہ تیرہ کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں نے ان کی شہرت کے گراف کو

خاصا بلند کیا۔ اعجاز الحق قدوسی نے ایک علمی و ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والدِ گرامی پروفیسر ظہور احمد ایچی سن کالج لاہور میں انگریزی کے استاد رہے ہیں۔ برعظیم پاک و ہند کے پہلے مسلمان تھے جنھوں نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ کیا۔

برعظیم پاک و ہند کی تقسیم کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ کراچی منتقل ہو گئے۔ سندھی ادبی بورڈ کے شعبہ تاریخ سے منسلک ہوکر یہاں دس سال تک خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد اعجاز الحق قدوسی انجمن ترقی اردو پاکستان میں قاموس الکتب کے مدیر اور پھر ترقی اردو بورڈ کراچی کے شعبہ لغت میں بحیثیت سکالر مقرر ہوئے۔ ''سندھ کی تاریخی کہانیاں'' ان کی ایسی کتاب ہے، جس میں انھوں نے سندھ کی قدیم اور تاریخی کہانیوں کو ڈھونڈ کر کتاب کی زینت بنایا۔ اس کتاب نے بھی ان کو خاصی شہرت عطا کی۔ ان کی دیگر کتابوں میں ''تذکرہ صوفیائے سندھ''، ''تذکرۂ صوفیائے پنجاب''، ''تذکرۂ صوفیائے سرحد''، ''تذکرۂ صوفیائے بنگال''، ''شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کی تعلیمات'' ترجمہ وحواشی ''توزک جہانگیری''، ''تاریخِ سندھ''، ''تاریخ مغربی پاکستان''، ''برعظیم پاک و ہند پاک و ہند کے علما حق پرست''، ''سیر الاولیاء (مترجم)'' ''سندھ کے فارسی گو شعراء''، ''سراپائے رسول ﷺ''، ''سیرت بتول''، ''ہمارے نبی ﷺ کے صحابہ کرامؓ''، ''سیرت امام حسنؓ''، ''عہدِ رسالت کے دو بچے''، ''درس گاہ رسول ﷺ کے دو طالبِ علم''، ''اقبال کے محبوب صوفیا'' اور ''اقبال اور علمائے پاک و ہند'' شامل ہیں۔

اعجاز الحق قدوسی نے ۹ جمادی الثانی ۱۴۰۶ھ بمطابق ۱۹ فروری ۱۹۸۶ء بروز بدھ ۸۱ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ پاپوش نگر (ناظم آباد، کراچی) کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

''اقبال کے محبوب صوفیہ''

ناشر: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، صفحات: ۶۱۸، قیمت: ۴۵ روپے

''اقبال اور علمائے پاک وہند''

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: ۱۹۷۷ء، صفحات: ۵۰۵

○○○

افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر

(۱۹۸۶ء-۲۰۰۰ء)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی اقبال شناسوں کی فہرست میں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ اُنھوں نے تفہیمِ فکرِ اقبال کے لیے بھرپور جدوجہد کی۔ وہ وسیع النظر محقق اور قابلِ تقلید اُستاد رہے۔ وہ ۱۹۱۷ء میں پٹیالہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی منازل کامیابی سے طے کرتے رہے۔ پی ایچ ڈی کے لیے اُن کے پہلے نگران پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللہ رہے جو ۱۴ راگست ۱۹۸۶ء کو داغِ مفارقت دے گئے۔ بعدازاں ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے پروفیسر وقار عظیم کی سرپرستی میں فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں پر کام کیا۔ ۱۹۷۷ء میں سالِ اقبال کے سلسلہ میں ''اقبال کے فکری اور فنی ارتقاء'' پر تحقیقی کام کا تجربہ بھی حاصل رہا۔ اُنھوں نے پنجاب یونی ورسٹی میں اپنے تعلیمی جواہر دکھاتے ہوئے ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء تک خدمات انجام دیں۔ بعدازاں اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور میں صدر شعبۂ اُردو اور ڈین آرٹس فیکلٹی ۵ سال خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۵ء کے بعد اُنھوں نے بہت سا تحقیقی کام کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی کے دور میں گروہی جھگڑوں میں افتخار احمد صدیقی بھی متاثر ہوئے۔

معروف کتب میں ''عروجِ اقبال''، ''فروغِ اقبال''، ''ڈپٹی نذیر احمد دہلوی: احوال و آثار'' ''کلامِ حکیم''، ''جواہرِ حالی''، ''Stray Reflections by Iqbal'' اردو ترجمہ ''شذراتِ فکرِ اقبال'' کے نام سے منصۂ شہود پر آئی۔

''فروغِ اقبال'' ان کی بلند پایہ تصنیف ہے۔ ڈاکٹر افتخار صدیقی نے اپنے وسعتِ مطالعہ کا اظہار کیا ہے۔ اساتذۂ کرام کے بارے میں خاطر خواہ معلومات فراہم کی ہیں۔ اقبال کے ہم عصر

مفکّرین کے ساتھ اُن کی چشمک کا تذکرہ بھی کتاب میں شامل ہے۔اس کتاب کی اشاعت کے کئی پہلو ہیں جو فکرِ اقبال کے فروغ کا سبب بن سکتے ہیں۔قرآن حکیم اور تکریم انسانی، اقبال اور رومی، مومن فلسفی، سائنس اور اقبال، شاعرِ انسانیت، اعتدال و توازن، مغربی تہذیب پر اقبال کی تنقید، آفاقی شہرت و مقبولیت، اقبال کے ہم عصر مفکّرین کے نظریات، اس کتاب کے قابلِ توجہ موضوعات ہیں۔

''عروجِ اقبال'' پر انھیں قومی اقبال ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔۱۸ جون ۲۰۰۰ء سنت نگر لاہور میں وفات پائی اور لاہور میں ہی دفن ہوئے۔ان کی دو اقبالیاتی کتب کا تذکرہ درج ذیل ہے:

"فروغِ اقبال"

ناشر: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: ۱۹۹۶ء، صفحات: ۵۵۲، قیمت: ۲۰۰ روپے

"عروج اقبال"

پبلشرز: بزم اقبال، لاہور، اشاعت: ۱۹۸۷ء، صفحات: ۴۳۴، قیمت: ۱۲۰ روپے

OOO

افتخار حسین شاہ، سید

(۱۸/نومبر ۱۹۳۱ء۔۵/دسمبر ۲۰۱۲ء)

سید افتخار حسین شاہ ۱۸ نومبر ۱۹۳۱ء کو محمد صادق کے ہاں پیدا ہوئے۔ ترجمان حقیقت، حکیم الامت، شاعر مشرق علامہ اقبال پر قلم اٹھانا اتنا آسان نہیں۔ یہ کام بہت محنت، لگن، تحقیق اور علم کا متقاضی ہے لیکن اس کے باوجود لاتعداد مصنفین اور محققین اقبالیات کی صحرا نوردی میں مصروف ہیں۔ انھوں نے شوق و جستجو کی کشتی کو اس بحرِ علم و حکمت میں ڈال دیا اور ہمت و عزم کے چپوؤں کے سہارے اسے پار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ سید افتخار حسین شاہ کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہے۔ سید افتخار حسین شاہ سابق صدر شعبہ اردو ملتان یونی ورسٹی کی کتاب ''اقبال اور پیروی شبلی''، ان کی ایسی کاوش ہے جو اقبالیاتی ادب کے لیے نہ صرف معلومات کا باعث ہے بل کہ علامہ شبلی نعمانی (۱۹۱۴ء۔۱۸۵۷ء) کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کا بھی پتا چلتا ہے۔

اس طرح انھوں نے دونوں عظیم شعراء کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ انھوں نے ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونی ورسٹی کے تحت گورنمنٹ کالج ملتان میں ایم اے اردو کی کلاسوں کا آغاز کیا۔ گویا ملتان میں ایم اے اردو کی کلاسوں کے بانی تھے۔ انھوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی ساری لائبریری زکریا یونی ورسٹی ملتان شعبہ اردو میں قائم ذاتی عطیات پر مشتمل ''خلیل صدیقی ریسرچ لائبریری'' کو دے دیں۔ جہاں سیکڑوں، ہزاروں تشنگان علم اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد اپنے خاکہ میں لکھتے ہیں:

> ''شاہ جی کا قد ۶ فٹ سے کچھ زیادہ ہی ہوگا، محنت اور دیانت کے حوالے سے بھی ان کا ثانی کوئی نہیں، والدہ کی خدمت ہو، اپنی معذور بیوی کی دیکھ بھال یا بچوں کی تربیت، شاید

ہی کوئی ایسا جگادڑ نہیں، ہو جو شاہ صاحب کی عظمت کا اعتراف نہ کرتا ہو۔ انھوں نے کتب بھی لکھیں، شاعری بھی کی، تدریس بھی باقاعدگی اور انہماک سے کی۔ رزق حلال پر ہمیشہ قناعت کی مگر اس سب کے باوجود ان کی شخصیت میں کہیں نہ کہیں اک آنچ کی کمی محسوس نہیں ہوتی ہے۔"

افتخار حسین شاہ کے شاگردان اردو ادب کے چمکتے ستارے ہیں، ان میں ایک نام عرش صدیقی کا بھی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر انوار احمد، ریاض زیدی، یحییٰ امجد، نعیم چودھری، فیاض تحسین شامل ہیں۔ سید افتخار حسین شاہ انتہائی سخت طبیعت کے مالک تھے۔ اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات پسند نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر انوار احمد کے کسی دوست نے خط لکھا کہ آپ اپنے استاد سید افتخار حسین شاہ سے یہ معلوم کر دیں کہ انٹرمیڈیٹ کے اردو کے پرچہ میں اس برس کورس میں شامل نظموں کے اشعار تشریح کے لیے آئیں گے یا نظم کے مرکزی خیال کے بارے پوچھا جائے گا۔ ڈاکٹر انوار نے بے ضرر سا سوال سمجھتے ہوئے ان کے ہاں جا کر سوال دہرایا تو انھوں نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور بیٹا ان کے آگے سے چائے اٹھا کر لے گیا۔ سید افتخار حسین شاہ نے غصے میں کہا" آپ نے چوں کہ میری توہین کی ہے، اس لیے آپ کو یہاں بیٹھنے کا حق بھی نہیں"۔

تحریکِ پاکستان میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھیں سیالکوٹ، گجرات، اور لاہور سے گہری محبت اور انسیت تھی۔ لاہور کے نام پر ان کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ ان کا بیٹا امریکہ میں بین الاقوامی سرجن ہے۔ سید افتخار حسین شاہ لندن میں ۵ دسمبر ۲۰۱۲ء کو ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ بیٹے نے والدِ گرامی سید افتخار حسین شاہ کی وفات کے بعد ملتان والا گھر فروخت کر دیا اور ملتان کو خیر باد کہہ گئے۔ ان کی یادیں آج بھی اہلِ ملتان کے دلوں میں زندہ ہیں۔ ان کی اقبالیاتی کتاب کا تذکرہ موجود ہے۔

"اقبال اور پیروئ شبلی"

پبلشرز: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت: ۱۹۷۷ء، صفحات: ۱۸۴، قیمت: ۱۶ روپے

○○○

اکبر حسین قریشی، ڈاکٹر

(۱۹۲۶ء۔۱۶/اکتوبر۲۰۰۳ء)

ڈاکٹر اکبر حسین قریشی ۱۹۲۶ء ایٹہ (یوپی) میں ایس احمد بخش کے ہاں پیدا ہوئے۔ایس احمد بخش سکول کے ابتدائی زمانوں میں ہی انھیں داغ یتیمی دے گئے۔ابتدائی تعلیم ایٹہ میں ہوئی جو کہ علی گڑھ کا ایک ضلع ہے۔فرسٹ ائیر کے لیے ۱۹۴۴ء میں علی گڑھ میں داخل ہوئے۔تھرڈ ائیر میں داخلہ لیا تو برعظیم پاک و ہند کی تقسیم ہوگئی۔۱۹۴۹ء میں آنرز مکمل کیا۔پھر ۱۹۵۰ء میں ایم اے مکمل ہوا اور لاہور آتے ہی انھیں ۱۹۵۱ء میں بزم اقبال نے سکالرشپ دیا۔پھر کچھ عرصہ کے لیے انھیں راولپنڈی میں سکونت اختیار کرنا پڑی۔ڈاکٹر اکبر حسین قریشی اردو کے ممتاز ادیب، محقق، ماہر لسانیات و فرہنگ ساز اور ماہر تعلیم تھے۔اکبر حسین قریشی نہایت خوش قسمت ہیں کہ انھیں رشید احمد صدیقی سے اکتساب علم کا موقع ملا۔قاضی عبدالودود کی تدوین نگاری اور تحقیق میں امتیاز علی خان عرشی کو بہت بلند مقام و مرتبہ دیتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ قاضی عبدالودود کی تحقیق یقیناً پائے کی ہے مگر ان کی نثر کو پڑھنا خاصا دل گردے کا کام ہے جو خاصی مشکل ہوتی ہے۔ان کی اقبالیاتی ادب میں معروف کتاب ''تلمیحات و اشارات اقبال'' ہے جسے بہت زیادہ پذیرائی ملی۔

''تلمیحات و اشارات اقبال'' دراصل ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے، جو انھوں نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے زیرنگرانی لکھا اور اس مقالہ پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے انھیں ۱۹۵۶ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔اس مقالہ کو پہلی مرتبہ انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۶۲ء میں دہلی سے شائع کیا۔اس کا پاکستانی ایڈیشن، اقبال اکادمی، پاکستان نے لاہور سے ۱۹۸۶ء

میں شائع کیا۔اس مقالہ کودس (۱۰) ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ان دس ابواب میں تلمیحاتِ قرآن، حدیث ، فلسفیانہ، تاریخی ، سیاسی کے ساتھ ساتھ اقبال کے کلام میں شعرائے مشرق ومغرب کا تذکرہ، اقبال کے کلام میں بعض خاص شخصیتوں کا ذکر، اقبال کی بعض نظموں کے مآخذ اور آخر میں تلمیحات واشارات کی روشنی میں اقبال کے رجحانات پر ایک نظر شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں کتابیات اور اشاریہ دے کر محققین کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کردی ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی نے تلمیحات قرآن میں جو ترجمہ استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر اکبر حسین قریشی نہ صرف اُردو بل کہ عربی فارسی زبان وادب پر گہری نظر رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اقبال کے اُردو اشعار کے ساتھ ساتھ فارسی اشعار کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ ہر شعر کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ یہ شعر قرآن پاک کی کس آیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔مزید برآں آیت کے اردو ترجمہ نے قاری کے لیے ذخیرہ معلومات فراہم کردیا ہے۔ڈاکٹر اکبر حسین قریشی نے یہ کام انتہائی عرق ریزی سے کیا ہے کہ داد دیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

ان کی معروف کتب میں ''تلمیحات واشارات اقبال''، ''فرہنگ فسانۂ آزاد''، ''فرہنگ طلسم وشربا'' اور ''فرہنگ بوستان خیال'' شامل ہیں۔

ڈاکٹر اکبر حسین قریشی ۱۶/اکتوبر ۲۰۰۳ء کو انتقال کر گئے انھیں قبرستان سرسید، راولپنڈی میں سپردِ خاک کردیا گیا۔ان کی اقبالیاتی کتاب ''تلمیحات واشارات اقبال'' کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

''تلمیحات واشارات اقبال''

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: طبع اول ۱۹۸۶ء، طبع دوم ۲۰۰۴ء، صفحات: ۵۲۷،

ooo

اکبر علی، شیخ، ایڈووکیٹ

(۱۸۹۴ء۔ ۱۵ اگست ۱۹۵۳ء)

شیخ اکبر علی ایڈووکیٹ ۱۸۹۴ء کو شیخ محمد افلاطون کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کا مکمل نام شیخ اکبر علی ارسطو تھا۔ شیخ اکبر علی ماہر قانون دان، ادیب، انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سرگرمِ رکن کے علاوہ رکن کونسل آل انڈیا مسلم لیگ (۱۹۳۰ء) اور اسسٹنٹ سیکرٹری صوبہ پنجاب مسلم لیگ (۳۶۔ ۱۹۳۴ء)۔ ان کی ایک کتاب ''اقبال: اس کی شاعری اور پیغام'' ۱۹۳۲ء میں منصۂ شہود پر آئی۔ یہ کتاب علامہ محمد اقبال کی زندگی میں ہی منظر عام پر آئی اور حضرت علامہ محمد اقبال نے بھی اس کتاب کی تعریف کی اور شیخ اکبر علی ایڈووکیٹ کی محنتوں کو سراہا۔ ''اقبال، اس کی شاعری اور پیغام'' ان کی محبت اور عقیدت کا اظہار ہے۔ اُنھوں نے کتاب میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھیں شعروشاعری سے زیادہ شغف نہ تھا لیکن کلامِ اقبال نے اُن کے ذہن پر وہ اثر کیا کہ اس کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ انھوں نے پہلے انگریزی زبان میں اقبال کے کلام پر تبصرہ لکھا اور پھر احباب کے اصرار پر اردو میں طبع آزمائی کی۔ ''اقبال، اس کی شاعری اور پیغام'' کی اشاعت بھی ان کی اسی جستجو کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب کے ۱۲ ابواب ہیں۔ مصنف نے فکر اقبال کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کا دیباچہ شیخ عبدالقادر نے لکھا ہے۔ انھوں نے شیخ اکبر علی کی اس کاوش کو بہت سراہا ہے۔ علامہ اقبال کے فکروفن سے وکلاء حضرات کی وابستگی اس لیے بھی اہم ہے کہ علامہ اقبال ایک بلند پایہ وکیل بھی تھے۔ ایک ایسے ہی ماہر قانون شیخ اکبر علی محبانِ اقبال میں شامل ہیں۔ شیخ اکبر علی ایڈووکیٹ ۱۵ اگست ۱۹۵۳ء کو لاہور میں دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی کتاب کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

''اقبال، اُس کی شاعری اور پیغام''

کمال پبلشرز نمبر ۲۶ مال روڈ لاہور، اشاعت: جولائی ۱۹۴۶ء، صفحات ۴۲۴، قیمت: چار روپے آٹھ آنے

انعام الحق کوثر، ڈاکٹر

(۱۹۱۳ء۔۲۰۱۴ء)

انعام الحق کوثر کنیاں کلاں تحصیل نکودر، ضلع جالندھر انڈیا میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ انعام الحق ان کا اصل نام تھا جب کہ انعام الحق کوثر کے نام سے معروف ہوئے۔ اردو فارسی، براہوی اور انگلش کے محقق، مترجم اور مؤلف تھے۔ پرائمری سکول رانوت سے ابتدائی کلاسیں پڑھیں جب کہ میٹرک اسلامیہ ہائی سکول سے پاس کیا۔ ان کے والدِ گرامی درس و تدریس کے علاوہ حکمت بھی کرتے تھے۔ انعام الحق کوثر کو سکول کے ابتدائی کلاسوں میں ہی تقریریں کرنے کے ذوق پیدا ہوا۔ ساتویں جماعت میں جب پہنچے تو ان کی ایک کہانی ''غنچہ'' میں شائع ہوئی جس نے انھیں کافی شہرت عطا کی۔ انھوں نے ۱۹۵۴ء میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے ایم اے فارسی کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۶۳ء میں انگلش میں بابا افغانی شیرازی کی حیات و فن پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی مکمل کی۔ ۱۹۵۶ء میں وہ گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں بطور لیکچرر تعینات ہوئے اور بعد ازاں مستونگ، لورالائی، سبی وغیرہ میں بطور پرنسپل رہے اس کے بعد چیئرمین تعلیمی بورڈ اور ڈائریکٹر تعلیمات، نصابیات و توسیع تعلیم رہے۔ ۱۹۹۲ء میں ریٹائرمنٹ لی ان کی پہلی کتاب ''فغانیز لائف اینڈ ورکس'' (۱۹۶۳ء) میں منصۂ شہود پر آئی۔ اس کے بعد ''فارسی زبان و ادب پر نوٹس'' (۱۹۶۴ء)، ''بلوچستان میں فارسی شاعری'' (۱۹۶۸ء)، ''بلوچستان میں اردو'' (۱۹۶۸ء)، ''شعرائے فارسی گوئی بلوچستان'' (۱۹۷۱ء)، اور ''فارسی در پاکستان'' (۱۹۷۱ء) جیسی تحقیقی و تنقیدی کتب منظر عام پر آئیں۔ ان کتب نے انعام الحق کوثر کی شہرت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ ۱۹۷۶ء میں Glimpses of Persian Poetry لکھی اور کلیات محمد حسن

براہوی مرتب کی۔ انھوں نے بلوچی اور براہوی سے اردو کئی کتب کے تراجم بھی کیے۔ ۱۹۹۱ء میں ان کی کتاب ''بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں کا تقابلی مطالعہ'' شائع ہوئی۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں انھوں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے کچھ کام کیا۔ مثلاً ''بچوں کے لٹریچر کی تیاری میں نفسیات کا کردار'' (۱۹۹۳ء)، ''اسلام اور بچے کی تربیت و نگہداشت'' (۱۹۹۳ء)، ''بچوں کی تربیت میں کتاب کا حصہ'' (۱۹۹۴ء) بعدازاں اسلامی موضوعات پر قلم اٹھایا ''سرور کائنات بحیثیت داعی امن واخوت'' (۱۹۹۳ء) اور ''سیرتِ طیبہ سے راہنمائی'' (۲۰۰۱ء)۔ پاکستانی زبانوں کے حوالے سے ان کا کام بھی قابلِ ذکر ہے۔ ان کی تصنیف کردہ کتب کی کل تعداد ایک سو سے زائد ہے۔ جن میں سے کچھ بطور شریک مصنف بھی ہیں۔ نیز مختلف سیمیناروں اور کانفرنسوں میں ڈیڑھ سو کے قریب مقالے پڑھ چکے ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر کو پاکستان رائٹرز گلڈ، صدارتی ایوارڈ اور تمغۂ حسنِ کارکردگی کے علاوہ اور بھی کئی اعزازات اور انعامات مل چکے ہیں۔

ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے بہت سے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ اقبالیاتی ادب میں بھی ان کی دل چسپی قابلِ تعریف ہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کی بلوچستان آمد اور وہاں کے اقبال شناسوں کے کارناموں کو یک جا کرنا' قابلِ ستائش کام ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے۔ ''علامہ اقبال اور بلوچستان'' ترتیب دے کر بلوچستان میں اقبال شناسی کا حق ادا کیا ہے۔ بلوچستان کا تعارف علامہ اقبال جیسی عظیم شخصیت کے حوالے سے کروانا یقیناً ایک منفرد کوشش ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے تحقیق کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ علامہ اقبال تین مرتبہ بلوچستان آئے اور یہاں قیام کے دوران انھوں نے جن لوگوں سے ملاقات کی، جو کام کیے، اس کتاب میں اس کا ذکر نہایت خوب صورتی سے کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے بلوچستان اور علامہ اقبال کو جس طرح ہم آہنگ کیا ہے۔ وہ کمال فن ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اقبال کے مردِ مومن کے تصور کو بلوچستان کے عوام کی بہادری سے جوڑ دینا ڈاکٹر انعام الحق کوثر کا ہی انعام ہے۔ ان کی اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

''علامہ اقبال اور بلوچستان''

پبلشرز: علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی۔ اسلام آباد، اشاعت: ۱۹۸۶ء، صفحات ۲۱۶، قیمت: ۶۵ روپے

○○○

انور رومان، پروفیسر

(یکم اکتوبر ۱۹۲۴ء۔ ۸ نومبر ۲۰۱۳ء)

پروفیسر انور رومان گونا گوں خوبیوں کے حامل تھے وہ بیک وقت افسانہ نگار، محقق، تاریخ دان ماہر لسانیات اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ انھوں نے بلوچستان کے ادب کو فروغ دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھا اس کے علاوہ انھوں نے اردو ادب کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کروانے میں بھی خدمات انجام دیں۔ انور رومان کی ایک حیثیت اقبال شناس کی بھی ہے۔ انھوں نے اقبال کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔

پروفیسر انور رومان یکم اکتوبر ۱۹۲۴ء کو کنیاں کلاں، تحصیل نکودر، ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر کے بڑے بھائی تھے۔ پروفیسر انور رومان نے اردو اور انگریزی کے محقق، مترجم اور مؤلف کی حیثیت سے خوب شہرت حاصل کی۔ ۱۹۳۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا، ۱۹۴۵ء میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے ایم اے تاریخ کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۶ء میں گورنمنٹ سنڈیمن ہائر سیکنڈری سکول کوئٹہ میں لیکچرار تعینات ہوئے اور قیام پاکستان کے بعد کوئٹہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کا مضمون ''پاکستانی ادب (اس کا ماضی قریب اور اس کی ذمہ داریاں'' معروف ادبی جریدہ ''مخزن'' لاہور جولائی اگست ۱۹۴۹ء دو اقساط میں اشاعت پذیر ہوا تو اسے علمی و ادبی حلقوں نے خوب سراہا۔

انور رومان کو اللہ تعالیٰ نے تین بیٹیوں بلقیس انور، تسنیم انور، تقدیس انور اور تین بیٹوں ڈاکٹر ندیم انور، ڈاکٹر یاسین انور اور انجینئر یامین انور سے سرفراز کیا۔

پروفیسر انور رومان بلوچستان، پنجاب اور سرحد کے مختلف کالجوں میں پرنسپل اور پھر ڈپٹی ڈائریکٹر، ڈپٹی سیکرٹری، چیئرمین بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ، ناظم تعلیمات کالجز، ناظم تعلیمات ادارہ نصابیات و مرکز توسیع تعلیم بلوچستان رہا اور ۱۹۸۴ء میں ریٹائرمنٹ لی۔ تاریخ اور لسانیات کے موضوع پر ان کی ساٹھ کے قریب کتب شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں سے متعدد تراجم ہیں۔ دیگر قابلِ ذکر تصانیف و تراجم درج ذیل ہیں۔ ''براہوی لوک کہانیاں (۱۹۶۵ء)، ''A Survey of Balochi Language and Literature'' (۱۹۶۷ء)، ''براہوی ادب'' (۱۹۷۱ء)۔ انگریزی سے تراجم ''بلوچستان میں تعلیم (۱۹۷۸ء)، ''بلوچ قوم کی تاریخ''، (۱۹۸۰ء) پوٹنگر کا ''سفرنامہ بلوچستان'' (۱۹۸۶ء)، آلیور کی ''پٹھان اور بلوچ'' (۱۹۸۴ء)، میسن کا کا ''سفرنامہ قلات'' (۱۹۸۶ء)، ہیوگز کی ''سرزمین بلوچستان'' (۱۹۸۶ء)۔ ''بلوچستان کے قبائل'' (۱۹۸۶ء)، جیمز ڈبلیو کی کتاب ''پٹھان سرحدی زمین'' (۱۹۸۸ء) ''پٹھانوں کی تاریخ'' (۱۹۸۹ء)، ''سندھ نگر'' (۱۹۸۹ء)، جنرل جارج میکسن کا ''شمالی مغربی پاکستان اور برطانوی سامراج'' (۱۹۷۹ء)۔ انھوں نے بچوں کے لیے ناولٹ اور کہانیاں بھی لکھیں۔ کئی نصابی کتب بھی لکھیں۔ ان کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب ''رومانیے'' ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر ان کی اقبالیاتی خدمات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر انور رومان نے تخلیقی کام (یعنی افسانے، ڈرامے، اور ادبی مضامین) کے علاوہ تحقیق و تدقیق کی مشعل روشن کی۔ یہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہی سے ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ انھوں نے اپنے کام سے متعدد ادبی صاحبان کو متاثر کیا وہ اب تک اردو زبان، ادب اقبالیات اور تاریخی و تہذیبی تحقیق کے سلسلے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دے چکے ہیں۔''

اقبالیاتی کتاب کا تذکرہ موجود ہے۔

''اقبال اور مغربی استعمار''

بزمِ اقبال۔ لاہور، اشاعت طبع دوم: مئی ۱۹۹۶ء، صفحات ۸۰، قیمت ۶۰ روپے

ooo

انور سدید، ڈاکٹر

(۱۹۲۸ء۔۲۰۱۶ء)

ڈاکٹر انور سدید نے ۴ دسمبر ۱۹۲۸ء قصبہ میانی بھلوال ضلع سرگودھا میں آنکھ کھولی۔ یہ علاقہ بہادروں، تحریکِ پاکستان کے کارکنوں، محنت کشوں اور سپیٹرس کے حوالے سے ملک میں بھر میں مقبول ہے۔ ان کے والد مولوی امام دین علاقہ کی نیک نیت اور شریف النفس شخصیت تھے۔ پرائمری تعلیم اسلامیہ پرائمری سکول سے حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خان سے مڈل جب کہ ۱۹۴۴ء میں گورنمنٹ ہائی سکول نمبرا سرگودھا سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں بھی زیرِ تعلیم رہے۔ محکمہ آب پاشی میں آب پاشی کرتے ہوئے ادب کی گل پاشی کی طرف راغب ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں انجینئرنگ کا ڈپلومہ طلائی تمغہ کے ساتھ حاصل کرلیا۔ ۱۹۶۱ء میں ایس ڈی ہوئے، مزید برآں ڈھاکہ آئی ایم ای کر کے ۱۹۷۰ء میں محکمہ انہار کے مہتمم ہوئے۔ انھوں نے ایم اے اُردو پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پنجاب یونی ورسٹی سے قابلِ مثال کامیابی کے ساتھ پاس کیا کہ ریگولر اور پرائیویٹ طالب علموں کو شکست دیتے ہوئے دو گولڈ میڈل حاصل کیے۔

۱۹۷۹ء ''اردو ادب کی تحریکیں'' مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا ان کے نگران تھے جب کہ سید عبداللہ اور شمس الدین صدیقی ممتحن تھے۔ پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر انور سدید کے اعزاز میں ایک تقریب ''دل کشا ہوٹل'' سرگودھا میں منعقد ہوئی جس کا حال الگ کتاب میں موجود ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اتنے لفظ

صفحات پر بکھیرے کہ کئی قلم چلتے چلتے دم توڑ گئے لیکن صفحات کی صحرانوردی مکمل نہ کر سکے۔ پیرانہ سالی کے باوجود لفظ ان سے التجا کرتے تھے کہ وہ اپنے قلم سے صفحات کی پیاس بجھاتے رہیں۔

اُنھوں نے ادب کی آبیاری کے علاوہ پنجاب کی سرزمین کے بہت سے علاقوں کو سیراب کرنے کا فریضہ ایمان داری اور دیانت داری سے ادا کیا۔ سول انجینئرنگ ڈپلومہ گورنمنٹ سکول آف انجینئرنگ پنجاب، رسول ضلع منڈی بہاؤالدین سے گولڈ میڈل حاصل کر کے اپنی فنی اور انتظامی صلاحیتوں پر مہر ثبت کی۔ اُنھوں نے انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز، ڈھاکہ سے سول انجینئرنگ ڈگری کورس مکمل کیا۔ ۳ دسمبر ۱۹۸۸ء کو اُنھوں نے بحیثیت ایگزیکٹو انجینئر محکمہ آب پاشی پنجاب اپنی ملازمت کا دورانیہ مکمل کیا۔ ۳ دسمبر ۱۹۸۸ء کو وہ سرکاری ملازمت سے آزاد ہو کر ادبی دنیا کی حاکمیت کرنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھیں ادب کے بہت سے محاذوں پر کام کرنا پڑا۔

اقبال کے کلاسیکی نقوش۔ اقبال شناسی اور ''ادبی دنیا''۔ اقبال شناسی اور ''اوراق''۔ اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش۔ الٰہ آباد، ۱۹۸۳ء، لاہور، ۲۰۰۶ء۔ انشائیہ اردو ادب میں۔ ۱۹۸۵ء۔ اردو ادب میں سفرنامہ، ۱۹۸۹ء۔ اردو ادب کی تحریکیں، اشاعت پنجم ۲۰۰۴ء، ہجرہ ایوارڈ یافتہ۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ، ۱۹۹۰ء۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ' ۱۹۹۲ء۔ میر انیس کی اقلیم سخن، (بھارت) ۱۹۸۵ء۔ غالب کا جہاں اور ۱۹۸۹ء۔ اختلافات، ۱۹۷۵ء۔ کھردرے مضامین، ۱۹۸۸ء۔ نئے ادبی جائزے، ۱۹۸۹ء۔ شمع اردو کا سفر ۱۹۸۹ء۔ بر سبیلِ تنقید، ۱۹۹۱ء۔ موضوعات، ۱۹۹۱ء۔ اُردو افسانے کی کروٹیں، ۱۹۹۲ء۔ اردو نثر کے آفاق، ۱۹۹۸ء۔ اردو شاعری کا دیار ۱۹۹۹ء۔ جدید اُردو ادب کے اربابِ اربعہ' ۲۰۰۷ء۔ مولانا صلاح الدین احمد، ایک مطالعہ، ۱۹۹۰ء۔ وزیر آغا ایک مطالعہ، ۱۹۸۵ء۔ شام کا سورج (تالیف)، ۱۹۸۵ء۔ پاکستان کا ایک بطلِ جلیل حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی۔ ۲۰۰۲ء۔ ذکر اس پری وش کا (انشائیے)، ۱۹۸۹ء۔ آسمان میں پتنگیں (انشائیے)، ۱۹۹۴ء۔ غالب کے نئے خطوط (طنز و مزاح)، ۱۹۸۲ء۔ دلاور فگاریاں (سوانح)، ۱۹۹۰ء محترم چہرے (خاکے)، ۱۹۸۹ء۔ قلم کے لوگ (خاکے)، ۱۹۹۲ء۔ ادبیانِ رفتہ (خاکے)، ۲۰۰۶ء۔ رادھے شیام کے نام (تصوف)، ۱۹۷۶ء۔ وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام (تالیف)، ۱۹۸۵ء۔ مکالمات (تالیف)، ۱۹۹۲ء۔ اردو افسانہ، عہد بہ عہد، ۱۹۹۶ء۔ نئے ادبی جائزے، ۱۹۸۸ء۔ کچھ وقت کتابوں کے ساتھ، ۱۹۹۴ء۔ دلی دور نہیں (سفرنامہ)، غزل کے رنگ۔ ۲۰۰۹ء۔ پرندہ سفر میں، ۲۰۰۹ء۔ انور سدید کے

خوابیدہ افسانے (مرتب: ذوالفقار احسن)۔ بیسویں صدی کی اُردو شاعری۔ کتب مینار، ۲۰۱۲ء۔ نقوشِ رفتگاں، ۲۰۱۰ء۔ سعید صورتیں، ۲۰۰۹ء۔

اُن کی تحریروں کے سامنے مخالفین کے غباروں سے ہوا نکل جاتی اور حقیقت فتح یاب رہتی۔ سرگودھا سے لاہور جانے کے بعد بھی ڈاکٹر انور سدید نے ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر وفن پر تحقیقی مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''اوراق'' کا معیار بہتر سے بہتر بنانے میں ڈاکٹر انور سدید گہری دل چسپی کا مظاہرہ کرتے۔ پروفیسر سجاد نقوی اور ڈاکٹر وزیر آغا اُن کے مشوروں کو بہت اہمیت دیتے۔ مجھے کئی ایسی محافل یاد ہیں جن میں ڈاکٹر وزیر آغا کو ڈاکٹر انور سدید کی صلاحیتوں کا برملا اظہار کرتے سنا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کہا کرتے تھے'' جتنے زیادہ لفظ انور سدید نے لکھے ہیں، اتنے کسی اور کو لکھنے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا۔'' اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر انور سدید لفظوں کی حرمت کے امین ہیں۔ مجید نظامی بھی ڈاکٹر انور سدید کی صلاحیتوں کے بہت معترف تھے۔ روزنامہ نوائے وقت میں اِن کے مضامین، تبصرے اور کالم پڑھنے والے بھی انھیں داد دیے بغیر نہ رہتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر انور سدید حق گوئی اور بے باکی کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ وہ کلمۂ حق بلند کرنے میں کبھی مرعوب نہ ہوئے۔ اُستادِ محترم ڈاکٹر خورشید رضوی نے اُن کی حق گوئی اور بے باکی کے بارے میں لکھا ہے:

''انور صاحب نے بے دھڑک بات کہنے کی جس جرأت کا اظہار کیا ہے، وہ خاصی مشکل چیز ہے۔ ذاتی گفت گو میں اُنھوں نے خود کو بنیادی طور پر سادہ اور دیہاتی قرار دیا تھا جو چھپا کر بات کہنے اور اپنے حقیقی جذبات کو مخفی رکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ یہ بات ان کے حوالے سے بالکل درست ہے۔ وہ اپنی بنیادی سرشت اور فطرت کے اعتبار سے صاف گو آدمی ہیں جو اپنے دلی جذبات کے اظہار سے خود کو باز نہیں رکھ سکتا۔ اُنھوں نے اپنے نام کے ساتھ ''سدید'' کا جو اضافہ کیا ہے وہ بھی اس بنیادی رجحان کی نشاندہی کرتا ہے اور یہ لفظ اُنھوں نے قرآن حکیم سے اخذ کیا ہے اور جس آیتِ کریمہ سے لیا ہے وہ یہ ہے ''قُولُوا قَوْلاً سَدِیداً'' (سیدھی اور کھری بات کرو) اپنے قلمی نام کے طور پر اس لفظ کا انتخاب ان کی ابتدائی مذہبی تربیت اور دیانت دارانہ صاف گوئی کی خواہش کا پتہ دیتا ہے۔''

اردو ادب کی تحریکوں کی طرح ڈاکٹر انور سدید بھی اپنی ذات میں ادب کی ایک ایسی تحریک

ہیں جن کے بغیر اُردو تنقید، تاریخِ ادب، انشائیہ اور افکارِ وزیر آغا کی ترویج مکمل نہیں سمجھے جاتے۔ ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر وزیر آغا کا تعلق پھول اور خوش بو جیسا رہا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی ساٹھ ویں سالگرہ کے موقع پر ڈاکٹر انور سدید نے خوب صورت کیک کے ساتھ پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب ''وزیر آغا۔ ایک مطالعہ'' بھی پیش کی۔ ۱۸ مئی ۱۹۸۲ء کو منظر عام پر آنے والی یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ تخلیقی زاویے...... تجزیاتی زاویے...... تنقیدی زاویے...... شخصی زاویے...... صحافتی زاویے...... انتخاب...... حاصل مطالعہ۔

جنوری ۱۹۸۹ء میں ڈاکٹر انور سدید نے اظہارِ عقیدت کا ایک اور مظاہرہ ''شام کا سورج'' مرتب کی۔ ۶۷۸ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مکتبہ فکر و خیال لاہور سے شائع ہوئی جس میں ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر و فن اور مختلف کتابوں کے حوالے سے اہلِ علم و دانش کے بہت سے مضامین شامل ہیں۔ ادبی دنیا میں ایسے معرکے اور خلوص کی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں کہ جب ایک ہم عصر شاعر ادیب دوسرے کی علمی و ادبی قدر و منزلت کا اعتراف کرے۔ اسے حق دوستی اور حق شاگردی کی انمول مثال کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے دنیا کے اُن تمام ممالک میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا رنگ جمایا ہے جہاں جہاں اُردو زبان بولی جاتی ہے یا سمجھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اُن کا پیچھا کرتے ہوئے، اُن کی صلاحیتوں کے منظر اور پسِ منظر کی بوقلمونی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ لالچ سے مبرا، ذاتی اغراض و مقاصد سے بالاتر ہو کر ڈاکٹر انور سدید نے اُردو ادب کو عالمی سطح تک متعارف کروانے میں قابلِ ستائش اور قابلِ تقلید کام کیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا جب ۷ ستمبر ۲۰۱۰ء کو ہمیں مفارقت دے گئے تو انور سدید بول اُٹھے ''کاش! وزیر آغا کے بجائے میں چلا جاتا۔'' ادب دوستی اور احسان مندی کی ایسی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ ۲۰ مارچ ۲۰۱۶ء کے بعد عالمی سطح پر انور سدید کی فکری جولانیوں کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا، وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔ اُن کی ادبی خدمات ایک روشنی کی طرح ہیں اور یہ روشنی ہر سُو پھیل رہی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید ایک شخصیت نہیں بل کہ ایک ادبی تحریک کا نام ہے۔ اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ۸۷ سال ۳ ماہ اور ۱۶ دن بالائے زمین رہنے کے بعد ادب کا یہ چراغ زیرِ زمین روشن ہوا۔ اُن کی رحلت کے ساتھ اُردو ادب کا ایک باب بند ہو گیا۔ اب اُن کی تخلیقات

اُنھیں زندہ رکھنے کے لیے "انوارِادب" ہیں۔ انور سدید کے اقبالیاتی سرمایہ میں کتابوں کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

اقبال کے کلاسیکی نقوش

پبلشرز: اقبال اکادمی، لاہور، اشاعت: اوّل ۱۹۷۷ء۔ ثانی ۱۹۸۸ء، صفحات: ۲۰۲، قیمت ۵۰ روپے

اقبال شناسی اور ادبی دنیا

پبلشرز: بزم اقبال، کلب روڈ لاہور، اشاعت: طبع اول نومبر ۱۹۸۸ء، صفحات: ۳۰۰، قیمت ۹۰ روپے

اقبال شناسی اور اوراق

ناشر: بزم اقبال لاہور، اشاعت: ۱۹۸۹ء، قیمت: ۹۰ روپے، صفحات: ۲۵۶

○○○

ایم ڈی تاثیر، ڈاکٹر

(۱۹۰۲ء۔۱۹۵۰ء)

محمد دین تاثیر المعروف ایم ڈی تاثیر کی شخصیت میں اتنی تاثیر تھی کہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال بھی ان سے بہت متاثر ہوئے۔ان کا شمار ان احباب میں ہوتا ہے جنھوں نے علامہ اقبال کی بزم دوستاں سے فیض حاصل کیا۔بہت سے محققین نے ایم ڈی تاثیر کو بہترین الفاظ میں ہدیہ تحسین پیش کیا ہے۔ایم ڈی تاثیر فکر اقبال کے مختلف گوشوں پر کام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن عمر رواں نے ساتھ نہ دیا۔

ایم ڈی تاثیر ۲۸ فروری ۱۹۰۲ء میں قصبہ اجنالہ ضلع امرتسر میں پیدا ہوئے۔ایم ڈی تاثیر نے ادیب، ناقد، ماہر تعلیم اور شاعر کی حیثیت سے شہرت پائی۔انھوں نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ لاہور سے حاصل کی۔جب وہ ایف سی کالج لاہور میں تعلیمی منازل طے کر رہے تھے تو ان کی ملاقات علامہ محمد اقبال سے ہوئی۔اس کے بعد وہ روزانہ شام کو اقبال کے ہاں چلے جاتے اور شعروادب پر گھنٹوں گفت گو کرتے۔انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد عبداللہ یوسف علی نے ان کو اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی لیکچرر کی حیثیت سے تعینات کیا۔کچھ عرصہ کے بعد علامہ محمد اقبال کے مشورے پر وہ ۱۹۴۴ء میں ولایت چلے گئے اور کیمبرج یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔تاثیر پہلا ہندوستانی شخص تھا، جس نے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

جب واپس وطن لوٹے تو ایک انگریز خاتون کرسٹائل سے شادی کر لی انھیں اپنے ہمراہ لے آئے تو کچھ احباب نے ناراضی کا اظہار کیا۔علامہ محمد اقبال کے سمجھانے پر احباب نے خفگی ختم کی

اور اسلامی طور طریقوں کے مطابق باقاعدہ نکاح ہوا اور اس کی تاریخ بھی اقبال نے خود طے کی تھی اور نکاح بھی خود پڑھایا۔

وہ ایم اے او کالج امرتسر، سری پرتاب کالج سری نگر اور اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل بھی رہے۔ انھی دنوں فیض احمد فیض نے ایلس سے شادی کر لی اس کے بعد فیض احمد فیض اور ایم ڈی تاثیر ہم زلف ٹھہرے۔ انھوں نے ایک ناول بھی لکھا۔ نیز انھوں نے ''نیرنگِ خیال'' کے اقبال نمبر کے لیے ایک خوب صورت مضمون ''اسمائے رجال اقبال کے نام سے لکھا جس میں ایسے لوگوں کے کوائف درج تھے جن کا اقبال کے ساتھ تعلق رہا اور وہ اقبال کی شام دوستاں آباد میں شریک ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر نے ''پاکستان مبارک'' کے عنوان سے سلسلۂ مضامین کا آغاز کیا یہ مضامین ''پاکستان ٹائمز'' میں شائع ہوتے رہے۔ احباب نے اس سلسلے کو بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ ایم ڈی تاثیر نے کئی نامور ادباء کو پڑھایا ہے جن کے ناموں کی فہرست اگر یہاں دی جائے تو ایک دفتر کھل جائے گا۔ ایم ڈی تاثیر علامہ محمد اقبال کی شام دوستاں آباد میں نہ شریک ہوتے بل کہ اقبال سے اکتساب فیض کا موقع بھی ملا۔ اقبال کے افکار کا رنگ ان پر غالب آیا اور انھوں نے کئی خوب صورت نظمیں لکھیں۔ اگر چہ ایم ڈی تاثیر غزل بھی کہتے تھے تاہم ان کا زیادہ تر میلان نظم کی طرف رہا۔ نظم ''ید بیضا'' ان کی ایک شاہکار نظم ہے۔ اس نظم نے انھیں خاصی شہرت عطا کی کیونکہ اس نظم میں موسیقی، مصوری، سنگ تراشی اور دیگر فنونِ لطیفہ کی علامتوں کو برتا گیا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ''آتش کدہ'' (۱۹۵۳ء) اور ناول ''کنول'' (۱۹۵۹ء) کے نام سے منصۂ شہود پر آیا۔ فیض احمد فیض نے ''نثر تاثیر'' کے نام سے ان کی تحریروں کو جمع کیا اور افضل حق قریشی نے مقالات ۱۹۷۷ء میں ترتیب دیئے۔ ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کا ایک بیٹا سلمان تاثیر گورنر پنجاب بھی رہا۔ جسے ان کے گن مین ممتاز قادری نے قتل کر دیا تھا۔ محمد دین تاثیر ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ محمد دین تاثیر کی اقبال کے حوالے سے کتاب کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

اقبال کا فکر و فن

پبلشرز: بزم اقبال۔ لاہور، اشاعت: طبع سوم نومبر ۱۹۹۴ء، صفحات: ۱۷۵، قیمت: ۷۰ روپے

ooo

این میری شمل، پروفیسر، ڈاکٹر

(۷/اپریل ۱۹۲۲ء۔۲۶ جنوری ۲۰۰۳ء)

این میری شمل ۷/اپریل ۱۹۲۲ء کو جرمنی کے شہر اریفورٹ (ساکسنی) میں پیدا ہوئیں۔
این میری شمل جرمن سکالر، ماہر اقبالیات، مستشرق اور اردو زبان کی ماہر اور جنھوں نے اسلام اور تصوف پر کافی کچھ لکھا۔ انیس برس کی عمر میں بون یونی ورسٹی سے "مملوک مصر میں خلیفہ اور قاضی کا رتبہ" کے عنوان پر پی ایچ ڈی کیا۔ انھوں دیگر مستشرقین کی طرح اسلام اور مشرقی تہذیب کی خامیاں تلاش کرنے کے بجائے اس کی خوبیوں پر توجہ دی۔ انھوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا۔ این میری شمل ۱۹۵۸ء سے متعدد بار پاکستان آئیں وہ پاکستان کو اپنا دوسرا گھر سمجھتی ہیں۔ انھوں نے اقبالیات، تصوف اور علوم مشرقیہ پر متعدد لیکچرز بھی دیے۔ ان کو جرمن زبان کے علاوہ عربی، فارسی، اور ترکی سمیت متعدد مشرقی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ انھیں پاکستان کی علاقائی زبانوں سندھی، سرائیکی اور پنجابی سے بھی شغف تھا۔ این میری شمل کی انگریزی اور جرمن شاعری کے دو مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ جس سے ان کے تخلیقی اور دانشورانہ تنوع کا پتا چلتا ہے۔

این میری شمل سو سے زیادہ کتابوں کی مصنّفہ ہیں اور ہاروڈ اور بون یونی ورسٹیوں میں تدریسی فرائض انجام دیتی رہیں۔ ۱۹۵۳ء سے وہ انقرا یونی ورسٹی میں بھی پانچ سال تک وابستہ رہیں۔ اس دوران انھوں نے ترکی زبان میں کتابیں لکھیں اور علامہ اقبال کے کلام جاوید نامہ کا ترکی میں ترجمہ کیا۔ ان کی پیشتر کتابیں اور مضامین تصوف کے موضوع پر ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمان مفکّرین اور شاعروں کی سیکڑوں کتابوں کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا۔ انھوں نے برعظیم پاک و ہند میں اسلام پر

بھی ایک گراں قدر کتاب تصنیف کی ہے۔

این میری شمل نے علامہ اقبال کی شاعری کے مجموعوں ''بانگِ درا''، ''پیامِ مشرق'' اور ''جاوید نامہ'' کا جو جرمن زبان میں ترجمہ کیا ہے، وہ جرمن زبان و ادب میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ ''جاوید نامہ'' کا ترکی زبان میں بھی ترجمہ کیا۔ علامہ اقبال کے مذہبی تصورات سے بڑی متفق تھیں۔ انھوں نے علامہ کے مذہبی خیالات وافکار پر ایک کتاب ''شہپر جبریل'' بھی تصنیف کی جسے اقبالیاتی ادب میں خاص مقام حاصل ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد ریاض نے کیا۔ اس کتاب پر حکومت پاکستان نے انھیں ۱۹۸۸ء میں عالمی صدارتی اقبال ایوارڈ سے سرفراز کیا۔

ان کی گراں قدر علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے ۱۹۸۳ء میں انھیں ہلال امتیاز اور بعد میں ستارہ امتیاز سے بھی نوازا۔ لاہور میں نہر کے ساتھ ساتھ چلنے والی سڑک کا نام عظیم جرمن شاعر گوئٹے کے نام سے منسوب کیا گیا جب کہ نہر سے پار جو سڑک ہے، اس کو این میری شمل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جس کے بارے میں وہ ازراہِ مذاق کہا کرتی تھیں کہ ''پاکستانیوں نے میرے مرنے کا بھی انتظار نہیں کیا'' حکومتِ پاکستان نے ان کے نام سے ایک تعلیمی وظیفہ بھی جاری کیا۔

این میری شمل ۲۶ جنوری ۲۰۰۳ء کو ۸۱ سال کی عمر میں وفات پاگئیں۔ این میری شمل کی قبر پر حضرت علیؓ کا ایک قول درج ہے جس کا ترجمہ ہے ''لوگ بھی سوئے ہیں، مرنے کے بعد بے دار کیے جائیں گے۔''

این میری شمل کی چند معروف کتابوں کے نام یہ ہیں:

(1)--As Through a Veil : Mystical Poetry in Islam (376 pages). New York: Columbia University Press, 1982.

(2)--And Muhammad Is His Messenger: The Veneration of the Prophet in Islamic Piety (367 pages). Chapel Hill: University of North Carolina Press, 1985. ISBN 0807841285.

(3)--Nightingales under the Snow: Poems. London and New York : Khaniqahi Nimatullahi Publications, 1994. ISBN 0933546548.

(4)--Anvari's Divan: A Pocket Book for Akbar. New York: Metropolitan Museum of Art, 1994.

(5)--A Dance of Sparks: Imagery of Fire in Ghalib's Poetry. New Delhi: Ghalib Academy, 1979.
(6)--A Two-Colored Brocade: The Imagery of Persian Poetry. Chapel Hill: University of North Carolina Press, 1992. ISBN 0807820504.
(7)--Deciphering the Signs of God: A Phenomenological Approach to Islam (314 pages). The 1991-1992 Gifford Lectures. (8)--Albany: State University of New York Press, 1994. ISBN 0791419827.
(9)--Gabriel's Wing: Study into the Religious Ideas of Sir Muhammad Iqbal. Karachi: Iqbal Academy, 1989. ISBN 969416012X.
(10)--Mystical Dimensions of Islam (512 pages). Chapel Hill: University of North Carolina Press, 1975. ISBN 0807812714. (11)--Spanish translation: Las dimensiones místicas del Islam, translated by A. López Tobajas and M. Tabuyo Ortega. Madrid: Trotta, 2002. ISBN 8481644862.
(12)--Introducción al Sufismo (152 pages). Barcelona: Editorial Kairós, 2007.
(13)--I Am Wind, You Are Fire: The Life and Work of Rumi. Boston: Shambhala Publications, 1997. Reissued as Rumi's (14)World : The Life and Works of the Great Sufi Poet. Boston: Shambhala Publications, 2001. ISBN 0877736111.
(15)--Im Reich der Grossmoguls: Geschichte, Kunst, Kultur. (16)--Munich: Verlag C.H. Beck, 2000. English translation: The Empire of the Great Mughals: History, Art, and Culture (352 pages). London: Reaktion Books, 2004. ISBN 1861892519.
(17)--Look! This Is Love. Boston: Shambhala Centaur Editions, 1996. ISBN 1570622248.
(18)--The Triumphal Sun: A Study of the Works of Jalaloddinn Rumi. London: East-West Publications, 1980.
(19)--Islamic Literatures of India. Wiesbaden : Otto Harrassowitz Verlag, 1973. ISBN 3447015098.
(20)--Mohammad Iqbal, Poet and Philosopher: A Collection of

Translations, Essays, and Other Articles. Karachi : Pakistan-German Forum, 1960.

(21)--Classical Urdu Literature: From the Beginning to Iqbal. A History of Indian Literature, v. 8. Wiesbaden: Otto Harrassowitz Verlag, 1975. ISBN 344701671X.

(22)--Islam: An Introduction (166 pages). Albany: State University of New York Press, 1992. ISBN 0791413276.

(23)--We Believe in One God: The Experience of God in Christianity and Islam, edited by Annemarie Schimmel and Abdoldjavad Falaturi; translated by Gerald Blaczszak and Annemarie Schimmel. London: Burns & Oates, 1979.

(24)--Islamic Calligraphy. Evanston, Ill.: Adler's Foreign Books, 1970.

(25)--Calligraphy and Islamic Culture. New York University Press, 1990. ISBN 0814778968.

(26)--Islamic Names: An Introduction (134 pages). Edinburgh University Press, 1990. ISBN 0852246129.

(27)--Meine Seele ist eine Frau. Munich: Kosel Verlag, 1995.

(28)--English translation: My Soul Is a Woman: The Feminine in Islam (192 pages). New York and London: Continuum, 1997. ISBN 9780826414441.

(29)--Make a Shield from Wisdom: Selected Verses from Nasir-I Khusraw's Divan (112 pages), translated and introduced by Annemarie Schimmel. London: I.B. Tauris, in association with the International Institute of Ismaili Studies, 2001. ISBN 1860647251.

(30)--Pain and Grace: A Study of Two Mystical Writers of Eighteenth-Century Muslim India. Leiden: Brill, 1976. ISBN 9004047719.

(31)--Das Mysterium der Zahl (310 pages). Munich: Eugen Diederichs Verlag, 1983. English edition, The Mystery of Numbers (314 pages). New York: Oxford University Press, 1993. ISBN 0195089197.

(32)--Islam and the Wonders of Creation: The Animal Kingdom. London:

Al-Furqan, Islamic Heritage Foundation 2003. ISBN 9781873992814.
(33)--Introduction to Cats of Cairo: Egypt's Enduring Legacy, with photographs by Lorraine Chittock. New York: Abbeville Press, 1995.
(34)--Reissued as Cairo Cats: Egypt's Enduring Legacy (96 pages). American University in Cairo Press, 2005. ISBN 9771724312.

ان کی کتاب کا تذکرہ درج ذیل ہے:

شہپرجبریل

پبلشرز: گلوب پبلشرز، لاہور، اشاعت: ۱۹۸۷ء، صفحات: ۴۸۰، قیمت: ۱۵۰ روپے

OOO

بشیر احمد ڈار

(۱۹۰۸ء۔۲۹ مارچ ۱۹۷۹ء)

بشیر احمد ڈار ۱۹۰۸ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ بشیر احمد ڈار نے بحیثیت ممتاز ادیب، ماہر تعلیم، اقبالیات، محقق اور نقاد کے شہرت پائی۔ انھیں سب سے زیادہ شہرت اقبال کی وابستگی کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ ان کا اقبالیاتی کام بہت زیادہ سراہا گیا۔ بشیر احمد ڈار ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۵ء تک ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور سے وابستہ رہے۔ اسی طرح بحیثیت ڈائریکٹر اقبال اکادمی پاکستان لاہور ان کی خدمات بھی نا قابلِ فراموش ہیں۔ انھوں نے اس ادارے کی بنیادوں کو مستحکم کیا اور اسے ترقی کی شاہراہ پر گامزن کیا۔ بزم اقبال کے مجلّہ ''اقبال'' کی مجلس ادارت میں بھی شامل رہے۔

ان کی معروف کتب میں ''انوار اقبال (۱۹۶۷ء)'' ''اقبال اور احمدیت''، ''انگریزی ترجمہ پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' (۱۹۷۷ء) جب کہ انگریزی کتب میں

☆ A Study in Iqbal's Philosophy

☆ Iqbal's Philosophy of Society

☆ Letters of Iqbal

☆ Letters & Writinge of Iqbal

☆ Why Pakistan?

شامل ہیں۔

بشیر احمد ڈار کا شمار ممتاز اقبال شناسوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں پر بہت سا کام نذر اقبالیات کیا ہے۔ اقبال کے نثر پارے، ان کے مضامین کے علاوہ ان کے خطوط میں جلوہ افروز ہیں۔ خطوط اقبال پر کئی دیگر احباب کی طرح بی اے ڈار نے بھی اپنی عقیدت اور محبت

کا اظہار کیا ہے۔ ''انوار اقبال'' میں نہ صرف اقبال کے خطوط شامل ہیں بل کہ کئی خطوط کے عکس بھی ملتے ہیں۔ کئی خطوط کی تعلیقات نے حسن معانی میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ''انوار اقبال'' میں شامل متعدد خطوط ادبی، علمی اور تعلیمی نوعیت کے ہیں۔ خطوط کے علاوہ سپاس ناموں اور شعری لطافتوں نے کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔

علامہ محمد اقبال کے خطوط، تقاریظ، مضامین، متفرق تحریریں اور منظومات کسی بھی مجموعہ ہائے اقبال میں شامل نہیں ہو سکے۔ یہ قیمتی و نایاب تحریریں بشیر احمد ڈار نے یک جا کر کے ایک بہت بڑا علمی و ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ خطوط کسی بھی عہد کے نباض ہوتے ہیں۔ خطوط کے ذریعے ہم سیاست، ادب، معاشرت اور سماجی رویوں کی بود و باش کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ بشیر احمد ڈار کا یہ قیمتی اثاثہ یقیناً اقبال شناسی میں ایک اہم پیش رفت ثابت ہوگا۔ ان کی یہ کاوش مدتوں یاد رکھی جائے گی۔ ''انوارِ اقبال'' کی اشاعت سے پتہ چلتا ہے کہ بشیر احمد ڈار ایک سچے، کھرے، فرض شناس، دیانت دار اور اقبال شناس ہیں۔ کتاب میں کئی ایسی تحریریں شامل ہیں جن پر محققین مزید کام کر سکیں گے۔

بشیر احمد ڈار نے فکر اقبال کی تفہیم اور اقبال کے خطوط مرتب کرنے میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ''انوارِ اقبال'' کے تعارف میں ان کی بہت سی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ بشیر احمد ڈار ۲۹ مارچ ۱۹۷۹ء کو لاہور میں رحلت فرما گئے۔ انھیں میانی صاحب سپردِ خاک کیا گیا۔

انوار اقبال

پبلشرز: اقبال اکادمی کراچی، اشاعت: مارچ ۱۹۶۷ء، صفحات: ۳۴۸، قیمت: ۱۲ روپے

اقبال اور احمدیت

پبلشرز: م، ع، سلام آئینۂ ادب، لاہور، اشاعت: ۱۹۸۴ء، صفحات: ۱۲۷، قیمت: ۱۵ روپے

Letters of Iqbal and Writings

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت ۱۹۷۸ء، صفحات: ۲۷۰

ooo

بہادر یار جنگ

(۱۹۰۵ء۔۱۹۴۴ء)

بہادر یار جنگ ۵ مارچ ۱۹۰۵ء کو نواب نصیب یاور جنگ کے ہاں پیدا ہوئے۔ بہادر یار جنگ پٹھان خانوادے سے تعلّق رکھتے تھے ان کے آباؤ اجداد افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔ ان کی ولادت کے ایک ہفتہ بعد ان کی والدہ قضائے الٰہی سے رحلت فرما گئیں۔ ان کی پرورش کی ذمہ داری ان کے ننھیال میں ان کی نانی کے ذمہ آئی۔ انھوں نے بڑے پیار اور محبت سے ان کی پرورش کی۔ اسلامی تعلیمات پر ان کے بچپن میں زیادہ توجہ دی گئی تھی یہی وجہ ہے کہ محمد بہادر یار جنگ ابھی مدرسہ دارالعلوم میں میٹرک کے طالبِ علم تھے کہ ان کے والد ۱۹۲۳ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے والد کے ذمہ پانچ لاکھ روپے قرض تھا۔ بہادر یار جنگ نے اس قرض سے انکار نہیں کیا بل کہ اس کی اقساط کروا کر رقم کی آٹھ سال میں ادائیگی کی۔

بہادر یار جنگ کی عمر ابھی ۲۶ سال تھی کہ انھوں نے ۱۹۳۱ء میں بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کی۔ انھوں نے یہ سیاحت حکومت آصفیہ حیدر آباد کے نمائندہ کی حیثیت سے کی۔ انھوں نے چھ ماہ یہ سیاحت جاری رکھی۔ ۱۲/اپریل ۱۹۳۱ء کو فریضہ حج ادا کیا۔ اس سفر میں وہ بیروت، قاہرہ، دمشق، استنبول، بغداد، تہران، کابل، جدہ، مکہ مکرمہ اور مدینہ شریف گئے۔ اس سے قبل ۳۰ مئی ۱۹۱۹ء کو ان کی شادی خانہ آبادی ہوئی۔ بہادر یار جنگ اعلیٰ درجہ کے مقرر اور شعلہ بیاں خطیب تھے۔ نواب بہادر یار جنگ نے ۱۹۲۷ء میں ایک مجلس تبلیغ اسلام کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم کے تحت انھوں نے مختلف شہروں میں تقاریر کا سلسلہ شروع کیا۔ خاص طور پر سیرت نبویؐ کے موضوع پر خطبات اور تقاریر کرتے رہے۔ جس

میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے۔انہی خطبات کی وجہ سے نظام حیدر آباد نے محمد بہادر خاں کو''نواب بہادر یار جنگ'' کا خطاب سے سرفراز کیا۔نواب بہادر یار جنگ برعظیم پاک و ہند کی سیاسی صورت حال پر عمیق نظر رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔بل کہ انھوں نے مسلم لیگ کے کئی اجلاس میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے رہے۔۱۹۳۹ء میں نواب بہادر یار جنگ نے مؤتمر میلاد النبی کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔اس تنظیم کے تحت ریاست بھر کے علما اور دانش وروں کو اظہار خیال کا موقع دیا جاتا۔مسلم لیگ کے تاریخ ساز جلسوں میں تقاریر کرتے رہے خاص طور پر لاہور میں ہونے والے اجلاسوں میں شریک ہوئے۔نواب بہادر یار جنگ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں ۱۹۴۲ء میں اور ۱۹۴۳ء میں کراچی منعقدہ اجلاس میں بڑی پر جوش اور ولولہ انگیز تقاریر کے جوہر دکھائے۔۱۹۴۲ء کے اجلاس میں انھوں نے قائداعظم محمد علی جناح کے صدارتی خطبہ کا فی البدیہہ اردو ترجمہ بھی کر دیا۔نواب بہادر یار جنگ قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ محمد اقبال کے بہت بڑے مداح تھے۔وہ ہر جمعۃ المبارک کے افکار و خیالات پر ایک خصوصی خطاب کرتے تھے۔علامہ اقبال کی یاد میں تعزیتی اجلاس بھی ۱۵ دسمبر ۱۹۴۰ء کو حیدر آباد میں منعقد کروایا۔نواب بہادر یار جنگ اپنے عہد کے ایک جید عالم اور مفسر قرآن تھے۔

نواب بہادر یار جنگ نے برعظیم پاک و ہند کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ ان کی تقاریر اور پر جوش خطابت کے کئی لوگ مداح تھے۔سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر بڑی خیال افروز تقاریر کرتے۔کئی بڑے علماء ان کی دل سے قدر کرتے۔ان کا احترام اور عقیدت کرتے۔ سیاسی حلقوں میں بھی نواب بہادر یار جنگ کا ایک خاص مقام و مرتبہ تھا۔وہ پاکستان کے بنیادی اکابر میں سے تھے جنھوں نے پاکستان کی بنیاد استوار کرنے میں خون جگر سے آبیاری کی۔علامہ محمد اقبال کی شاعری اور ان کی اوصاف جمیلہ کے بہت بڑے مداح تھے۔نواب بہادر یار جنگ ۲۵ جون ۱۹۴۴ کو انتقال کر گئے۔

ooo

جابر علی سید، پروفیسر

(۲۷ جولائی ۱۹۲۳ء۔۳ جنوری ۱۹۸۵ء)

پروفیسر جابر علی سید ۲۷ جولائی ۱۹۲۳ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ جابر علی سید نے اردو کے ممتاز ادیب، ماہر لسانیات، ماہر اقبالیات اور مترجم کی حیثیت سے شہرت پائی۔ حصول تعلیم کے بعد درس و تدریس کا پیشہ اپنایا۔ مختلف ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے صدر شعبہ فارسی گورنمنٹ کالج ملتان تک پہنچے۔ ملتان کے علمی و ادبی حلقوں میں پروفیسر جابر علی سید کا نام کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انھیں انگریزی، اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر عبور حاصل رہا۔ ملتان کے گرد و نواح میں فارسی پڑھنے والے کسی نہ کسی طور ان کے حلقہ شاگردی میں شامل رہے۔ آج لغت کے حوالے سے عقیل عباس جعفری (کراچی والے) بڑی مقبولیت کے حامل ہیں۔ لغت کی ترتیب و تدوین بہت مشکل کام ہے۔ لسانیات کی تدریس یا لسانی عروض پر کچھ لکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ پروفیسر جابر علی سید کتبِ لغت، کے تحقیقی و لسانی جائزے کے حوالے سے اپنی شناخت رکھتے تھے۔ ان کے کام کی روشنی میں آج بہت سے ماہرین لسانیات اپنے تحقیقی کام کی راہیں منور کر رہے ہیں۔ اردو ہماری قومی زبان لیکن پروفیسر جابر علی سید نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے لیے کام کیا۔ ان کا تخلیقی و تحقیقی سرمایا محققین کے لیے جادۂ منزل ہے۔

ان کی معروف کتب میں ''اقبال کا فنی ارتقاء''، ''اقبال ایک مطالعہ''، ''کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ (جلد اول)''، ''ترجمہ رباعیات عمر خیام''، ''لسانی و عروض مقالات'' شامل ہیں۔ درس و تدریس کا یہ سورج اپنی تمازتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے ۳ جنوری ۱۹۸۵ء کو ملتان میں

غروب ہوگیا۔ پروفیسر جابر علی سید نے اقبالیات کے حوالے سے جو تحقیقی وتنقیدی کام کیا ہے۔ اسے بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ خاص طور پر ان کی کتاب ''اقبال کا فنی ارتقاء'' نہایت اہم ہے۔ ''اقبال کا فنی ارتقا'' پروفیسر جابر علی سید کے مختلف مضامین کا ایک ایسا مجموعہ ہے، جس میں اقبال کا ذہنی و فنی ارتقاء اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری اقبال کی شاعری کو پرت در پرت پرکھتا، جانچتا اور دل میں اُتارتا رہتا ہے۔ کسی بھی شاعر کا فنی ارتقاء اس کی کامیابی و کامرانی کا ایک گراف ہے۔ وہی شاعر کامیاب کہلاتا ہے جس کی شاعری کسی ایک نقطہ پر مرکوز نہ ہو۔ اقبال زمانۂ طالبِ علمی سے ارتقائی نردبان پر قدم رکھ کر اردو شاعری کی کہکشاں تک جا پہنچے۔

اِس کتاب میں علامہ اقبال کے فنی ارتقا پر گیارہ مضامین لکھے گئے ہیں جن میں اقبال اور لفظ و معنی کا رشتہ''سٹینزا اور ہماری شاعری''اقبال سے پہلے''اقبال کا فنی ارتقاء''ابوالعلا معری، ایزرا میرزا اور اقبال''،''اقبال کے تین لہجے''،''اقبال اور پروفیسر پطرس بخاری''،''مکالماتی نظم۔ اقبال کا ایک فنی پیکر''،''اقبال اور خطابیہ نظم''،''اقبال کی ایک غزل''،''اقبال کا شعری آہنگ'' اور ''اقبال کا تصوّرِ فن'' شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ دیا گیا ہے، جسے احمد رضا نے مرتب کیا ہے۔ اسے اشخاص، مقامات، ادارے، کتب، رسائل اور نظموں کی مناسبت سے تقسیم کیا گیا ہے۔ ان کی کتاب ''اقبال کا فنی ارتقاء'' کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال کا فنی ارتقاء

پبلشرز: بزمِ اقبال، لاہور، اشاعت، جولائی ۱۹۷۸ء، صفحات ۱۷۳، قیمت: ۱۴ روپے

ooo

جاوید اقبال، ڈاکٹر، جسٹس

(۵/اکتوبر ۱۹۲۴ء-۳/اکتوبر ۲۰۱۵ء)

فرزندِ اقبال، جاوید اقبال نے اپنے والدِ گرامی کے نقشِ قدم چلتے ہوئے عملی زندگی میں بھرپور جدوجہد کی۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ (۹ نومبر ۱۸۷۷ء-۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء) اسلامی جذبوں کے عظیم شاعر تھے۔ علامہ محمد اقبال نے اپنی شاعری میں خودی اور نوجوانوں کو اہم جگہ دی۔ جاوید اقبال سے اُن کی محبت لازوال رہی۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی دوسری بیوی سردار بیگم ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو دنیا سے عالم بالا عازمِ سفر ہوئیں۔ جاوید اقبال ۵/ اکتوبر ۱۹۲۴ء اتوار بمطابق ۶ ربیع الاول ۱۳۳۴ھ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ صرف گیارہ سال کی عمر میں ماں کا سایہ سر سے اُتر گیا۔ ۳۰/ اگست ۱۹۳۰ء کو اُن کی بہن منیرہ اقبال پیدا ہوئیں۔ جسٹس جاوید اقبال کے بڑے بھائی آفتاب اقبال ۲۳ جون ۱۸۹۸ء کو پنڈ دادنخان میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا ڈاکٹر شیخ عطا محمد سول سرجن تھے۔ آفتاب اقبال ۱۳ اگست ۱۹۷۹ء کو لندن میں انتقال کر گئے۔ انھیں سخی حسن قبرستان کراچی میں دفن کیا گیا۔ دونوں بہن بھائی ماں کی شفقت کے بغیر محنت کرتے رہے۔ اُنھوں نے اُردو، انگریزی کی بہت سی اصناف پر کام کیا۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں اُن کی تحریروں کو خاص جگہ دی جاتی ہے۔ وہ انگریزی اور اُردو کے نہ صرف بہترین لکھاری تھے بل کہ شعلہ نوا مقرر بھی تھے۔ اُنھوں نے تحقیق، ڈرامہ نویسی، اقبالیات اور قانون میں اپنا بلند مقام پیدا کیا۔ جاوید اقبال نے ۱۹۵۴ء میں انگریزی اور فلسفہ میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ طلائی تمغہ حاصل کر کے فلسفہ میں اپنے والد کی روایت کو برقرار رکھا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے کیمبرج یونی ورسٹی انگلستان چلے گئے۔ جہاں سے اُنھوں نے پی ایچ ڈی کی

ڈگری حاصل کی۔ پی ایچ ڈی کے بعد ۱۹۵۶ء میں بار ایٹ لاء ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ قانونی مہارت کی وجہ سے انھوں نے ۱۹۶۰ء میں آسٹریا کے شہر کینبرا میں آئین کے حوالے سے منعقدہ ایک مذاکرہ میں شرکت کی۔ اقوام متحدہ میں پاکستان کی نمائندگی کا تین مرتبہ اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۶۱ء میں امریکی حکومت کی دعوت پر امریکہ تشریف لے گئے۔ کالجوں، یونی ورسٹیوں اور مختلف اداروں میں (اقوامِ متحدہ کا مستقبل) کے عنوان پر سیر حاصل لیکچر دیے۔ ۱۹۶۵ء ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے نائب صدر اور ۱۹۷۱ء لاہور ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ ۵/اکتوبر ۱۹۸۶ء سے ۴/اکتوبر ۱۹۸۹ء تک عدالت عظمٰی پاکستان کے سینئر جسٹس کا عہدہ سنبھالا۔ ۸/مارچ ۱۹۸۲ء تا ۵/اکتوبر ۱۹۸۶ء لاہور میں عدالتِ عالیہ کے چیف جسٹس بھی رہے۔ اُنھیں بہترین خدمات کے اعتراف میں ہلالِ امتیاز سے نوازا گیا۔ عجب اتفاق ہے کہ وہ ۵/اکتوبر ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے اور ۳/اکتوبر ۲۰۱۵ء کو انتقال کر گئے۔ اکتوبر کا مہینہ ان کی زندگی میں اہمیت کا حامل ہے۔ منیرہ بانو کی شادی مارچ ۱۹۴۹ء میں میاں صلاح الدین العروف صلی صاحب سے ہوئی۔ میاں صلاح الدین ۴ جون ۱۹۱۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ تحریک پاکستان کے کارکن اور قائداعظم کے باڈی گارڈ رہے۔ ان کے والد میاں امیر الدین ڈاکٹر علامہ اقبال کے مداحوں میں سے تھے۔ میاں صلاح الدین ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۵ء تک صوبائی وزیرِ مواصلات رہے۔ ۱۹۶۲۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۷ء میں قومی اسمبلی کے رکن رہے۔ میرا ان سے تعلق سول ڈیفنس کے حوالے سے تھا کیونکہ وہ لاہور کی سول ڈیفنس کے ۱۹۳۹ء سے ۱۹۹۸ء تک چیف وارڈن رہے۔ بحیثیت چیئرمین صلی ٹیکسٹائل ملز انھوں نے عوام الناس کی بہت خدمت کی۔ وہ ۲۵ نومبر ۱۹۹۸ء کو لاہور میں انتقال کر گئے اور انھیں لاہور میں ہی سپردِ خاک کر دیا گیا۔ میاں صلاح الدین کے تین بیٹے اسد صلاح الدین، یوسف صلاح الدین اور اقبال صلاح الدین ہیں۔ جسٹس جاوید اقبال کے دونوں فرزند منیب اقبال اور ولید اقبال لاہور کی جانی پہچانی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ان کے اہل خانہ کو اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔ اقبال صلاح الدین صاحب سے فون پر گاہے گاہے رابطہ ہوتا ہے وہ دبستان اقبال کو فعال بنانے کے لیے ہمہ تن مصروف عمل ہیں۔

جسٹس جاوید اقبال کی کتاب ''میراث قائداعظم'' (۱۹۶۷ء) میں منظر عام پر آئی۔ اُنھوں نے انگلش میں علامہ اقبال کی نوٹ بکس ''Stray Reflections'' (۱۹۶۱ء) مرتب کر کے چھپوائی،

جس کا اُردو ترجمہ افتخار احمد صدیقی نے کیا۔ آج بھی ''شذراتِ فکرِ اقبال'' کے لاتعداد ایڈیشن منظر عام آچکے ہیں۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کی سوانح حیات ''زندہ رود'' تین جلدوں میں شائع کرنے کا اعزاز بھی جاوید اقبال کو حاصل ہے۔ آج کل یہ کتاب ایک جلد میں بھی دستیاب ہے۔ خطباتِ اقبال، تسہیل و تفہیم، رضیہ سلطانہ (ڈراما)، افکار اقبال (تشریحات جاوید)، اس کے علاوہ ڈرامے، افسانے اور مقالے ''جہان جاوید'' (دو جلدیں) (۲۰۰۴ء) کی شکل میں شائع ہوئے۔ اُنھوں نے ''افکارِ اقبال کی تشریحات جاوید'' (۲۰۰۵ء) اور مقالوں پر مشتمل ''مےَ لالہ فام'' (۱۹۹۶ء) بھی لکھی۔

اپنی خودنوشت اور سوانح حیات ''اپنا گریباں چاک'' (۲۰۰۱ء) میں شائع ہوئی جب کہ ۲۰۱۵ء میں معارف اشاعتی ادارے سنگِ میل نے ایک اضافہ شدہ ایڈیشن بھی شائع کیا۔ جس میں نادر تصاویر بھی شامل ہیں۔ ''اپنا گریباں چاک'' کا صفحہ نمبر ۳۳۶ قابلِ توجہ ہے:

''خیر، حضرتِ اقبالؒ کے گلے شکوے اپنی جگہ۔ اُن کے ہاں کم عمر پانے کے احساس نے شوق کی صورت اختیار کرلی تھی۔ ''جاوید نامہ'' ہی میں فرماتے ہیں: ''میں نے خدا سے لمبی زندگی نہیں مانگی۔ کم عمر چاہنے ہی میں طولِ حیات اور بقا ہے۔'' اسی احساس کے تحت وہ زندگی میں وصیتیں لکھ گئے اور بعد از موت کے بارے میں ہمارے لیے مناسب انتظامات کر گئے لیکن میرا ارادہ کوئی وصیت تحریر کرنے کا نہیں۔ صرف ناصرہ سے کہہ رکھا ہے کہ موت کے بعد مجھے قبرستان میں اُن کے احاطے میں دفنایا جائے۔

''برزخ کیا ہے؟''، ''عذابِ قبر'' کا مطلب کیا ہے؟ قبر میں مردے کو ''محراب'' کے حصہ میں رکھا جاتا ہے اور اسی طرح مسلم طرز کے تابوت میں مردے کے بیٹھ سکنے کی جگہ بنائی جاتی ہے تاکہ ''منکر نکیر'' قبر میں مردے کو بٹھا کر اُس کے اعمال کے بارے میں سوال پوچھ سکیں۔ پھر بھی ''برزخ'' کیا ہے؟

بہر حال مجھے تو زندگی کی دو ہی قسموں کا علم ہے۔ ایک وہ جس کا انجام موت ہے اور دوسری وہ جب روز قیامت دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ یعنی ایک وہ قسم جو میری عقل کے مطابق حقیقت ہے اور دوسری وہ جس پر میرا ایمان ہے لیکن ''برزخ'' کس قسم کی حیات ہے؟ حیات ہے یا دوبارہ اٹھائے جانے تک مردے کو ایک لطیف قسم کا لباس بھی عطا کیا جائے گا، جسے وہ ''نسمہ'' کہتے ہیں۔ اقبال اس لطیف لباس کو سنسکرت کے لفظ ''سریر'' کا نام

دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اصلاح کا عمل قبر میں بھی جاری رہے گا۔ ''جاوید نامہ'' میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں: ''خدا کرے کہ تجھے ''رقصِ جان'' نصیب ہو۔ میں تو زندگی بھر تجھ پر دینِ مصطفیٰ ﷺ کے اسرار افشا کرتا رہوں گا بل کہ قبر کے اندر بھی تمھاری بہتری کے لیے دُعا کرتا رہوں گا۔'' (آپ کی اِن دعاؤں کے باعث ہی میری ساری زندگی ہنستے کھیلتے گزر گئی۔ خدا کا شکر ہے کسی پشیمانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ البتہ ''رقصِ جان'' شاید میرے نصیب میں نہیں)۔ بہر حال اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ موت کے بعد روح جسم کے اندر ہی رہتی ہے اگر چہ وقتی طور پر ''معطل'' ہو جاتی ہے اور قبر میں اُسے دوبارہ ''رواں'' کر دیا جائے گا لیکن سوال پیدا ہوتا ہے: اگر ''عذاب'' کا تعلق ''قبر'' ہی سے ہے تو اُس مردے کا کیا حشر ہو گا جسے کسی جانور نے نگل لیا یا جسے جلا دیا گیا یا جس کی لاش کو گدوں اور چیلوں نے نوچ کھایا، یا جو سمندر میں غرق ہو کر مچھلیوں کی غذا بنا؟ ابھی تک تو کوئی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو کر بتانے نہیں آیا کہ موت کے بعد اس پر کیا گزری۔ گویا یہ معاملہ بقول شخصے: ''یارا پیا جانے یا وا پیا جانے''۔

۲۱۰۴ء آ گیا۔ میں نئے سال کو خوش آمدید کیسے کہوں؟ نہ کچھ لکھنے کو دل چاہتا ہے نہ پڑھنے کو۔ نہ گھر سے باہر نکلنے کا ارادہ ہے نہ کسی کو ملنے کی خواہش ہے۔ عجیب پریشانی کے عالم میں ہوں۔ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ اس لیے بات ختم کرتا ہوں۔''

انگلش میں دیگر کتب نظریۂ پاکستان اور اسلام کے حوالے سے ہیں، جیسے ''Ideology of Pakistan'' (۱۹۵۹ء) اور ''Islam & Pakistan's Identity'' (۲۰۰۷ء)۔ اس کی سوانح کا انگریزی ترجمہ ''Encounters with Destiny'' کے نام سے ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آئی۔ ۲۰۰۴ء میں اُن کی کتاب ''زندہ رود'' کو صدارتی ایوارڈ اور آپ بیتی پر ہلال امتیاز دیا گیا۔ جسٹس جاوید اقبال پارلیمنٹ آف کلچرز انقرہ کے اعزازی رکن بھی رہے۔ قونیہ یونی ورسٹی ترکی نے ۱۹۸۳ء میں اُنھیں اعزازی ڈاکٹریٹ ڈگری سے نوازا۔

ممتاز محقق، ڈاکٹر انور محمود خالد نے نام ور، ادبی جریدہ ''الحمراء'' نومبر ۲۰۱۷ء میں جسٹس جاوید اقبال کی تصانیف و تالیف کے بارے میں لکھا ہے:

''ڈاکٹر جاوید اقبال مرحوم کی مصنفہ و مرتبہ کتابوں کی تعداد ڈیڑھ درجن ہے۔ ان کی زیادہ

معروف کتابیں چار ہیں۔ یعنی (۱) مئے لالہ فام، (۲) زندہ رود، (۳) اپنا گریباں چاک اور (۴) ان کا پی ایچ ڈی (فلسفہ) کا تحقیقی مقالہ بہ عنوان: The Development of Political Philosophy of Islam جو پیمبرک کالج کیمبرج یونی ورسٹی میں پروفیسر اے جے آر بری اور پروفیسر روبن لیوی کی زیر نگرانی ۱۹۵۴ء میں مکمل ہوااور بعدازاں اپنے نئے نام Islam and Pakistan's Identity کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کا اُردو ترجمہ سید قاسم محمود نے ''اسلام اور پاکستانی تشخص'' کے نام سے ۲۰۱۲ء میں چھپوایا۔

اُن کی دیگر اہم لیکن نسبتاً کم پڑھی جانے والی کتابوں میں ''جہانِ جاوید'' (۱) افکارِ اقبال ......تشریحاتِ جاوید، (۲) میراثِ قائداعظم، (۳) خطباتِ اقبال...... تسہیل و تفہیم، (۴) مقالاتِ جاوید، (۵) رضیہ سلطانہ (ڈرامہ) اور (۶) نثری ترجمہ...... جاوید نامہ اقبال۔

ان میں ''افکارِ اقبال......تشریحات جاوید'' ان کے ۷ا ٹی وی خطبات کا مجموعہ ہے جو فکرِ اقبال کے اساسی موضوعات پر عام فہم زبان میں پیش کیے گئے اور بعدازاں کتابی شکل میں محفوظ کیے گئے۔ ''میراثِ قائداعظم'' ڈاکٹر جاوید اقبال کی انگریزی کتاب The Legacy of Quaid-e-Azam کا اُردو روپ ہے۔ ''خطباتِ اقبال...... تسہیل و تفہیم'' میں علامہ محمد اقبال کے سات فلسفیانہ انگریزی خطبات بہ عنوان The Reconstruction of Religious Thought in Islam کے مطالب کو آسان اور عام فہم اُردو زبان میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے۔ ان کے اُردو عنوانات سے ہی ان کی تسہیل و تفہیم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو یہ ہیں: (۱) علم اور مذہبی تجربہ (۲) مذہبی تجربے کے انکشافات کا فلسفیانہ امتحان (۳) خدا کا تصور اور مفہومِ دعا (۴) انسانی خودی، اُس کی آزادی اور حیات بعد موت (۵) اسلامی تمدن کی روح (۶) اسلام کے نظام میں حرکت کا اصول (۷) کیا مذہب کا امکان ہے؟ ایک اور گراں قدر تصنیف ''مقالاتِ جاوید'' میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی ادبی، فکری اور قانونی مباحث پر 39 اُردو تحریریں جمع کی گئی ہیں۔ جنھیں محمد سہیل عمر اور طاہر حمید تنولی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ یہ ضخیم مجموعۂ مقالات چار حصوں پر مشتمل ہے۔ جو درج ذیل ہیں: حصہ اوّل: اسلام کی سیاسی فکر۔ حصہ دوم: اقبالیات ...... (الف) شخصیات (اقبال، چودھری محمد حسین، آغا شورش کاشمیری) (ب) علمی مباحث حصہ سوم: پاکستانیات۔ حصہ چہارم: ادب۔ ادبی زندگی کے آخری دور میں ان کی دو بہترین تصانیف سامنے آئیں۔ (۱) ''رضیہ سلطان'' کے نام سے ڈاکٹر جاوید اقبال کا تین ابواب میں

لکھا ہوا ایک طویل تاریخی ڈرامہ جسے نظریاتی کش مکش والے خوب صورت علامتی ڈراموں کی صفِ اوّل میں رکھا جا سکتا ہے۔ اسے پڑھیں تو یوں لگتا ہے کہ یہ صدیوں پہلے کی کہانی نہیں بل کہ آج کی سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی زوال کا منظر نامہ ہے۔ اس اُردو ڈرامے کا انگریزی ترجمہ بھی دستیاب ہے۔ (۲) نثری ترجمہ...... جاوید نامہ اقبال جو ڈاکٹر جاوید اقبال کا آخری ادبی شاہکار ہے اور جو آسمانی ڈرامہ کی ایک نئی ہیئت میں لکھا گیا ہے اور جس میں علامہ اقبال کی بہترین فارسی شعری تصنیف ''جاوید نامہ'' (جو خود ایک لحاظ سے جدید معراج نامہ ہے) کے مطالب کو سادہ و سلیس اور رواں اُردو نثری زبان میں ڈھالا گیا ہے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر جاوید اقبال نے ۸/ انگریزی کتب بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے دو کتابوں کا سطور بالا میں ذکر ہو چکا ہے یعنی The Legacy of Quaid-e-Azam اور Islam and Pakistan's Identity جن کے اُردو تراجم اب عام دستیاب ہیں۔ دیگر چھ انگریزی کتابوں کے نام درج ذیل ہیں:

(1) Ideology of Pakistan and its Implimentation
(2) Iqbal in Politics
(3) Essays of Dr. Javid Iqbal (Studies in Iqbal's thought and Philosophy)
(4) Intellectual legacy (Essays on Academic, literary, educational issues, political thought and Pakistan)
(5) Encounters with destiny
(6) Stray reflections (Private note book of Allama Iqbal)

ان میں اپنی پہلی انگریزی کتاب Ideology of Pakistan and its Implimentation (نظریہ پاکستان اور اس پر عمل درآمد) کے ذریعے ڈاکٹر جاوید اقبال، اوّل اوّل پاکستان کے سیاسی اور فکری اُفق پر طلوع ہوئے۔ اس کتاب کا دیباچہ صدر ایوب خان نے لکھا۔ ان کی دوسری کتاب Iqbal in Politics (اقبال...... میدان سیاست میں دراصل ڈاکٹر جاوید اقبال کی مشہور اُردو تصنیف ''زندہ رود'' کے حصہ سوم کا انگریزی ترجمہ بل کہ ترجمانی ہے کیوں کہ اس میں اس کے مترجم، پروفیسر حفیظ ملک نے جابجا ترمیم و تنسیخ اور فکر و اضافے سے کام لیا ہے۔ ان کی تیسری کتاب Essays of Dr. Javid Iqbal (مقالاتِ جاوید اقبال) ہے، جو اقبال کے فکر و فلسفہ کے بارے

میں ۳۱ مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ چار حصوں میں منقسم ہے۔
(۱)Iqbal The Person(اقبال کی شخصیت)، (۲)Iqbal Comparative Study(اقبال کا تقابلی مطالعہ)، (۳)Iqbal Thought and Philosophy(اقبال کی فکر اور فلسفہ)، (۴)Iqbal The political thinker(اقبال بہ حیثیت سیاسی مفکّر)
اس گراں قدر مجموعہ مقالات کو محمد سہیل عمر، افضل حق قرشی اور طاہر حمید تنولی نے مرتب کیا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کے انگریزی مقالات جو علمی، ادبی اور تعلیمی مسائل، سیاسی افکار اور پاکستان کے بارے میں ہیں انھیں بھی محمد سہیل عمر، افضل حق قرشی اور طاہر حمید تنولی نے Intellectual Legacy(میراثِ حکمت) کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی چوتھی اہم تصنیف ہے اور یہ ۵۵ انگریزی مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب درج ذیل 6 حصوں میں منقسم ہے۔(۱)Pakistan(۲)Academic educational and literary issues(علمی، تعلیمی اور ادبی مسائل)(۳)Political Thought(سیاسی فکر)(۴)The Personalities (شخصیات)(۵)Constitutional and Legal Issues(آئینی اور قانونی مسائل) اور (۶) Current Affairs(معاملاتِ حاضرہ)۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کی پانچویں انگریزی تصنیف Encounters with Destiny(مقدر کے ساتھ محاربے) ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر جاوید اقبال کی خودنوشت آپ بیتی ''اپنا گریباں چاک'' کا انگریزی ترجمہ ہے اور مترجمین کے نام ہیں، حفیظ ملک اور ناصرہ اقبال۔ یہ دل چسپ کتاب جاوید اقبال کی زندگی کا تین پہلوؤں سے احاطہ کرتی ہے۔ اوّلاً: اپنے والد کے ساتھ ان کے تعلّقات (یعنی علامہ اقبال کے بارے میں ان کے تاثرات جو عالمی شہرت یافتہ شاعر، عارف اور خالقِ نظریۂ پاکستان تھے)، ثانیاً: ان کا قانونی اور عدالتی کردار (یعنی بطور وکیل اور بعد ازاں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جج کی حیثیت سے ان کا کیریئر) اور سیاسی اور ثقافتی سفیر پاکستان کی حیثیت سے ان کے اسفار اور سینیٹر کے طور پر ان کی خدمات۔ ثالثاً: پاکستان کے سیاسی اور عدالتی کلچر اور مختلف سول اور ملٹری حکومتوں کے بارے میں ان کے خیالات۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کی چھٹی کتاب۔ دراصل ان کی مرتبہ کتاب ہے جو Stray Reflections کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ یہ علامہ اقبال کی انگریزی میں لکھی ہوئی پرائیویٹ نوٹ بک ہے جو اسی نام سے انھوں نے ۱۹۱۰ء

میں اپنے ہاتھ سے لکھی تھی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے مرتبہ و مطبوعہ پہلے ایڈیشن میں علامہ اقبال کے ۱۲۵ شذرات جمع کیے گئے تھے۔ (اسی لیے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے Stray Reflections کا اُردو ترجمہ ''شذراتِ فکرِ اقبال'' کے نام سے میاں ساجد علی نے ''منتشر خیالات اقبال'' کے نام سے اور ڈاکٹر عبدالحق (پروفیسر دہلی یونی ورسٹی) نے ''بکھرے خیالات'' کے نام سے شائع کیا۔ اس انگریزی کتاب کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن میں Stray Thoughts کے عنوان سے ۱۱ مزید شذرات کا اضافہ کیا گیا۔ ان میں ایک شذرہ علامہ اقبال نے ۱۹۱۷ء میں اور دیگر ۱۰ شذرے ۱۹۲۵ء میں تحریر کیے تھے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے خود اپنے نام آئے ہوئے خطوط کے دو مجموعے بھی مرتب کر کے شائع کیے۔ ایک اُردو میں خطوط کا مجموعہ ہے (خطوط بنام جاوید اقبال) اور دوسرا انگریزی خطوط پر مشتمل ہے (بنام: A Collection of Preserved Letters) ''خطوط بنام جاوید اقبال'' میں ۵۳ نامور شخصیات کے ۸۸ مکاتیب ہیں اور A Collection of Preserved Letters میں جاوید اقبال کے نام ۷۳ مشہور شخصیات کے ۱۸۰ خطوط ہیں۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر اختر النساء نے ۲۰۰۸ء میں ''مکالماتِ جاوید'' کے نام سے ڈاکٹر جاوید اقبال کے ۱۱۹ انٹرویوز شائع کیے تھے اور تنویر ظہور نے ''یادیں'' کے عنوان سے ڈاکٹر جاوید اقبال کا ایک طویل انٹرویو مرتب کر کے ۱۹۹۱ء میں کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ یہ ہے وہ علمی و ادبی سرمایہ جو ڈاکٹر جاوید اقبال چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوئے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی بعض کتابوں کو خود انگریزی میں لکھا اور اُردو میں بھی۔ مثلاً Legacy of Quaid-e-Azam اور ''میراثِ قائدِاعظم'' اور Ideology of Pakistan اور ''نظریۂ پاکستان''، ''مے لالہ فام'' اور ''مقالاتِ جاوید'' کے بعض اُردو مضامین اور خطبات۔ ان کی انگریزی تصانیف: Essays of Dr. Javid Iqbal اور Intellectual legacy میں بھی موجود ہیں جنھیں خود مصنف نے ایک زبان سے دوسری زبان میں ڈھالا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی بعض اُردو تصانیف کے انگریزی تراجم اور انگریزی تصانیف کے اُردو تراجم بعض لائق مترجمین نے کیے ہیں اور وہ عام دستیاب ہیں۔ مثلاً: ''اپنا گریباں چاک'' کا انگریزی ترجمہ Encounter with Destiny (از حفیظ ملک اور ناصرہ اقبال) افکار اقبال تشریحات جاوید کا انگریزی ترجمہ Thoughts of Iqbal (از بریگیڈیئر (ر) تیمور افضل خاں) Islam and Pakistan's Identity کا ترجمہ: اسلام اور

پاکستانی تشخص (از سید قاسم محمود) ''زندہ رود'' حصہ سوم کا انگریزی ترجمہ: Iqbal in Politics (از حفیظ ملک) ''رضیہ سلطان'' (تین ابواب میں اُردو ڈرامہ) کا انگریزی ترجمہ: Stray Refections اور Razia Sultan کے تین اُردو تراجم: شذراتِ فکرِ اقبال (از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ''بکھرے خیالات'' (از ڈاکٹر عبدالحق) اور ''منتشر خیالاتِ اقبال'' (از میاں ساجد علی)۔ڈاکٹر جاوید اقبال نے ''زندہ رود'' کے ''دیباچہ'' (نقش ثانی) محررہ ۲۰ فروری ۲۰۰۸ء میں لکھا ہے کہ ''علامہ اقبال کی سوانح حیات'' زندہ رود کو جو عالم گیر پذیرائی ملی ہے اس کا نتیجہ ہے کہ یہ کتاب طبع مکرر کے مرحلوں سے بار بار گزر رہی ہے۔اس کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو رہے ہیں۔ان کی چند اقبالیاتی کتب کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

شذراتِ فکرِ اقبال

پبلشرز: مجلس ترقی ادب لاہور، اشاعت: مئی ۱۹۸۳ء، صفحات: ۱۷۲، قیمت ۱۸ روپے

خطباتِ اقبال (تسہیل و تفہیم)

ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز/اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: ۲۰۰۸ء، صفحات: ۲۳۶، قیمت: ۴۰۰ روپے

زندہ رُود (علامہ اقبال کی مکمل سوانح حیات)

پبلشرز: سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، اقبال اکادمی لاہور پاکستان، اشاعت اول: ۲۰۰۴ء

اشاعت دوم: ۲۰۰۸ء، صفحات: ۸۴۷، قیمت: ۱۵۰۰ روپے

منتشر خیالاتِ اقبال

STRAY REFLECTIONS

پبلشر: بک کارنر پرنٹرز، پبلشرز اینڈ بک سیلرز، جہلم، پاکستان، صفحات: ۱۹۲، قیمت ۶۰۰ روپے

اشاعت اوّل : نومبر ۲۰۱۵ء (علامہ اقبال سٹمپ سوسائٹی)

اشاعتِ دوم : مارچ ۲۰۱۶ء (بک کارنر جہلم)

ooo

جگن ناتھ آزاد

(۱۹۱۸ء۔۲۰۰۴ء)

جگن ناتھ آزاد ۱۹۱۸ء میں عیسیٰ خیل، میانوالی میں پروفیسر تلوک چند محروم کے ہاں پیدا ہوئے۔ جگن ناتھ آزاد ماہر اقبالیات اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے خوب شہرت پائی۔ جگن ناتھ آزاد کو ایک بڑا اعزاز یہ بھی حاصل ہے کہ انھوں نے پاکستان کا پہلا قومی ترانہ بھی لکھا۔ جو ۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے اعلان کے ساتھ ریڈیو پاکستان سے نشر ہوا۔ یہ قومی ترانہ ۱۹۵۴ء تک سرکاری و نیم سرکاری تقریبات میں استعمال ہوتا رہا۔

جگن ناتھ آزاد ۱۹۳۷ء تک اپنے والد تلوک چند محروم سے اصلاح سخن لیتے رہے۔ انھوں نے گورڈن کالج راولپنڈی سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۴۴ء میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور ایم اے فارسی کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے مولانا صلاح الدین احمد کے معروف ادبی رسالہ ''ادبی دنیا'' میں چھپنے کا آغاز کیا۔ تاجور نجیب آبادی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ ۱۹۴۶ء میں اردو روزنامہ ''جے ہند'' میں معاون مدیر کے طور پر کام کرتے رہے۔ برعظیم پاک و ہند کی تقسیم کے بعد قائداعظم محمد علی جناح کے کہنے پر انھوں نے پاکستان کے لیے قومی ترانہ لکھا، جسے منظور کر لیا گیا۔ جناح کی وفات کے بعد حکومت پاکستان نے نیا قومی ترانہ حفیظ جالندھری کا لکھا ہوا منظور کر لیا۔

ہندوستان کے کئی اخبارات و رسائل کے مدیر رہے۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۰ء تک اردو کے لیکچرار تعینات ہوئے پھر جموں یونی ورسٹی میں شعبہ اردو کے سربراہ مقرر ہوئے۔ جگن ناتھ آزاد نے ہندوستان جا کر اقبال شناسی کے حوالے سے کئی کانفرنسیں اور کئی سیمینار منعقد کروائے، جس پر ان کے

خلاف غداری کے آوازے بھی کسے گئے۔ انھیں سخت دھمکیوں سے بھی ڈرانے کی کوشش کی گئی لیکن انھوں نے اقبال سے اپنا تعلق کبھی نہیں توڑا۔ انھوں نے اقبال سے عشق کی حد تک محبت کی اور تفہیم اقبال کے سلسلے میں کئی کتب بھی لکھیں۔ ان کی کتب میں ''اقبال اور اس کے عہد''، ''اقبال اور مغربی مفکرین''، ''اقبال اور کشمیر''، ''اقبال: زندگی، شخصیت اور شاعری''، ''مرقع اقبال''، (مرتب شدہ البم)''، ''اقبال کی کہانی''، ''ہندوستان میں اقبالیات''، ''بچوں کا اقبال'' اور ''فکر اقبال کے بعض اہم پہلو (مرتبہ)'' ایسی خوب صورت اور معیاری کتابوں سے اقبالیاتی ادب میں اضافہ کیا۔ انھوں نے اردو کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی اقبالیاتی کتب لکھیں جن میں ''Iqbal poet & Philosopher''، ''Iqbal mind and Art''، ''Aesthetics in Iqbal's Poetry'' شامل ہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے مغربی دنیا کو اقبال کی عظمت اور اہمیت کے بارے آگاہ کیا۔ جگن ناتھ آزاد کئی مرتبہ مشاعروں اور سیمیناروں میں شرکت کے لیے پاکستان بھی آتے رہے۔ اپنے آبائی شہر میانوالی میں ہونے والے کل پاکستان مشاعروں میں شریک ہوئے۔

جگن ناتھ آزاد کی دیگر کتابوں میں ''نشانِ منزل''، ''آنکھیں ترستیاں ہیں''، ''پشکن کے دیس میں''، ''کولمبس کے دیس میں''، ''حیات محروم''، ''تلوک چند محروم (مرتبہ)''، ''میرے گزشتہ شب و روز''، شامل ہیں۔ ان میں ان کے سفرنامے اور خودنوشت وغیرہ ہیں۔ ان کے شعر مجموعوں میں ''طبل و علم''، ''بیکراں''، ''ستاروں سے ذروں تک''، ''وطن میں اجنبی''، ''بوئے رمیدہ''، ''جستجو''، اور ''نسیم حجاز'' شائع ہو چکی ہیں۔ حکومت پاکستان نے انھیں گولڈ میڈل سے سرفراز کیا۔ جگن ناتھ آزاد ۲۰۰۴ء میں انتقال کر گئے۔ اقبالیاتی کتب کے تذکرے درج ذیل ہیں۔

اقبال اور اُس کا عہد

پبلشرز: الادب، لاہور، اشاعت: پہلا پاکستانی ایڈیشن ۱۹۷۷ء، دوسرا ایڈیشن: ۱۹۸۹ء، صفحات ۱۳۶ روپے

اقبال اور مغربی مفکرین

پبلشرز: مکتبہ عالیہ لاہور، اشاعت: پاکستان میں اشاعت دوم ۱۹۸۷ء، صفحات: ۲۴۸، قیمت ۴۵ روپے

ooo

حامد جلالی، حافظ، سیّد

(۱۹۰۴ء۔۱۹۷۳ء)

حافظ سید حامد جلالی ۱۹۰۴ء، کو سید امیر حمزہ نقوی کے ہاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ حافظ سید حامد جلالی نے بحیثیت عالم دین، صحافی، ادیب، کارکن تحریکِ پاکستان خوب شہرت پائی۔ حافظ سید حامد جلالی نے پاکستان کو بنتے دیکھا ہے۔ انھوں نے تحریکِ پاکستان میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھوں نے ہجرت کے الم ناک واقعات کو اپنی آنکھوں نے دیکھا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ پاکستان کس طرح حاصل کیا گیا ہے۔ کتنی قربانیاں دی گئی ہیں۔

ان کی صحافیانہ زندگی پر نگاہ ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے کراچی میں مختلف رسائل کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ حافظ سید حامد جلالی بانی مدیر ''زبان ہند''، ''اذان'' اور علم وعرفان'' کراچی رہے۔ انھوں نے اشاعتِ اسلام کے سلسلہ میں بھی پور کردار کیا ہے۔ ان کی اولین کوشش رہی کہ مختلف مکتبِ ہائے فکر کے لوگ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوسکیں۔ اس مقصد کے لیے مجلس اتحاد عالم اسلامی کے صدر کی حیثیت سے ان کی کاوشوں کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انھوں فرقہ پرستی کو ختم کرنے کی کوشش کی اور سب کو متحد رہنے کا درس دیا۔ وہ دلوں سے بُغض اور کینہ کو ختم کر کے دلوں میں محبت اور انس پیدا کرنے کے حامی رہے ہیں۔ جمعیت علماء پاکستان کے سرپرست بھی رہے۔ اس حوالہ سے بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

ان کی معروف کتب میں ''تفسیر القرآن''، ''شرح صحیح بخاری''، ''علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی'' شامل ہیں۔

حافظ سید حامد جلالی کی کتاب علامہ اقبال کی ازدواجی زندگی اقبال دشمنی رکھنے والوں کے منہ پر ایک تھپڑ ہے۔ اُنھوں نے مختلف حوالوں سے اقبال کی ابتدائی زندگی، اُن کے بھائی کے خطوط اور بھائی کو لکھے گئے خطوط کا سہارا لے کر کئی اہم اُمور سے پردہ اُٹھایا ہے۔ آفتاب اقبال کا تذکرہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ آفتابِ اقبال کا مجلسِ اقبال برطانیہ میں ایک خاص خطاب بھی کتاب کی زینت ہے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان سے اُن کی خط و کتابت کے نمونے بھی کتاب میں شامل کیے ہیں۔ آفتاب اقبال اور اُن کی اہلیہ عالیہ رشید بیگم کا تعارف بھی پڑھنے کو ملتا ہے۔ آفتاب اقبال کے بچوں، آزاد اقبال، نوید اقبال اور معراج بیگم کے بھی حالات سے آگہی ہوتی ہے۔ خاندان اقبال کے خادم علی بخش کے تعارف سے بھی حافظ سید حامد جلالی نے اقبال اور اُن کے اہلِ خانہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔

جسٹس جاوید اقبال، منیرہ اقبال کے تذکرے سے اقبال کی ازدواجی زندگی کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔ پرنٹ لائن پبلشرز لاہور کی شائع شدہ یہ کتاب قابلِ مطالعہ ہے جس میں اقبال کی ازدواجی زندگی سے متعلقہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔

حافظ سید حامد جلالی نے ۳۰؍اپریل ۱۹۷۳ء کو کراچی میں رحلت فرمائی۔ انھیں لیاقت آبادسی ون ایریا کراچی میں دفن کیا گیا۔ ان کا تذکرہ ''بزرگان کراچی اور تحریکِ پاکستان اور علماء کرام میں بھی ملتا ہے۔ ان کی اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

''علامہ اقبالؒ کی ازدواجی زندگی''

پبلشرز: پرنٹ لائن پبلشرز، لاہور، اشاعت: نومبر ۱۹۹۹ء، صفحات: ۱۷۵، قیمت ۱۰۰ روپے

ooo

حسن رضوی

(۱۸/اگست ۱۹۴۶ء۔ ۱۵ فروری ۲۰۰۲ء)

قدرت بعض شخصیات کو لاتعداد خوبیوں سے سرفراز کر دیتی ہے۔ ماہر تعلیم، صحافی، شاعر، ادیب، نقاد، سفرنامہ نگار، کالم نگار، کمپیئر اور محقق کی حیثیت سے مقبول شخصیت ڈاکٹر سید حسن رضوی ایسے ہی خوش نصیب احباب میں شامل ہیں۔ سرگودھا میں منعقدہ کم از کم ۹ کل پاکستان مشاعروں کے علاوہ لاہور، میانوالی، بھلوال، پھُلروان، مری اور دیگر شہروں میں منعقدہ تقریبات کی نظامت کے دوران اُن سے ملنے کا شرف حاصل رہا۔ جناب امجد اسلام امجد، جناب عطاالحق قاسمی، جناب اصغر ندیم سید کی طرح ڈاکٹر حسن رضوی نے میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ ڈاکٹر حسن رضوی ریڈیو پاکستان کے علاوہ پرنٹ میڈیا پر ایک عرصہ چھائے رہے۔ روزنامہ ''جنگ'' کا ادبی صفحہ ان کی زیر ادارت دنیا بھر میں مقبول رہا۔

حسن رضوی ۱۸/اگست ۱۹۴۶ء کو انبالہ میں سید کوثر عباس رضوی کے ہاں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر درس و تدریس کا شعبہ اپنایا۔ وہ ایف سی کالج لاہور کے شعبہ اردو کے صدر رہے۔ انھوں نے ناصر کاظمی کے فکر وفن پر پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔ جسے ''وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ انھوں نے ریڈیو، ٹیلی ویژن کے درجنوں ادبی پروگراموں میں کمپیئرنگ کی۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام میں ''ہجر دی پہلی شام''، ''کوئی آنے والا ہے''، ''اس کی آنکھیں شام''، ''کبھی کتابوں میں پھول رکھنا''، ''خواب سہانے یاد آتے ہیں''، نعتیہ مجموعوں میں ''جمال احمد مرسل'' (۱۹۹۶ء)، ''مدینے کی ہوا'' (۲۰۰۰ء)۔ نثری کتب میں ''وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر''،

''گفت گو'' سفرناموں میں ''دیکھا ہندوستان'' (۱۹۹۲ء)، ''چینیوں کے چین میں'' (۱۹۹۳ء)، ''ہرے سمندروں کے سفر'' (۱۹۹۵ء) جب کہ مرتبہ کتب میں ''اقبال کے فکری آئینے'' شامل ہے۔ اقبالیاتی ادب میں ان کی یہ کتاب بہت پسند کی گئی۔

''اقبال کے فکری آئینے'' حسن رضوی کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں اقبال کو مختلف سمتوں سے دیکھا گیا ہے اور ہر سمت کا اپنا ایک الگ جہاں ہے۔ یعنی اقبال مختلف جہانوں، مختلف سمتوں مختلف فکری آئینوں اور مختلف علوم کا ایک بحرِ بیکراں تھے۔ اقبال کو کسی ایک آئینے میں رکھ کر پرکھا جائے یہ اقبال کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال پر بہت سا تحقیقی کام ہو رہا ہے اقبال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مختلف زاویوں سے، مختلف فاصلوں سے اور مختلف سمتوں سے اقبال کو دیکھیں، اس کو پرکھیں اور جاننے کی کوشش کریں۔ حسن رضوی نے یہ مضامین یکجا کر کے ہم سب پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے اور اقبالیات کے طالبِ علموں کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر نے کی کوشش بھی کی ہے۔ کتاب کی ایک خاص بات جو مجھے بہت اچھی لگی ہے، وہ یہ ہے کہ حسن رضوی نے ''پہلا ورق'' کے نام سے خود ہی ایک پیش لفظ لکھا ہے اور کسی سے دیباچہ، فلیپ یا پیش لفظ لکھوانے کی کوشش نہیں کی۔ کتاب اچھی ہو تو اس کو کسی قسم کی بیساکھی کی ضرورت نہیں پڑتی۔

ڈاکٹر حسن رضوی کو اعلیٰ کارگزاری پر حکومت پاکستان نے ۱۹۹۳ء میں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔ قاضی عبدالغفار عالمی اردو ایوارڈ (بھارت) بھی مل چکا ہے۔ حسن رضوی کی ایک غزل ''کبھی کتابوں میں پھول رکھنا'' ملکہ ترنم نور جہاں نے گا کر ان کو زبردست انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر حسن رضوی ۱۵ فروری ۲۰۰۲ء کو لاہور میں انتقال کر گئے انھیں فردوسیہ قبرستان فیروز پور روڈ لاہور دفن کیا گیا۔ ان کی اقبالیاتی کتاب کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

''اقبال کے فکری آئینے''

ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، اشاعت اول: ۱۹۹۰ء، صفحات: ۳۳۶، قیمت: ۹۰ روپے

OOO

حضور احمد سلیم

(۱۶راگست ۱۹۲۴ء۔۸فروری ۲۰۰۴ء)

فارسی کے ممتاز ماہر تعلیم اور سندھ یونی ورسٹی جام شورو کے شعبہ فارسی کے صدر حضور احمد سلیم کو اللہ تعالیٰ نے گونا گوں خوبیوں سے سرفراز کیا۔ وہ ۱۶ راگست ۱۹۲۴ء کو نارنول ریاست پٹیالہ میں عبدالشکور کے ہاں پیدا ہوئے اور علمی وادبی خدمات انجام دیتے ہوئے ۸فروری ۲۰۰۴ء کو حیدر آباد (سندھ) میں جام آخرت پی گئے۔ ان کی معروف کتب میں ''آموز گارِ فارسی''، ''حیات قلندر نقشبندی''، ''نسب نامہ''، ''الف خان بھٹی''، منظوم اردو تراجم ''دو بیتی نامہ بابا طاہر''، ''لذات الارواح'' (سوانح حضرت غلام نبی مجددی) منظوم ترجمہ مثنوی اور دیگر شامل ہیں۔

حضور احمد سلیم فارسی کے ساتھ ساتھ اردو، عربی اور انگریزی زبان پر بھی دسترس رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کئی فارسی کتب کو اردو قالب میں ڈھالا اور کئی عربی کتب کے اردو اور فارسی میں تراجم کیے ہیں۔ حضور احمد سلیم چوں کہ ترجمہ کے فن سے مکمل آگاہی رکھتے تھے، اس لیے ان کے تراجم تخلیق کی سطح پر ہوتے تھے۔ ان کے تراجم تخلیقی سطح کو مس کرنے لگتے تھے۔ کوئی بھی فن پارہ جب ترجمہ کیا جائے تو اسے اس انداز اور اسلوب میں ترجمہ کیا جائے کہ وہ ترجمہ نہ لگے بل کہ ایک فن پارہ محسوس ہو۔ حضور احمد سلیم نے بعض فارسی اشعار کو جب اردو میں منظوم کیا ہے تو تخلیقی سطح پر اتر آئے ہیں ان کا یہی وصف انھیں دیگر مترجم سے منفرد کرتا ہے۔ حضور احمد سلیم نے علامہ محمد اقبال کی فارسی شاعری ''پیامِ مشرق'' میں سے انتخاب کر کے اسے اردو میں منظوم ترجمہ کر دیا ہے۔ یہ اردو جاننے والوں کے لیے کسی تحفہ سے کم نہیں ہے آج ہمارے کئی نوجوان فارسی نہیں جانتے ان کے لیے یہ

انتخاب بہت سود مند ثابت ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا زیادہ تر کلام فارسی زبان میں ہے۔ ان کا فلسفیانہ فارسی کلام عام قاری کی سمجھ سے بالاتر رہا۔ لہٰذا قاری اور صاحب کلام کے مابین ایک بہت بڑی دیوار حائل تھی، اسے دُور کرنے کے لیے ممتاز شاعر و ادیب ''حضور احمد سلیم'' نے شاعر مشرق کے فارسی مجموعہ ''پیام مشرق'' سے کچھ کلام منتخب کر کے اردو زبان میں ڈھالا ہے۔ ترجمہ کر لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ شاعر کے مافی الضمیر کی وضاحت کرنا بہت مشکل ہے۔ اگر مترجم اس بات کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کرے گا تو اس کا معیار برقرار رہتا ہے، ورنہ صرف الفاظ کو ایک زبان سے دوسری زبان میں بدل دینے کا نام ترجمہ نہیں ہے۔ حضور احمد سلیم! نے فارسی سے اردو میں جو منظوم ترجمہ کیا ہے، وہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ترجمے کے ساتھ ساتھ فن شاعری میں فرق پڑنے نہیں دیا۔ انھوں نے کلامِ منظوم کا ترجمہ بھی کلام منظوم ہی میں کیا ہے تا کہ قاری کی شعری چاشنی میں چنداں فرق نہ آنے پائے۔ کلامِ اقبال کے اس منظوم ترجمہ کا فائدہ اقبالیات کے ان شائقین کو بہت زیادہ ہوگا جو فارسی زبان سے نابلد ہیں۔

اس ضمن میں حضور احمد سلیم کی کاوش قابل ستائش اور قابل تقلید ہے۔

افکار انجم

شنیدم کو کبے با کو کبے گفت
کہ در بحریم و پیدا ساحلے نیست
سفر اندر سرشت ما نہادند
ولے ایں کارواں را منزلے نیست

افکار انجم

سنی میں نے جو تاروں میں چلی بات
کہ اپنی بحر کا ساحل نہیں ہے
سفر اپنا مقدر ، اپنی فطرت
نصیبِ کارواں منزل نہیں ہے

ان کی اس کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

''انتخاب : پیام مشرق''

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: ۱۹۷۷ء، قیمت: ۳۰ روپے

حق نواز، پروفیسر
(۱۹۳۴ء۔۴جولائی۲۰۰۴ء)

پروفیسر حق نواز گونا گوں خوبیوں کے حامل تھے۔ وہ اردو اور پنجابی کے ادیب، ڈرامہ نگار، ماہرِ اقبالیات، محقق، ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے آج بھی زندہ و جاوید ہیں۔ پروفیسر حق نواز ۱۹۳۴ء کلانور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ایم این خان تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد درس و تدریس کے شعبہ میں آئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھاتے رہے۔ ان کا دورانیہ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۴ء ہے۔ اس دوران وہ صدر ڈرامیٹک کلب گورنمنٹ کالج لاہور بھی رہے۔ ان کی معروف کتب میں ''سیاحتِ اقبال''، ''اقبال ایوان اسمبلی میں''، ''اقبال اور لذت پیکار''، ''راوی ڈرامے''، ''اردو ادب بیسویں صدی میں'' اور ''تماشا گر'' شامل ہیں۔ اقبالیاتی ادب میں ان کی تین کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔ پروفیسر حق نواز ۴ جولائی ۲۰۰۴ء کو رحلت فرما گئے۔ آج حق نواز ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن پھر بھی اقبالیاتی ادب کے حوالے موضوع بحث ہیں یہی ان کی عظمت کا اعتراف ہے۔ انھوں نے اقبال شناسی کا حق ادا کرتے ہوئے ہمیں قیمتی خزینہ سے نوازا۔ ان کی حق نوازی ہے کہ فکرِ اقبال کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کرنے والے اس سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ ماہرِ تعلیم حق نواز نے علامہ اقبال پر اعتراضات کے جوابات پر مبنی کتاب ''اقبال اور لذت پیکار'' لکھ کر محبانِ اقبال پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ان کے لیے ان اعتراضات کے خلاف علامہ کا دفاع کرنا آسان ہو گیا ہے۔ جناب حق نواز نے اقبال نوازی حق ادا کر دیا ہے۔ اس کتاب کا حوالہ درج ہے۔

''اقبال اور لذت پیکار''

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان لاہور، اشاعت: نومبر ۱۹۸۴ء، صفحات: ۲۲۲، قیمت: ۱۰۰ روپے

حمید احمد خاں، پروفیسر

(یکم نومبر ۱۹۰۳ء۔ ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء)

استاد ہونا بڑے فخر کی بات ہے۔ وہ اساتذہ کرام مقبولیت کی منازل طے کرتے ہیں جو کمرۂ جماعت کو نصابی کتب کے علاوہ علمی و ادبی سرگرمیوں سے مزین کرتے رہیں۔ ایسے احباب میں پروفیسر حمید احمد خاں سرفہرست ہیں۔ وہ باعمل استاد تھے۔ تحقیق وجستجو ان کا مشن رہا۔ تاریخی، ادبی اور مذہبی کتب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ پروفیسر حمید احمد خاں یکم نومبر ۱۹۰۳ء لاہور میں مولوی سراج الدین احمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ پروفیسر حمید احمد خاں، بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد درس وتدریس کے شعبہ میں آئے۔ حمید احمد خاں ممتاز ماہر تعلیم، اردو ادیب، محقق، نقاد، انگریزی ادب کے استاد کی حیثیت خاصی شہرت پائی۔

حمید احمد خاں سابق صدر شعبہ انگریزی اسلامیہ کالج لاہور رہے۔ پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور (۶۳۔۱۹۵۸ء) وائس چانسلر جامعہ پنجاب (۶۹۔۱۹۶۳ء) چیئر مین مرکزی اردو بورڈ (۱۹۶۹ء) ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب (۷۴۔۱۹۷۰ء) اور ادارہ ثقافت اسلامیہ سے بھی وابستہ رہے۔ حمید احمد خاں جس ادارے میں بھی تعینات ہوئے، ہمیشہ محنت شاقہ سے کام لیتے رہے۔

ان کی معروف کتب میں ''اقبال کی شخصیت اور شاعری''، ''اسوۂ حسنہ''، ''سیرت ختمی نبوت'' ''ترتیب دیوان غالب نسخہ حمیدیہ''، ''ارمغان حالی'' شامل ہیں۔

ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے انھیں ''ستارۂ امتیاز اور ستارہ پاکستان سے نوازا۔ حمید احمد خاں ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء کو لاہور میں وفات پاگئے۔ انھیں ڈی بلاک،

گلبرگ لاہور میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

اقبال کی شخصیت اور شاعری کے پہلے حصے میں علامہ اقبال کی شخصیت پر اس طرح گفت گو کی گئی ہے کہ اقبال کی شخصیت کا ہر پہلو ہماری نظروں کے سامنے عیاں ہو جاتا ہے۔ ان کا انداز گفت گو ،نشست و برخاست، چال ڈھال اور شخصیت کا ظاہری تاثر غرض ہر طرح سے اقبال ایک زندہ و جاوید انسان بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں اور ہم ان کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ دوسرا حصہ ''شاعری'' ہے جس میں علامہ کی شاعری کے فکری و فنی عناصر کے ساتھ ساتھ علامہ کی شاعری پر انگریز شعراء کے کلام کے اثرات کی جھلک ملتی ہے۔ بیدل فارسی شاعری کا اہم حوالہ ہے۔ اسی حصہ میں اقبال نے بیدل سے جو اثرات قبول کیے، ان کا ذکر بھی نظر آتا ہے۔ تقابلی شاعری کے حوالے سے شاعری کا حصہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں ہم علامہ اقبال کے علاوہ کئی دیگر شعراء کرام سے بھی ملتے ہیں۔

ان کی اقبالیاتی کتاب کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

اقبال کی شخصیت اور شاعری مجموعۂ مقالات

پبلشرز: ،بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور، اشاعت اکتوبر ۱۹۷۴ء، صفحات ۱۹۴، قیمت ۱۰ روپے

ooo

خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر

(۱۸۹۳ء-۱۹۵۹ء)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم یکم جولائی ۱۸۹۳ء کو اکبری دروازہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم فلسفی، محقق، ماہر اقبالیات، مصنف اور مترجم کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے ابتدائی تعلیم لاہور میں ہی حاصل کی۔ سینٹ سٹیفن کالج دہلی سے ایم اے فلسفہ اور ہائیڈ لبرگ یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر تعینات ہوئے۔ حصولِ تعلیم کے بعد چیئر مین شعبہ فلسفہ عثمانیہ یونی ورسٹی (۴۳-۱۹۲۵ء)، پرنسپل امر سنگھ کالج سری نگر کشمیر (۴۷-۱۹۴۳ء)۔ڈین آف آرٹس عثمانیہ یونی ورسٹی (۴۹-۱۹۴۷ء)۔ بانی ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور (۱۹۵۰ء)

ان کی کتب میں ''فکرِ اقبال، حکمت رومی، افکار غالب، مقالات حکیم (مرتبہ شاہد حسین رزاقی)، اقبال اور ملا۔''Fundamental Human Rights'' ''Islamic Ideology'' اور ''داستان دانش'' شامل ہیں۔

''فکرِ اقبال'' ان کی اقبال کے حوالے سے انتہائی اہم کتاب ہے۔خلیفہ عبدالحکیم کا شمار ماہرینِ اقبالیات میں ہوتا ہے۔''فکرِ اقبال'' جس تسلسل میں لکھی گئی ہے وہ ان کی علامہ اقبال سے دلی وابستگی اور کلام اقبال سے عشق کا اظہار نظر آتی ہے۔ کتاب میں شامل مواد کے موضوعات نہایت جامع اور مدلل ہیں۔شاعری کے ادوار کا انتخاب قابلِ ستائش ہے

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء کو کراچی میں انتقال کر گئے جب کہ ان کی تدفین

میانی صاحب قبرستان لاہور میں ہوئی۔

فکرِ اقبالؒ

پبلشرز: بزمِ اقبال ۲۔کلب روڈ لاہور، اشاعت جون ۱۹۸۸ء، صفحات ۷۳۹، قیمت: ۱۰۰ روپے

تلخیص خطباتِ اقبال

پبلشرز: ڈاکٹر وحید قریشی، بزم اقبال کلب روڈ لاہور۔ جون ۱۹۸۸ء، بک کارنر شوروم جہلم، ۲۳ مارچ ۲۰۱۴ء۔ صفحات ۱۴۷۔ قیمت ۴۵ روپے

ooo

داؤد عسکر

(۱۹۱۲ء)

نامور محقق اور اقبال شناس داؤد عسکر ۱۹۱۲ء میں نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سرکاری ملازم تھے۔ داؤد عسکر کا تعلق فوج سے رہا ہے۔ وہ سپرنٹنڈنگ انجینئر ریٹائرڈ ہوئے۔ علامہ اقبال سے ان کی محبت کا آغاز اوائل عمری سے ہو گیا تھا۔ ان کا تعلق نوشہرہ سے ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''جوئے شیر'' کے صفحہ نمبر ۷ا پر لکھا ہے:

''علامہ اقبال کے کلام سے شیفتگی مجھے تقریباً لڑکپن سے ہی تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ ڈاکٹر اقبال کا نام ۱۹۲۰ء میں سنا تھا جب کہ میری عمر کوئی آٹھ نو برس کی ہوگی۔ میں اس زمانے میں مدرسہ تعلیم القرآن نوشہرہ میں پڑھا کرتا تھا۔ اس مدرسہ کی پرائمری جماعتوں کا اہتمام ان دنوں اسلامیہ کلب کے قریب دریا کے کنارے ایک مسجد میں تھا، اور اسی کلب کے چمن زاروں میں اس سال انجمن حمایت الاسلام کا سالانہ جلسہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہونے والا تھا، جس کے لیے جی ٹی روڈ سے لے کر کلب تک کی سڑکیں نہایت خوب صورتی کے ساتھ سجائی گئیں، جھاڑ فانوس لٹکائے گئے اور دروازے بنائے گئے اور تین کے لیے خورد و نوش کا نہایت اعلیٰ انتظام کیا گیا۔ میں نے والد صاحب سے ذکر کیا کہ ہمارے اسکول میں ایک بہت بھاری جلسہ ہونے والا ہے۔ آپ اس میں شریک ہوں گے؟ کہنے لگے اگر ڈاکٹر اقبال کے آنے کا پروگرام ہوا تو ضرور آؤں گا۔ خیر، ڈاکٹر اقبال تو نہ آئے لیکن یہ نام میرے دل میں کھٹک سا گیا۔ کچھ عرصہ بعد والد صاحب کا تبادلہ چترال ہو گیا اور میں ۱۹۲۷ء میں میٹرک کے امتحان سے فارغ ہو کر چھٹیاں گذارنے چترال چلا

گیا۔ چترال ان دنوں پشاور سے آٹھ دنوں کی گھوڑوں کی مسافت تھی۔ میں نے والد صاحب کے سرہانے میز پر ایک نہایت خوش نما چرمی جلد میں کتاب دیکھی جس پر سنہری حروف میں ''بانگِ درا'' لکھا تھا اور نیچے اقبال۔ میں نے کتاب اٹھائی اور ورقے الٹنے پلٹنے لگا، تو نظر ایک صفحے پر جا ٹکی۔ لکھا تھا:

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا، محمل ہے بے لیلیٰ ترا
آئے دُرِ تابندہ! آئے پروردہ آغوش موج
لذت طوفاں سے ہے ناآشنا دریا ترا

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال اور اقبال شناسی کے حوالے سے انھوں مزید لکھا ہے:

''چترال سے واپس آنے لگا تو میں نے والد صاحب سے بسماجت تمام بانگ درا کی درخواست کی۔ انھوں نے میری طرف غور سے دیکھا، پھر کہا لے جاؤ۔ ۱۹۳۲ء میں جب میں انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہوا، تو یہ کتاب میرے ساتھ تھی اور میں نے اس کا مطالعہ جاری رکھا، ہر بار پڑھنے سے نیا لطف آتا اور رگوں میں حرارت دوڑنے لگتی۔ کبھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے اور کبھی آنکھیں بھیگ جاتیں۔

اپریل ۱۹۳۸ء کی ایک صبح میں گلاسکو میں اپنے فلیٹ کی بالکنی میں کھڑا کسی خیال میں محو تھا کہ ناگاہ میرا ایک دوست بھاگتا ہوا آیا اور کہا، تمہارے ہاں کوئی سر محمدؐ اکیال بڑا شاعر گزرا ہے۔ میں نے کہا! کہنے لگا وہ کل وفات پا گیا ہے۔ یہ دیکھو اخبار۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا۔ میں دل تھام کر بیٹھ گیا۔ میرے دوست نے پوچھا کیا وہ تمہارا رشتہ دار تھا؟ میں نے کہا خون کا رشتہ تو نہ تھا۔ ہاں محبت کا رشتہ ضرور تھا اور میری یہ حسرت کہ میں ہندوستان پہنچ کر پہلے آستانہ اقبال پر حاضر ہوں گا، پوری نہ ہو سکی۔

ہندوستان پہنچ کر معلوم ہوا کہ علامہ اقبال کی کئی اور کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ میں نے اردو فارسی کی سب کتابوں کے سیٹ خرید لیے اور یہ کتابیں میری زندگی کا سرمایہ حیات بن گئیں۔ مزید برآں، اقبال پر کسی نے کوئی کتاب لکھی تو میں نے جھٹ خرید لی اور اس طرح اقبالیات پر میرے پاس ایک خاصا وقیع ذخیرہ جمع ہو گیا۔'' جب داؤد عسکر نے اپنی تحقیق کتاب مکمل کی تو اپنے

حتمی جملوں کا اختتام اپنے اس تعارف سے کیا۔

''احقر داؤد عسکر، سپر نٹنڈنگ انجینئر (ریٹائرڈ) عقب خطوط المدنی حیدر آباد چھاؤنی (سندھ) مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۷۸ء۔'' ان کی تحقیق کتاب ''جوئے شیر'' کا حوالہ پیش خدمت ہے۔

جوئے شِیر

پبلشر: رشید اینڈ سنز اردو بازار کراچی، اشاعت: فروری ۱۹۷۹ء، صفحات: ۶۳۲، قیمت: ۷۵ روپے

ooo

رحیم بخش شاہین، ڈاکٹر

(۱۴؍جولائی ۱۹۴۲ء۔ ۱۸؍جولائی ۱۹۹۸ء)

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے وہ شاعر، استاد، محقق، مترجم و مبصر اور ماہر اقبالیات کے حوالے خاصی شہرت رکھتے تھے۔ رحیم بخش شاہین، تاج الدین کے ہاں ۱۴؍جولائی ۱۹۴۲ء کو جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر شاہین نے دسویں جماعت سے شعر و سخن کا آغاز کر دیا تھا اور شاہین تخلص رکھا جو کہ علامہ محمد اقبال سے والہانہ محبت و عقیدت کا اظہار ہے۔ علامہ اقبال کے افکار و نظریات رحیم بخش شاہین کی شاعری میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ رحیم بخش شاہین نے ''مکاتیب اقبال پر سندھ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ صدر شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد (۱۳۔ دسمبر ۱۹۹۴ء تا وفات)۔ راولپنڈی، اسلام آباد کے مختلف تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے۔ ایم فل اقبالیات کے دوران پروفیسر ڈاکٹر رحیم بخش شاہین راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) کے ٹیوٹر رہے۔ وہ سنجیدہ متین اور تحقیق کے میدان میں بہت دیانت دار تھے۔ تحقیق و جستجو ہی ان کی زندگی کا نصب العین رہا۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض اور پروفیسر ڈاکٹر رحیم بخش شاہین نے شعبہ اقبالیات علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کو حقیقی معنوں میں تحقیقی مرکز بنایا۔ ''اوراق گم گشتہ'' کے دو ابواب ''میرا اقبال'' اور'' علامہ اقبال اور غلام جیلانی برق'' نہایت دل چسپ اور قابل توجہ ہیں۔ جن سے اقبال کی زندگی اور شخصیت کے بہت سے ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جو اب تک نظروں سے اوجھل تھے۔

رحیم بخش شاہین نے بڑی محنت و جستجو سے ان بکھرے ستاروں کو یک جا کر کے آسمان

اقبالیات کی زینت بنایا ہے اس کتاب کے مطالعے کے بعد رحیم بخش شاہین پر یہ شعر صادق آتا ہے:

یوں لائے واں سے ہم دل صد پارہ ڈھونڈ کر
دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا ، اُٹھا لیا

معروف کتب یہ ہیں:

''اوراق گم گشتہ'' (۱۹۷۵ء)، ''نقوشِ قائداعظم (۱۹۷۶ء)، Mementos of Iqbal (۱۹۷۶ء)، ''اقبال کے معاشی نظریات'' (۱۹۷۶ء)، ''ارمغان اقبال'' (۱۹۹۱ء) ایک شعری مجموعہ ''شہرِ جمال'' (مرتبہ محمد وسیم انجم۔۲۰۰۱ء)

میری طرح متعدد تشنگانِ علم نے ان سے فیض حاصل کیا۔ وہ نہ صرف میرے ٹیوٹر تھے بل کہ انٹرویو پینل میں بھی شامل تھے۔ ''ارمغانِ اقبال'' پروفیسر رحیم بخش شاہین کے ایسے مقالات کا مجموعہ ہے جو کہ ملک کے مختلف علمی مجلوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ مقالات ان کے علم و دانش اور قوت تحریر کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ کتاب اقبال کی سوانح، شخصیت اور دوسری اہم معلومات پر مبنی 10 مقالات کا مجموعہ ہے، جو بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

رحیم بخش شاہین ۱۸ر جولائی ۱۹۹۸ء کو اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔ راولپنڈی میں تدفین ہوئی۔ رحیم بخش شاہین کے فکر و فن پر بھی کام کا آغاز ہو گیا ہے۔ ایک تحقیقی مقالہ ''ڈاکٹر رحیم بخش شاہین بطور اقبال شناس'' نذیرہ بیگم نے ڈاکٹر صدیق شبلی کی نگرانی میں لکھا ہے۔ عادل عباس نقوی نے ایم فل کی سطح کا تحقیقی مقالہ بعنوان ''رحیم بخش شاہین شخصیت و فن'' ناردرن یونی ورسٹی سے ڈاکٹر سید اشفاق حسین بخاری کی نگرانی میں مکمل کر کے ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ ان پر مزید کام کی ضرورت ہے۔ ان کی اقبالیاتی کتب کے حوالے درج ذیل ہیں۔

اوراقِ گم گشتہ

اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور پاکستان، اشاعت: اپریل ۱۹۷۵ء، صفحات ۴۶۸، قیمت ۲۸ روپے

ارمغانِ اقبال

اسلامک پبلی کیشنز: شاہ عالم مارکیٹ لاہور، اشاعت نومبر ۱۹۹۱ء، صفحات ۳۳۹، قیمت ۲۶ روپے

ooo

رشید احمد صدیقی

(۱۸۹۶ء۔۱۹۷۷ء)

پروفیسر رشید احمد صدیقی ۲۴ دسمبر ۱۸۹۶ء کو ضلع جونپور (یوپی) کے ایک گاؤں مڑیا میں پیدا ہوئے۔ وکی پیڈیا پر ۲۴ دسمبر ۱۸۹۲ء تاریخ پیدائش درج ہے۔ میٹرک تک جونپور میں رہے۔ پھر مزید تعلیم کی غرض سے علی گڑھ چلے آئے۔ یہاں ۱۹۱۵ء میں کالج میں داخلہ لیا۔ مالی حالات اچھے نہیں تھے لہٰذا کچہری میں ملازم ہوئے مگر ملازمت کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی۔ علی گڑھ یونی ورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا۔ طالبِ علمی کے زمانے ہی سے اُنھیں مضمون نگاری کا شوق تھا۔ وہ کالج میگزین کے ایڈیٹر رہے اور اس میں مضمون لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں وہ علی گڑھ کالج میں اردو کے لیکچرار مقرر ہوئے اور اس سے اگلے برس یعنی ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ یونی ورسٹی میں اُردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ اردو تعینات ہوئے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی علی گڑھ یونی ورسٹی میں تاریخ ادبیات اردو کی تالیف و تدوین کے سلسلے میں بطور ڈائریکٹر اس کام کی نگرانی بھی کرتے رہے۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی باقی زندگی علی گڑھ ہی میں بسر کی۔ اُن کی تحریریں علی گڑھ سے اُن کی دلی وابستگی کا اظہار ہیں۔ ایک عرصہ تک اُن کی تحریروں کا مقصد تحریک علی گڑھ کا فروغ رہا۔ یہی نہیں بل کہ ان تحریروں کا زیادہ تر محور علی گڑھ کا ماحول، فضا اور اس کی تہذیبی اور ثقافتی روایات ہیں۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ علی گڑھ اُن کی ذات میں آیا، اور خود علی گڑھ کی بھی یہ خوش نصیبی تھی کہ اس میں رشید احمد صدیقی آباد تھے، تو یہ غلط نہ ہوگا۔ رشید احمد صدیقی ۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء کو علی گڑھ میں انتقال کر گئے اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔

ان کی معروف کتب ہیں۔گنج ہائے گراں مایہ، خنداں، طنزیات و مضحکات، مضامین رشید اور ہم نفسان رفتہ شامل ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی جدید اردو نثر کے ممتاز طنز نگار ہیں۔انھیں وہ سب خوبیاں حاصل تھیں جو ایک کامیاب طنز نگار کے لیے ضروری ہوتی ہے۔یہ خوبیاں درج ذیل ہیں۔

رشید احمد صدیقی کی بڑی خوبی ان کے اسلوب کی وہ لطافت ہے جو ان کی گہری طنز کو بھی اس درجہ خوش گوار بنا دیتی ہے کہ اس سے استہزائی قہقہہ جنم لینے کے بجائے تبسم زیر لب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔اس طرح وہ پست سے پست بات کو بھی ایسے خوش نما اور لطیف الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ اس کی سطح پست سے بلند ہو جاتی ہے۔مثلاً یہ جملے دیکھیے کہ ان میں کس لطافت کے ساتھ طنز کی گئی ہے۔

''میرے نزدیک مارواڑی عورتیں مجموعہ ہیں دو چیزوں کا گھونگٹ اور گندگی''

''ہندوستان میں جوانی کا عالم دو طریقوں پر ہوتا ہے اکثر شفا خانے میں، ورنہ جیل میں''

رشید احمد صدیقی مختلف اشیاء کا مشاہدہ تو اپنی ظاہری آنکھ سے مگر اپنے آس پاس پھیلے انسانوں کا مشاہدہ ایک فلسفی کی آنکھ سے کرتے ہیں۔پہلی صورت میں ان کے یہاں ایک مانوس سی ظاہری طنز اور دوسری صورت ہیں ایک گہری اور منفرد طنز پیدا ہوتی ہے۔رشید احمد صدیقی کے مشاہدے کی دوسری صورت کو ڈاکٹر وزیر آغا نے فلسفیانہ عمل سے تعبیر کیا۔

طنز میں یہ فلسفیانہ کھیل رشید احمد صدیقی کا ایک مضبوط حربہ ہے اور اس کی ایک خوب صورت مثال ان کا مضمون ''الیکشن'' ہے۔رشید احمد صدیقی کی طنز کی ایک اور نمایاں خصوصیت ان کے اسلوب کا خطیبانہ انداز ہے۔وہ اپنے اکثر مضامین میں اپنی ہر بات کو آپ کے لفظ سے شروع کرتے ہیں اور پھر خود کو اور اپنے مخاطب کو نشانۂ تمسخر بناتے چلے جاتے ہیں۔اس کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ رشید احمد صدیقی نے اپنے زیادہ تر مضمون ریڈیو کے لیے لکھے تھے اور چوں کہ ایسے مضامین کی صورت سامعین سے گفت گو کی سی ہوتی ہے لہٰذا ان میں از خود خطابت کا رنگ پیدا ہونا فطری امر تھا۔

رشید احمد صدیقی کے موضوعات میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے، اس میں طنز و ظرافت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور تلاش کر لیا ہے۔یہاں تک کہ ان کے شخصی خاکوں میں بھی سنجیدگی کے نیچے ان کی فطری طنز و ظرافت، ایک برقی رو کی طرح کہیں واضح اور

کہیں مدھم، ہر حال میں موجود ہوتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے چار پائی، وکیل، ریل کا سفر اور گواہ سے لے کر اُڑ ہر کے کھیت اور دیہاتی ڈاکٹر تک کے موضوع پر بڑے خوب صورت طنزیہ مضامین لکھے ہیں۔ موضوعات کی یہ رنگارنگی بہت کم طنز نگاروں کے ہاں نظر آتی ہے۔

رشید احمد صدیقی اپنے طنزیہ مضامین کے لیے علی گڑھ کی تہذیبی اور ثقافتی روایات سے مواد حاصل کرتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کے نزدیک رشید احمد صدیقی ایک بڑی خوبی ہے، جو علی گڑھ کے یا تو باسی ہیں یا اس کے جاننے والے ہے۔ اس طرح رشید احمد صدیقی کے مقامی استعاروں، اشاروں اور علامتوں کی بھی وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، جو علی گڑھ کے رہنے والے ہوں اس صورتِ حال نے ان کی طنز کا دائرہ بڑی حد تک محدود کر دیا ہے پھر چوں کہ رشید احمد صدیقی نے جن مقامی واقعات کی طرف اپنے مضامین میں اشارے کیے ہیں، وہ بھی ہنگامی نوعیت کے تھے۔ اس وجہ سے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی جاذبیت میں کمی پیدا ہونا بھی فطری امر ہے۔

رشید احمد صدیقی کا منفرد اسلوب ہے۔ وہ رعایتِ لفظی سے کام لیتے ہیں اور عربی و فارسی الفاظ و تراکیب سے اپنے اسلوب میں رعنائی پیدا کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ان سے رشید احمد صدیقی کی عبارت پر تکلف اور مصنوعی بھی ہو جاتی ہے مگر عام طور پر اس میں روانی، شگفتگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے بیان کو برمحل اشعار، لطائف اور تلمیحات سے بھی بانکپن عطا کرتے ہیں۔ ان کی اقبال کے حوالے سے کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال، شخصیت اور شاعری

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان لاہور، اشاعت: ۱۹۷۶ء، صفحات: ۱۴۳، قیمت: ۲۰ روپے

ooo

محمد رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر

(۲ جنوری ۱۹۰۸ء۔۲ جنوری ۱۹۹۸ء)

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ۲ جنوری ۱۹۰۸ء حیدر آباد دکن میں مظفّر الدین کے ہاں پیدا ہوئے۔ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نام ور سائنسدان، معلّم، دانش ور، ماہر اقبالیات اور ریاضی دان تھے۔ پشاور یونی ورسٹی، سندھ یونی ورسٹی و قائداعظم یونی ورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔جب کہ بانی چیئرمین پاکستان سائنس اکیڈمی رہے۔اردو انگریزی میں سائنس اور ادب پر کئی کتب کے مصنف رہے۔ ''اقبال کا تصوّرِ زمان ومکاں''،'' کلام اقبال میں موت وحیات''، ''تعلیم کا مسئلہ'' مقبول ہیں۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کا تعلق بھی اسی دور سے ہے جب علامہ کی شہرت کا ڈنکا مشرق و مغرب میں بج رہا تھا۔ یہ اقبال کا زمانۂ طالبِ علمی تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اقبال کو ایک ملی شاعر کی حیثیت حاصل ہوگئی۔اس لیے ڈاکٹر رضی الدین کو علامہ اقبال سے متعلق مضامین لکھنے اور تقاریر کرنے کا موقع ملا۔ڈاکٹر صاحب کی علم وادب اور شعر وشاعری میں دل چسپی کے باعث یہ شوق بڑھا اور زمانۂ طالبِ علمی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

علامہ اقبال کی وفات کے بعد تو انھیں مختلف انجمنوں کی طرف سے فکر اقبال پر مقالات پڑھنے کا موقع ملا۔ وہ ان تمام کو اگرچہ محفوظ نہ کر سکے لیکن ان میں سے جتنے مضامین بھی دستیاب ہو سکے، اقبال کے صد سالہ جشن (۱۹۷۷ء) کے موقع پر انھوں نے کتابی صورت میں پیش کردیے یہ کتاب ''اقبال کا تصوّرِ زمان ومکان اور دوسرے مضامین'' 9 مقالات پر مشتمل ہے۔آخری دو مقالات انگریزی میں جب کہ سات مقالات اُردو میں ہیں۔

’’علامہ اقبال کا تصورِ زمان ومکاں‘‘ اہم ترین موضوع ہے۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے اس موضوع کو بڑی خوب صورتی سے نبھایا ہے۔ موضوع کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر انھوں نے کتاب کا نام بھی اسی سے منسوب کیا ہے۔ زمان ومکاں کا تصور مختلف مفکّرین کے ہاں مختلف ہے۔

قرونِ اولیٰ، قرونِ وسطیٰ، یورپ، عرب، یونان اور دیگر مفکّرین کے ساتھ اقبال کا تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ مختلف سائنس دانوں کے زاویۂ نظر کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے ’’نشان پاکستان‘‘، ’’ہلال پاکستان‘‘ سے سرفراز کیا۔ ۲ جنوری ۱۹۹۸ء کو اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔ انھیں مرکزی قبرستان اسلام آباد میں دفن کر دیا گیا۔

ان کی اقبالیاتی کتاب کا حوالہ پیش خدمت ہے۔

اقبال کا تصوّرِ زمان و مکان اور دوسرے مضامین

پبلشرز: مجلس ترقی ادب لاہور، سن اشاعت: دسمبر ۱۹۷۳ء، صفحات: ۲۵۳، قیمت: ۱۲ روپے

○○○

رئیس احمد جعفری (ندوی)

(۱۸ نومبر ۱۹۰۸ء۔ ۲۷ راکتوبر ۱۹۶۸ء)

سید رئیس احمد جعفری ۱۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو لکھیم پوری (وطن سیتا پور) میں سید ناظر حسین جعفری کے ہاں پیدا ہوئے۔ سید رئیس احمد جعفری ممتاز صحافی، شاعر، ادیب، ناول نگار، افسانہ نگار، مؤرخ، مترجم کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ روزنامہ خلافت بمبئی کے مدیر اعلیٰ بھی رہے۔ اس کے علاوہ نائب مدیر ''زمیندار'' لاہور بھی کام کرتے رہے۔ تاریخ وسوانح پر درجنوں کتب کے مصنف و مؤلف ہیں۔ ان کی معروف کتب میں ''سیرت محمد علی''، علی برادران''، ''شاہجہاں''، ''اوراق گم گشتہ''، ''دید وشنید''، غدر دہلی''، ''حیاتِ قائداعظم''، ''خطباتِ قائداعظم''، ''اقبال اور عشقِ رسول ﷺ''، اقبال اور سیاست ملی''، ''اقبال اپنے آئینے میں'' شامل ہیں۔ تاہم ان کی کتاب ''اقبال اور سیاست ملی'' نے انھیں شہرت کی سیڑھیوں پر چڑھایا۔ ان کی اس کاوش کو اقبالیاتی ادب میں ایک بڑا مقام حاصل ہوا۔

رئیس احمد جعفری نے ''اقبال اور سیاست ملی'' کی ترتیب وتدوین کے لیے خطوط، مقالات اور شاعری سے استفادہ کیا ہے۔ ''اقبال اور سیاست ملی'' میں علامہ کے افکار کا احاطہ کیا گیا ہے۔ جس میں علامہ محمد اقبال ایک مفکر، سیاست دان اور سچے مسلمان کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں 6 ابواب ہیں۔ حصہ دوم خطابات، تقاریر، بیانات پر مشتمل ہے دوسرے حصے میں بھی چھ ابواب ہیں جب کہ حصہ سوم میں علامہ کی شاعری کے ذریعے ان کے افکار کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تیسرا باب بھی 6 ابواب پر مشتمل ہے کتاب کے پہلے حصہ کا پہلا باب

''اپنا بیان اپنی زبان'' نہایت اہمیت کا حامل ہے جس میں علامہ پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب ان کے مکاتیب کے ذریعے دیا گیا ہے تیسرے باب ''ملتِ اسلامیہ اور اس کا مشن'' میں علامہ کے خطوط کے ذریعے ملت اسلامیہ کے بارے میں ان کے خیالات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ہر باب کا آغاز علامہ کے اشعار سے کیا گیا ہے۔ یہ کتاب علامہ کے افکار کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوئی ہے۔ کتاب کا آخری حصہ ''شاعری'' نہایت دل چسپ ہے جس میں علامہ کے تصور وطنیت اور تصوّرِ ملت کو ان کے ادوار کے لحاظ سے شاعری کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ ایک مصرع لے کر اس کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر کتاب نہایت دل چسپ اور علمی خزانے سے لبریز ہے۔

علامہ محمد اقبال کے حوالے سے ان کی کتب ''اقبال اور عشقِ رسول ﷺ''، ''اقبال اور سیاست ملی''، ''اقبال اپنے آئینے میں'' نے اقبالیاتی ادب میں انھیں خاصی پذیرائی عطا کی۔ علمی و ادبی حلقوں میں رئیس احمد جعفری کا نام خاصا مقبول ہے۔ وہ اپنے تحقیق و تنقیدی کام کی وجہ سے محققین میں بھی ایک خاص مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ رئیس احمد جعفری ۲۷ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو لاہور وفات پا گئے۔ انھیں سوسائٹی قبرستان کراچی میں دفن کیا گیا۔

ان کی اقبال کے حوالے سے کتاب کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

اقبال اور سیاست ملی

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان لاہور، اشاعت اول ۱۹۵۷ء، اشاعت دوم ۱۹۸۱ء، صفحات ۴۹۹
قیمت ۳۴ روپے

ooo

سراج الدین، پروفیسر، سیّد

(۳۰ جنوری ۱۹۲۴ء۔ ۱۵ جولائی ۲۰۰۶ء)

پروفیسر سید سراج الدین کا شمار حیدر آباد کا شمار حیدر آباد کے ممتاز دانش وروں اور ادبی شخصیات میں ہوتا تھا۔ انھوں نے ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی خوب شہرت پائی۔ اساتذہ اور بزرگوں کی تعلیم و تربیت نے انھیں کندن بنا دیا تھا۔ وہ ہر فن مولا بن گئے تھے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی علم کے خزانے لٹا رہی تھی۔ برعظیم پاک و ہند سے علم کی پیاس بجھانے والوں کا رخ حیدر آباد کی طرف ہوتا۔ کئی نامور ادباء و شعراء نے اسی یونی ورسٹی سے اکتساب فیض کیا ہے۔ پروفیسر سید سراج الدین نے بھی اسی یونی ورسٹی سے ۱۹۶۴ء میں انگریزی ادب میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ اسی یونی ورسٹی میں ہی بحیثیت انگریزی استاد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۵۶ء میں پروفیسر کے عہدے پر تعینات تھے کہ ریٹائرڈ منٹ لے لی۔ جولائی تا اکتوبر ۸۵ء کشمیر یونی ورسٹی سرنگر کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں وزٹنگ پروفیسر تعینات ہوئے۔ بین الاقوامی مقبولیت کا حامل انگریزی رسالہ ''اسلامک کلچر (Islamic Culture) کے جنرل ایڈیٹر بھی رہے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی کی ملازمت کے دوران حکومت ہند کے وظیفے پر اٹلی جا کر اطالوی زبان سیکھی اس سے پہلے اور فرنچ زبانوں میں ڈپلومہ حاصل کر چکے تھے۔

تراجم کے حوالے سے بھی ان کا کام کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ انھوں نے ٹی۔ ایس ایلیٹ کی مشہور نظم ویسٹ لینڈ کا نہایت عمدہ اردو ترجمہ آزاد نظم کی شکل میں کیا۔ ان کے اس ترجمہ کو اہل قلم نے بہت زیادہ پذیرائی بخشی۔ اس کے کئی اردو انگریزی مضامین اقبال ریویو اور دیگر رسائل میں چھپتے

رہے۔ انھوں نے علامہ محمد اقبال، فیض احمد فیض اور قلمی قطب شاہ کی بعض نظموں کا انگریزی زبان میں نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔

علامہ محمد اقبال کے ساتھ پروفیسر سید سراج الدین عشق کی حد تک عقیدت رکھتے تھے ان کا خیال تھا کہ اقبال جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بل کہ اُمتِ مسلمہ کے لیے اپنے سینے میں بہت نرم گوشہ رکھتے تھے۔ وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے دکھ، سکھ، ان کے درد اور تکالیف کو محسوس کرتے تھے۔ پروفیسر سید سراج الدین کلام اقبال کا بڑی عمیق نظری سے مطالعہ کرتے اور ان کے اشعار پر بہت غور وفکر کرتے۔ ان کی اقبال کے اردو اور فارسی کلام پر بہت گہری نگاہ تھی۔ اقبال کے فکر وفن پر ان کی نہایت عمدہ کتاب ''مطالعہ اقبال: چند نئے زاویے'' اپنے منفرد موضوع اور خیال افروز ہونے کی وجہ سے اقبالیاتی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔

پروفیسر سراج الدین نے ۱۹۹۳ء سے اقبال اکیڈمی حیدر آباد کے تیسرے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیے۔ پروفیسر سراج الدین حیدر آباد کی نہایت مقبول علمی وادبی شخصیت تھے یہی وجہ ہے کہ حیدر آباد کے کئی علمی وادبی اداروں کے ساتھ وابستہ رہے۔ انھوں نے ''جاوید نامہ کا آزاد اردو ترجمہ کرکے بھی خوب شہرت پائی۔ پروفیسر سید سراج الدین ۱۵ جولائی ۲۰۰۶ء کو انتقال کر گئے۔

ooo

سعید احمد اکبر آبادی، مولانا

(۱۹۰۸ء۔۲۴ مئی ۱۹۸۵ء)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ۱۹۰۸ء آگرہ (وطن: بچھرایوں، مراد آباد) میں ڈاکٹر ابرار حسن کے ہاں پیدا ہوئے۔ مولانا سعید احمد بھارت کے ممتاز عالم دین، صحافی اور محقق تھے۔ مولانا سعید احمد دیوبند سے فارغ التحصیل تھے۔ انھیں مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسن احمد مدنی ایسے بلند پایہ مذہبی سکالرز سے اکتساب فیض کا موقع ملا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ماہنامہ ''برہان'' دہلی سے ۴۷ برس نکالتے رہے۔ مدارس عالیہ کلکتہ میں پرنسپل بھی رہے۔ صدر شعبہ دینیات مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ بھی تعینات رہے۔ ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم دیوبند تھے۔ اس کے علاوہ رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند، یکے از بانیان ندوۃ المصنفین۔ ان کے شاگردوں میں جنرل ضیاء الحق، عبدالصمد صارم اور مولانا احتشام الحق تھانوی کے اسمائے گرامی سامنے آتے ہیں۔

ان کی معروف کتب میں ''صدیق اکبرؓ''، ''عثمان ذوالنورینؓ''، ''وحی الٰہی''، ''اسلام میں غلامی کی حقیقت''، ''فہم القرآن''، ''غلامان اسلام''، ''مسلمانوں کا عروج وزوال''، ''خطباتِ اقبال پر ایک نظر'' شامل ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اقبال انسٹی ٹیوٹ کی خواہش پر ''خطباتِ اقبال پر ایک نظر'' تصنیف کی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مغربی مفکرین کے خیالات ونظریات سے بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے خطباتِ اقبال کا نہایت باریک بینی اور مہارت سے جائزہ لیا ہے۔ مصنف نے کتاب میں آسان زبان استعمال کی ہے اور اس طریقے سے خطبات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے کہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد علامہ

کے خطبات کی تفہیم عمدہ انداز میں سامنے آئی ہے ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء کو رحلت پائی۔ ان کی اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ہے۔

خطباتِ اقبال پر ایک نظر

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: ۱۹۸۷ء، صفحات: ۹۶، قیمت: ۲۰ روپے

ooo

سعید اختر درانی، ڈاکٹر

(۸ دسمبر ۱۹۲۹ء۔۱۶ جولائی ۲۰۱۸ء)

ڈاکٹر سعید اختر درانی ہمہ جہت انسان تھے۔ انھوں نے انسان دوستی کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ پاکستان کے سائنس دانوں میں وہ غیر معمولی شہرت کے حامل تھے۔ مصور پاکستان سے ان کی محبت لازوال رہی۔ سائنس اور اقبال کو یک جا کرنا انھی کا کمال کر دیا۔ اقبالیاتی ادب میں ان کی دو کتب ''اقبال یورپ'' اور ''نوادر اقبال یورپ میں'' قابل ذکر ہیں۔ وہ جنرل ریٹائرڈ محمود درانی کے قریبی عزیز تھے۔ فوج، شعبہ سائنس اور اقبالیات میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ میرے محسن و مربی اقبال شناس چودھری عنایت علی نے ۱۷ جولائی ۲۰۱۸ء کو اطلاع دی کہ سعید اختر درانی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ میری کتاب ''خورشید اقبال'' ان کی دونوں کتب پر وقیع تبصرے موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں سعید اختر درانی سائنس دان ہونے کے ساتھ ساتھ اقبالیات کو بھی سائنسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے رہے۔

سعید اختر درانی ۸ دسمبر ۱۹۲۹ کو لائل پور موجودہ فیصل آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ممالک کا رخ کیا اور کیمبرج یونیورسٹی جرمنی سے ۱۹۵۸ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۷۸ء میں انھوں نے برمنگھم یونی ورسٹی سے ڈاکٹر آف سائنس کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ وہ عالمی شہرت یافتہ ماہر طبیعیات تھے انھوں طبیعیات کے شعبہ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی دلچسپی کے میدان نیوکلیئر اور خلائی سائنس تھے۔ انھیں ایک اعزاز یہ بھی حاصل ہے کہ رائل سوسائٹی آف انگلینڈ نے انھیں ان آٹھ سائنس دانوں

پر مشتمل ٹیم میں شامل کیا جس نے چاند سے حاصل کردہ نمونوں پر تحقیق کی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان نمونوں کی ریڈی ایشن ہسٹری کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ انھوں نے پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں بھی شمولیت حاصل کی اور اس کے لاہور سنٹر کے چیئرمین رہے۔ ۱۹۸۲ء میں انھیں حکومت پاکستان نے اعلیٰ خدمات کے اعتراف میں ستارہ امتیاز سے سرفراز کیا۔ ان کے عالمی تحقیقی رسائل میں تقریباً تین سو تحقیقی وتنقیدی مضامین شائع ہوئے۔ برطانیہ کے نیوکلیئر سنٹر میں بھی اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ اپنی مادرِ علمی جہاں انھوں نے تعلیم حاصل کی وہیں برمنگھم یونی ورسٹی میں انھیں درس وتدریس کا موقع بھی ملا۔ اسی شہر میں زندگی کا بیشتر حصہ گزارا اور یہیں ۱۶ جولائی ۲۰۱۸ء ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔

ڈاکٹر سعید اختر درانی نے اقبال کے سفر یورپ کو بہت ہی منفرد اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے ان کی اس سلسلہ کی پہلی کتاب ''اقبال یورپ میں'' دس سال قبل منظر عام پر آئی تو اس کتاب کو بہت زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ اقبالیاتی حلقوں نے اس کتاب کا خوش دلی سے خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی نے دس سال بعد ایک اور اہم کتاب محبان اقبال کے لیے پیش کر دی ہے جس کا نام ہے ''نوادرِ اقبال یورپ میں'' یہ کتاب پہلی کتاب سے مکمل طور پر مختلف ہے۔ اس کتاب میں یورپ میں اقبال کی اہم یادگاروں کو شامل کیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی انڈیا کے چیئرمین معروف محقق و دانش ور خلیق انجم نے دیباچہ میں لکھا ہے:

> ''درانی صاحب کی پہلی کتاب ''اقبال یورپ میں'' کو نہ صرف غیر معمولی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی بلکہ اسے اقبالیات میں ایک اہم اضافہ کہا گیا۔ اس کتاب کی زبردست پذیرائی ہوئی، جس سے ڈاکٹر درانی کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ انھوں نے ''نوادرِ اقبال یورپ میں'' کے نام سے ایک اور کتاب لکھی۔ اس کتاب میں اقبال کے سوانح اور شخصیت کے بارے میں بہت اہم اور تاریخی مواد فراہم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا مضمون ہے جرمنی کا شہر ''ہائیڈل برگ'' ستمبر ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر درانی کو دو سائنسی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے جرمنی کے میونخ اور ورمز نامی دو شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں انھوں نے علامہ اقبال کی دوست اور استاد ایما ویگے ناسٹ کی قبر کی زیارت کی اور مس ویگے ناسٹ کے کئی رشتے داروں سے ملاقات کر کے مرحومہ کے بارے میں ایسی معلومات حاصل کیں جن سے عام قارئین تو کیا خود ماہرین اقبال بھی ابھی تک ناواقف تھے۔''

سعید اختر درانی نے اپنی کتاب ''اقبال یورپ میں'' میں علامہ کی زندگی کے اس اہم حصے

پر روشنی ڈالی ہے اور ایسے بہت سے حقائق کی پردہ کشائی کی ہے جو ابھی تک دنیا کی نظروں سے اوجھل تھے کتاب گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے جبکہ چھ مضامین ضمیمے کی صورت میں درج ہیں۔ کتاب کے تمام ابواب قارئین کے لیے نئی معلومات اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

یورپ کے حوالے سے ایسی نادر معلومات صرف اور صرف ڈاکٹر سعید اختر درانی کی کتابوں سے ہی مل سکتی ہیں۔ سفر یورپ پر مبنی ان کی دونوں کتابیں اقبالیاتی ادب میں ایک جھومر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی نے یہ سارا کام ایک اقبال شناس کی حیثیت سے انجام دیا یوں انھوں نے اقبال سے بے پناہ محبت کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر درانی ان مقامات پر گئے جہاں اقبال کے شب و روز گزرے تھے یا ان لوگوں سے جن سے اقبال ملتے رہے ہیں اگر وہ زندہ نہیں تو ڈاکٹر درانی ان کی قبروں پر جا کر اپنی والہانہ محبتوں کا ثبوت دیا۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی استاد اور دوست مسز ایلسا ویگے ناسٹ کی قبر پر بھی جاتے ہیں اور ویگے کے رشتہ داروں سے نہ صرف ملے بلکہ ان کے انٹرویوز بھی کرتے رہے یوں اقبالیاتی ادب میں ایسی ایسی نایاب معلومات فراہم کی ہیں جو اس سے قبل مسدود تھیں۔ ڈاکٹر درانی نے علامہ اقبال کے لکھے ہوئے وہ خطوط بھی ڈھونڈ نکالے جو انھوں نے مختلف اوقات میں اپنی استاد ایما ایلسا ویگے ناسٹ اور استاد محترم تھامس آرنلڈ کو لکھے تھے۔

ڈاکٹر سعید اختر درانی وسیع مطالعہ تھے انھوں نے شیکسپیئر کا بھی بڑی عمیق نظری سے مطالعہ کیا پھر علامہ محمد اقبال کی نظم ''شیکسپیئر'' کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی کیا اور سٹر انفورڈ آن ایون میں موجود شیکسپیئر کی یادگار میں اسے لکھوا کر نصب کروایا۔ انھوں نے ''اقبال اور شیکسپیئر'' کے عنوان سے کتاب تصنیف جو ابھی زیور طباعت سے آراستہ نہ ہوسکی امید ہے کہ ان کے لواحقین اس کتاب قیمتی اثاثہ کو جلد شائع کروائیں گے۔ ڈاکٹر سعید اختر درانی ۱۶ جولائی ۲۰۱۸ء کو انتقال کر گئے۔ سعید اختر درانی کی اقبالیاتی کتب کا تعارف درج ذیل ہے۔

اقبال یورپ میں

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، اشاعت ۱۹۸۵ء، صفحات ۲۳۸، قیمت: ۷۵ روپے

نوادرِ اقبال یورپ میں

پبلشر: محمد سہیل عمر، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت طبع اول ۱۹۹۵ء، طبع دوم ۲۰۰۳ء، طبع سوم ۲۰۱۰ء، صفحات ۲۲۰، قیمت ۳۰۰ روپے۔

سعید راشد علیگ، پروفیسر

(۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء......۱۹ جون ۱۹۹۹ء)

پروفیسر سعید راشد علمی ادبی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ اُنھوں نے ادب کے مختلف محاذوں پر ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں ہیں۔ تاریخِ ادب میں اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ سرسید احمد خان نے علی گڑھ میں جو تعلیمی تحریک شروع کی تھی اُس کی آبیاری اُن کے انتقال کے بعد شروع ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں یہ ادارہ یونی ورسٹی بن گیا۔ سرسید احمد خان خود تو اس ادارے کو پروان چڑھتا نہ دیکھ سکے لیکن پروفیسر سعید راشد ایسے لوگوں نے اس ادارہ سے اکتسابِ فیض کیا۔ پروفیسر سعید راشد نے ایک تعلیمی اور دینی ماحول میں آنکھ کھولی۔ وہ ۲۰ جنوری ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کے نانا ممتاز عالم دین عظمت اللہ صدیقی، عالمی شہرت یافتہ، اسلامی سکالر مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ تھے۔ فطرت خوش بخت لوگوں کے لیے روح پرور ماحول پیدا کر دیتی ہے۔ ایک طرف تو سعید راشد کا ماحول دینی تھا اور مزید خوش قسمتی کے جب وہ پیدا ہوئے تو مساجد میں اذان کے آواز گونج رہی تھی۔ عظمت اللہ صدیقی نے فل فوراً اپنے نواسے کے کان میں اذان دی اور اس اچھی گھڑی کی مناسبت سے اُن کا نام ''سعید'' رکھا۔ احباب کا کہنا ہے کہ عظمت اللہ صدیقی کو اس بات کا اشارہ خواب میں ملا تھا۔ سعید راشد کی والدہ رحمت بی بی نیک خاتون تھیں۔ ہمہ وقت باوضو رہتیں۔ دودھ پلانے کا عمل بھی باوضو انجام دیتیں۔ سعید راشد کی دادی جان بھی ایسی ہی خوبیوں کی حامل تھیں۔ پرانے دور کے گھرانوں میں جس طرح محنت کرنے کا دور دورہ رہتا اِسی طرح سعید راشد کا گھر بھی محنت، جاں سپاری اور مذہبی ماحول میں گھرا ہوا تھا۔ سعید راشد کی دادی اماں اپنے ہاتھوں سے چکی پیسا کرتی تھیں۔ وہ چکی پیستے ہوئے سعید راشد کو گود لے کر سورۂ رحمٰن کی تلاوت جاری رکھتیں۔ جب سعید راشد کی رسم

بسم اللہ ہوئی تو اُس وقت اُن کی عمر چار ماہ اور چار دن تھی۔ سعید راشد کو گھر میں بہت پیار ملا۔ اوائل عمری میں وہ بیمار رہے یہی وجہ ہے کہ اُن کی ابتدائی تعلیم چھ برس عمر میں شروع ہوئی۔ سعید راشد نے قرآن مجید پڑھنے کے ساتھ ساتھ راہِ نجات، قاعدہ بغدادی اور احمد نامہ ایسی کتب پر بھی دسترس حاصل کر لی۔ اُنھوں نے جماعت چہارم سے ایف اے تک تعلیم بریلی میں حاصل کی۔ اسلامی انٹر کالج اُن کی تعلیم کا اہم مرکز تھا۔ سرسید احمد خان کے قائم کردہ اس ادارے سے فیض یاب ہونے والوں میں سعید راشد سرفہرست ہیں۔ علی گڑھ سے علم کے موتی سمیٹنے والے اپنے نام کے ساتھ ''علیگ'' تحریر کرتے ہیں۔ اس لیے پروفیسر سعید راشد علیگ کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُنھوں نے تحریک پاکستان یعنی تحریکِ آزادی کو اپنی نظروں سے دیکھا۔ عالمِ شباب ہی میں وہ مسلم لیگ کے جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ پروفیسر سعید راشد اس حوالے سے بھی بہت خوش قسمت ہیں کہ اُنھوں نے ایک طرف تو تحریکِ آزادی میں بھرپور حصہ لیا تو دوسری طرف اُنھیں نہرو، گاندھی اور ایسے بڑے لیڈرز کو سننے کا موقع ملا۔ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے وہ مختلف تقریبات میں شرکت کرتے اور مسلمان اکابر کے جذبات و احساسات سے بہرہ ور رہتے۔ اُنھیں قائداعظم محمد علی جناحؒ، ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا ظفر علی خاںؒ ایسے مسلم رہنماؤں کے خطاب سننے کا بھی موقع ملا۔ سرسید احمد خاں، علامہ محمد اقبال اور قائداعظم، سعید راشد کی پسندیدہ شخصیات ہیں۔

سعید راشد نے اُردو میں ایم اے کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ٹیچر ٹریننگ کالج میں ۱۹۴۹ء داخلہ لیا۔ یہاں ان کو ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر ہادی حسن، ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین، پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر حبیب الرحمٰن ایسے اساتذہ سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ اُنھوں نے سرسید احمد کی تحریک اور تحریکِ پاکستان سے زبردست اثر لیا۔ اس ماحول نے ان کو اور بھی مہمیز کیا۔ سعید راشد کو بچپن ہی سے درس و تدریس کا بہت شوق تھا۔ اس لیے اُنھوں نے اپنی پوری توجہ تعلیم کی طرف مرکوز رکھی۔ بی ٹی (بیچلرز آف ٹیچنگ) کے امتحان میں یونی ورسٹی بھر میں پہلی پوزیشن حاصل کی جس کے بعد وہ امریکہ میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتے تھے مگر ان کے استاد ڈاکٹر عشرت حسین نے ان کو نصیحت کی کہ ان کی منزل امریکہ نہیں، پاکستان میں ہے۔ اس لیے ان کو سول سروس کی چکا چوند میں نہیں آنا چاہیے۔ اُنھوں نے کہا کہ پاکستان کو آفیسرز کے بجائے اساتذۂ کرام کی ضرورت ہے۔ اُستاد خود بادشاہ نہیں لیکن بادشاہ تخلیق کرتا ہے۔ سعید راشد کے دل پر اس بات کا گہرا

اثر ہوا۔ اس لیے اُنھوں نے پیشۂ پیمبری اختیار کیا۔ جب وہ ہجرت کر کے پاکستان تشریف لے آئے تو اُنھوں نے ایک طویل عرصہ جہلم میں گزارا۔

سعید راشد علیگ نے اپنے آپ کو ملک وقوم کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اُنھوں نے سیاسیات، اسلامیات، پاکستانیات، مدنیات، اخلاقیات، اقبالیات اور لسانیات کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ طالب علموں کی کردار سازی سے ہی تعلیم کے اصل مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ عسکری تربیت کے لیے ملٹری کالج جہلم محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ سعید راشد ۱۱ جون ۱۹۵۰ء کو پاکستان تشریف لائے۔ ۲۱ جون ۱۹۵۰ء کو اُنھوں نے ملٹری کالج جہلم کو اپنی خدمات پیش کیں۔ اُن کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر سلیکشن بورڈ نے اُنھیں ۲۲ جون ۱۹۵۰ء کو کالج میں خدمات کا موقع فراہم کر دیا۔ وہ فائن آرٹس کلچرل سنٹر سے وابستہ ہو گئے۔ ملٹری کالج کے ادبی مجلّہ ''تربیت'' کی ادارت بھی سنبھالی ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء تک وہ لائبریری کے آفیسر رہے جب کہ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۵ء تک اُنھوں نے بہ حیثیت ہاؤس ماسٹر شیر شاہ ہاؤس خدمات انجام دیں۔ اکتوبر ۱۹۷۴ء میں اُنھیں ڈائریکٹر اُمورِ تحقیقات مقرر کیا گیا۔ یاد رہے! وہ ۱۹۸۷ء میں ریٹائر ہو گئے لیکن اپنی خداداد صلاحیتوں سے اپنے تعمیری کاموں میں مصروف رہے۔ عالمگیرین سوسائٹی کے سیکرٹری کی حیثیت سے بھی اُن کی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ آرمی پبلک سکول جہلم اور منگلا کینٹ میں اُن کی تدریسی خدمات اُنھیں ہمیشہ کے لیے زندہ رکھیں گی۔ تعمیر ملت انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ اسلام آباد اور بہ حیثیت ڈائریکٹر سلطانہ فاؤنڈیشن آف کریکٹر بلڈنگ میں بھی اُن کی خدمات ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ نظریۂ پاکستان، مشاہیر اور تعلیم کے حوالے سے اُن کی متعدد کتابیں اُن کا سرمایہ حیات ہیں۔ وہ کئی کتابوں کے مرتب اور مؤلف رہے۔ چند اہم کتابوں میں:

☆ حیات قائداعظمؒ ☆ گفتار و کردار قائداعظم ☆ گفتار و کردار سر سید ☆ تذکرہ شہداء ☆ جرأتوں کے نشان ☆ حق نواز کیانی شہید (ستارۂ جرأت) ☆ تذکرۂ اقبال ☆ مکالمات اقبال ☆ شاد باد منزلِ مراد ☆ کردار ساز (بریگیڈیئر محمد رفیق کی سوانح حیات) ☆ میجر اکرم شہید نشان حیدر ☆ شہیدِ سیاچن کیپٹن معظم علی بلوچ ☆ داستانِ علم و عمل (دو جلدیں) ☆ چراغوں کی قطار، شامل ہیں۔ اقبالیات کے حوالے سے تذکرۂ اقبال اور مکالماتِ اقبال، اقبالیاتی ادب کا گراں قدر حصہ ہیں۔ ملک کے معروف اشاعتی ادارے بُک کارنر جہلم نے سعید راشد علیگ کی بہت سی کتب شائع کی ہیں۔ اُن کی بہت سی نصابی

کتابوں سے ہزاروں طلباء و طالبات استفادہ کر رہے ہیں۔ اُن کی انگریزی زبان میں تحریر کردہ کتابیں بھی ذخیرۂ معلومات ہیں۔ جن میں:

☆ In Search of Character, ☆ Character Building Exercise, ☆ Teacher Educaiton Programme, ☆ Character Building & Public Speaking, ☆ Pakistan & Character Building, ☆ Recognition, ☆ Teacher Guide, ☆ Character & Conduct of Quaid-e-Azam, ☆ Learning to Lead, ☆ In Search of Maturity, ☆ From School to College, ☆ A Lasting Light House .

تقریباً ۷۳ سال کی عمر میں اُنھیں بیماریوں نے آگھیرا۔ اُنھیں بیماری کی حالت میں سی ایم ایچ راولپنڈی داخل کروایا گیا۔ انسان بیماری سے تو لڑ سکتا ہے لیکن موت سے کون مقابلہ کرے؟ وہ بروز ہفتہ ۱۹ جون ۱۹۹۹ء کو ہمیں سوگ وار کر گئے۔ ۲ بیٹے اور چار بیٹیاں اُن کا مشن زندہ رکھنے کے لیے اُن کے پسماندگان میں شامل ہیں۔ حکومت پاکستان نے اُن کی خدمات کے اعتراف میں اُنھیں تمغۂ حسنِ کارگردی عطا کیا۔ ملٹری کالج جہلم کے در و دیوار اُن کی شخصی عظمت اور ادبی قدر و منزلت کے گواہ ہیں۔ اس ادارہ نے ۱۹ نومبر ۲۰۰۰ء کو سعید راشد بلاک کا افتتاح کر کے اُن کی یاد زندہ رکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ سعید راشد علیگ نے تمام عمر نوجوانوں کی کردار سازی کی طرف توجہ دی۔ وہ چاہتے تھے کہ نسلِ نو میں جذبۂ حب الوطنی موجزن رہے۔ وہ نوجوانوں کو ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کا شاہین بنانے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ اُن کی تخلیقات کے تمام زاویے جذبۂ حب الوطنی کے تاج محل تک پہنچتے ہیں۔ بہ حیثیت اقبال شناس بھی اُن کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ اُنھوں نے عسکری ادارہ سے وابستہ نوجوانوں کو اقبال کا حقیقی شاہین بنانے کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ اقبالیاتی ادب کا ایک حصہ ہیں۔ ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

تذکرۂ اقبال

ناشر: بک کارنر جہلم، اشاعت: جنوری ۲۰۱۳ء، صفحات: ۳۸۲، قیمت، ۴۹۵ روپے

مکالماتِ اقبال (علامہ اقبال کی زندگی کے سنہرے واقعات)

پبلشرز: بک کارنر، جہلم اشاعت اوّل ۱۹۸۸ء دوم ۲۱/ اپریل ۲۰۱۳ء صفحات: ۴۴۸، قیمت ۶۰۰ روپے

سلیم احمد

(یکم دسمبر ۱۹۲۸ء۔ یکم ستمبر ۱۹۸۳ء)

سلیم احمد یکم دسمبر ۱۹۲۸ء کھیولی ضلع بارہ بنکی (یو پی) میں سید شرافت علی کے ہاں پیدا ہوئے۔
سلیم احمد نامور نقاد، ادیب، شاعر، محقق، براڈ کاسٹر، ناول و افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، کالم نویس کی حیثیت سے خوب شہرت پائی۔ میرٹھ کالج سے میٹرک پاس کیا۔ اسی دوران ملک تقسیم ہو گیا اور وہ پاکستان چلے آئے۔ باقی تعلیم اُنھوں نے کراچی میں آ کر مکمل کی۔ ۱۹۵۰ء میں ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے اور بطور پروڈیوسر فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۴ء میں شاعری اور ۱۹۴۸ء میں تنقیدی مضامین لکھنے کا آغاز کیا۔ فلمی دنیا کے لیے کہانیاں، مکالمے اور گانے لکھتے رہے۔ نیز اخبارات میں کالم نگاری بھی کی۔ انھوں نے ریڈیو کے لیے کئی ڈرامے بھی لکھے۔ ان کے مقبول ڈراموں میں ''یہ لاش کس کی ہے''، ''طلسمات''، ''موسم اور محبت''، ''ہندی وادی'' اور ''روحوں کا چکر'' شامل ہیں۔

وہ اپنے کالموں میں سیاست، تنقید، نفسیات، تاریخ اور ادب کو زیرِ بحث لاتے رہے۔

تنقیدی کتب میں ''ادبی اقدار''، ''محمد حسن عسکری: آدمی یا انسان''، ''اقبال: ایک شاعر''، ''ادھوری جدیدیت''، ''نئی نظم اور پورا آدمی''، ''غالب کون؟'' شعری کتب میں ''چراغ نیم شب''، ''بیاض''، ''اکائی'' شامل ہیں۔ سلیم احمد، شمیم احمد کے بھائی تھے۔

ممتاز شاعر و ادیب سلیم احمد کی کتاب ''اقبال ایک شاعر'' نہایت اہم ہے جس میں اقبال کی شاعری کو اس تمام پس منظر میں دیکھنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے جو بڑے عہد کے سب سے بڑے تخلیق کار کے حصے میں آتی ہے۔ شاعری ایک لطیف جذبہ ہے۔ شاعری کے ذریعے اپنی فکر کو

اپنی قوم اور ایسی قوم جو غلامی کی پستیوں میں گھری ہوئی ہو، جو تاریکیاں اوڑھے ہوئے ہو، ایسی قوم کو بیدار کرنا؟ یہ فریضہ صرف اقبال ہی انجام دے سکتے تھے۔ ''اقبال ایک شاعر'' کو پڑھنے کے بعد اقبال کی شاعری کے مختلف موضوعات کا ادراک ہوتا ہے۔ ادارہ قوسین نے سلیم احمد سے ایک عمدہ کام کروایا ہے۔ ایک طرف سورۃ اخلاص اور کن فیکون ہے تو دوسری طرف ابلیس کے کردار کو پیش کر دیا گیا ہے۔ کہیں شاہین محو پرواز ہے تو کہیں ایک سچے شاعر کا المیہ نظروں کے سامنے گھومتا ہے۔ اقبال کا معجزۂ فن کہنے کو تو صرف دس صفحات پر مشتمل ہے لیکن فن اور نظریۂ فن کا امتزاج خوب صورت انداز میں پیش کرنا سلیم احمد کا ہی کمال ہے۔ پانچواں مطالعہ در حقیقت فلسفہ عمل ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اسی عمل کا نام ریاضت رکھا ہے۔ یہ عمل تخلیق کو نکھارتا ہے۔ اسی عمل سے زندگی بنتی ہے اور یہی عمل ہمیں انقلاب کا راستہ دکھاتا ہے۔

سلیم احمد یکم ستمبر ۱۹۸۳ء کو انتقال کر گئے ان کی تدفین پاپوش نگر کراچی میں ہوئی۔ ان کی کتاب ''اقبال ایک شاعر'' کا حوالہ درج ہے۔

اقبال ایک شاعر

پبلشرز: قوسین، لاہور، اشاعت: باردوم ۱۹۸۷ء، صفحات: ۱۶۰

ooo

سہیل بخاری، ڈاکٹر

(۶ دسمبر ۱۹۱۴ء۔ ۲۹ جنوری ۱۹۹۰ء)

ڈاکٹر سہیل بخاری اردو ادب کے معروف نقاد، محقق، ماہر تعلیم، ماہر لسانیات تھے۔ ان کا اصل نام سید محمود نقوی تھا وہ ضلع مین پوری (یو پی) کے ایک گاؤں سرائے شیخ میں ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں این اے وی ہائی سکول شکوہ آباد سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ والدین کی خواہش پر قانون میں داخلہ لینے علی گڑھ چلے تو گئے۔ مگر وکالت کو مستقبل کا پیشہ اپنانے کو جی نہ مانا تو واپس گھر آگئے۔ جس سکول کو چھوڑا تھا، وہیں بطور ان ٹرینڈ ٹیچر اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۸ء میں سی ٹی کی سند لی اور اس سے اگلے برس پبلک سروس کمیشن کی سفارش پر سر عزیز الدین ہائی سکول جھانسی میں تعینات ہوئے اسی ملازمت کے دوران اپنی تعلیم کی تکمیل کی اور ایم اے تک کے امتحان پرائیویٹ طور پر درجہ اول میں پاس کیے۔ اردو زبان وادب سے دل چسپی آغاز ہی سے تھی۔ شاعری کا بھی ذوق رہا مگر ان کی طبیعت کا میلان زیادہ تر تحقیق کی جانب رہا۔

برعظیم پاک و ہند کی تقسیم کے کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۹۵۲ء کو ہجرت کر کے میں پاکستان چلے آئے تین برس لاہور کے مختلف تعلیمی اداروں میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۵۵ء میں پی اے ایف کالج سرگودھا سے وابستہ ہوئے۔ علمی وادبی حلقوں میں لاہور ہی کے مختصر قیام میں متعارف ہو چکے تھے۔ سہیل بخاری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز سہ ماہی ''صحیفہ'' لاہور سے کیا۔ انھوں نے سرگودھا میں پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو کی نثری داستانیں'' لکھا اور پنجاب یونی ورسٹی میں پیش کیا جس پر ۱۹۶۳ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ زبان اردو کی تحقیق وتنقید پر ایک خوب صورت کتاب

''اُردو کا روپ'' تصنیف کی جسے بہت سراہا گیا۔اس سے قبل ان کی تین تنقیدی کتابیں ''سب رس پر ایک نظر''، ''باغ و بہار پر ایک نظر'' اور ''غالب کے سات رنگ'' شائع ہو چکی تھیں۔ان کتب میں بھی ڈاکٹر سہیل بخاری نے مصنفین کے لسانی تجزیہ پر بطورِ خاص روشنی ڈالی تھی ''اردو کا روپ'' کی اشاعت کے بعد انھوں نے ''اردو کی کہانی'' لکھی، جس نے وہ تمام تعصبات دور کر دیے جو اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان کے دلوں میں مدتوں سے موجود تھے۔ان دو کتابوں کے بعد ڈاکٹر سہیل بخاری کا نام اُردو لسانیات میں ایک معتبر نام سمجھا جانے لگا۔

پی اے ایف کالج میں ۱۹۷۴ء کے اواخر تک ریٹائر ہو کر بی بلاک سیٹلائٹ ٹاؤن متصل قصر القائم سرگودھا میں آ گئے مگر یہاں بھی گھر کرائے کا تھا۔راقم الحروف کی آخری ملاقات اسی گھر میں مولانا اخگر سرحدی کے ہمراہ ہوئی۔

ڈاکٹر سہیل بخاری بیسویں صدی کے اہم ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔انھوں نے زبان و بیان کے حوالے سے قابلِ ستائش کام کیا ہے۔زبانِ اُردو کے لیے ان کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) سے ان کی کافی یاد اللہ رہی۔مولانا اخگر سرحدی، ڈاکٹر خورشید رضوی اور رحمٰن قریشی کی موجودگی میں ان سے گفت گو باعثِ اعزاز ہے۔ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے سلسلہ میں منعقدہ کئی ایک تقاریب میں ان کی گفت گو سننے کا موقع بھی میسر آیا۔میں سمجھتا ہوں کہ کلامِ اقبال کی دل کشی اور کشش مقناطیس کی مانند ہر شخص کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ان کے کلام کی حلاوت و شیرینی اور علم و حکمت سے بڑے بڑے جید عالم بھی مرعوب نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج سرگودھا میں ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ مل کر ایم اے اردو کے طلبا و طالبات کو فیض یاب کیا۔پی اے ایف کالج سرگودھا میں رحمٰن قریشی کا دور سنہری حروف سے کندہ ہے۔وہ صاحب ذوق اور اعلیٰ پایۂ کے منتظم تھے۔سہیل بخاری بھی مذکورہ ادارہ میں علم کے موتی بکھیرتے رہے۔وہ نہ صرف قومی زبان اردو کی تدریس کے لیے کوشاں رہے بل کہ پی اے ایف کالج کو علم و ادب کا گہوارہ بنائے رکھا۔ان کے دور میں کئی یادگار ادبی تقریبات آج بھی اوراقِ پارینہ کا حصہ ہیں۔اردو کے نفاذ کے لیے بھی ان کی کاوشیں قابلِ ستائش ہیں۔

اقبال صدی کے سلسلے میں علامہ اقبال پر سرگودھا کی خوش نصیبی ہے کہ دبستان سرگودھا سے تین بڑے نام ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سہیل بخاری اور انور سدید نے سال بھر کی محنت شاقہ کے بعد

علامہ اقبال پر تجزیے و مطالعے پیش کیے ہیں۔ان میں ڈاکٹر وزیر آغا کی ''اقبال کا تصور عشق و خرد اقبال کی نظر میں'' اور انور سدید کی ''اقبال کے کلاسیکی نقوش'' ایسی ہی زندہ رہنی والی کتابیں ہیں۔
ڈاکٹر سہیل بخاری کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبالؒ...... مجددِ عصر

ناشر: اقبال اکادمی پاکستان۔لاہور، اشاعت: ۱۹۹۰ء، صفحات: ۲۲۷، قیمت: ۷۵ روپے

اقبال، ایک صوفی شاعر

ناشر: مکتبہ اسلوب کراچی، اشاعت: ۱۹۸۸ء، صفحات ۳۸۰، قیمت: ۷۵ روپے

اقبال اور اہلِ صفا

ناشر: نفیس اکیڈمی۔کراچی، اشاعت: سن ندارد، صفحات: ۲۷۲، قیمت: ۶۹ روپے

ooo

شاہد حسین رزاقی

(۳۰؍اکتوبر۱۹۱۲ء۔۱۴؍مئی ۱۹۹۹ء)

سید شاہد حسین رزاقی ۳۰؍اکتوبر۱۹۱۲ء بارہ بنکی (یوپی) انڈیا میں سید سعید الحسن رزاقی کے ہاں پیدا ہوئے۔ سید شاہد حسین رزاقی نے بحیثیت محقق، نقاد، صحافی، مترجم، شاعر اور ماہر تعلیم شہرت پائی۔ سید شاہد حسین رزاقی صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات عثمانیہ کالج گلبرگہ بھی تعینات رہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر لاہور کے ساتھ بھی ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۸ء تک وابستگی رہی۔ ماہنامہ ''قومی زبان'' اور کئی دیگر رسائل کے مدیر بھی رہے۔ ان کی کتب میں ''Syed Ameer Ali''، ''Discourses of Iqbal''، ''بہادر یار جنگ کا روزنامچہ''، ''قرآنی تصور مملکت''، ''تاریخ جمہوریت''، ''سید جمال الدین افغانی''، ''حیات وافکار''، ''سرسید اور اصلاح معاشرہ''، ''انڈونیشیا''، ''پاکستانی مسلمانوں کے رسم ورواج'' شامل ہیں جب کہ تراجم میں ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' (از ڈاکٹر زبیدہ احمد) ''Discourses of Iqbal'' ان کی اقبال سے ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کی وجہ سے ان کو اقبالیاتی ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

شاہد حسین رزاقی نے کتاب کا آغاز قائداعظم محمد علی جناح کے ایک خط سے کیا ہے، جو ان کی درخواست پر ۹؍اگست ۱۹۴۱ء کو لکھا گیا۔ خط کا عکس کتاب کے آغاز میں دیا گیا ہے۔ دیباچہ چھ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں مصنف نے اقبال کی مختلف تخلیقات جمع کرنے کے ضمن میں اپنی جدوجہد اور کاوشوں کا تذکرہ کیا ہے۔ دیباچہ میں ڈاکٹر علامہ اقبال کی مختلف کتابوں اور تحریروں پر روشنی ڈالی ہے۔

شاہد حسین رزاقی ۱۴ر مئی ۱۹۹۹ء لاہور میں انتقال کر گئے۔ انھیں ماڈل ٹاؤن لاہور میں دفن کیا گیا۔

Discourses of Iqbal

پبلشرز: شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، اشاعت ۱۹۷۹ء صفحات: ۲۸۸، قیمت: ۴۰ روپے

ooo

شہزاد احمد

(۱۹۳۲ء۔۲۰۱۲ء)

شہزاد احمد ۱۹۳۲ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے نفسیات اور فلسفہ میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ انھوں نے فلم انڈسٹری کے لیے مکالمہ نگاری اور ہدایت کاری کی بھی کوشش کی۔ انھوں نے ۱۹۵۸ء میں تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تعلقاتِ عامہ کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ اس زمانے میں انھوں نے شکیب جلالی کو بھی تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی میں ملازمت دلوائی۔ شہزاد احمد اور شکیب جلالی نے بہت سال اکٹھے کام کیا۔ شہزاد احمد کیپٹل انڈسٹریز لاہور میں جنرل منیجر تعینات ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان ٹیلی ویژن راولپنڈی سینٹر میں ملازمت اختیار کی۔ پھر ۱۹۷۵ء میں روٹی کارپوریشن آف پاکستان میں بطور جنرل منیجر مارکیٹنگ کام کیا اور ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۶ء تک ماہنامہ ''ساؤتھ'' لندن کی نمائندگی برائے پاکستان و مشرق وسطیٰ کی۔ وہ کئی جرائد و اخبارات کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ شہزاد احمد کے ساتھ کئی ملاقاتیں رہیں۔ راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) جب بھی لاہور گیا ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وہ کئی بار سرگودھا بھی تشریف لاتے رہے۔ ان کے کئی مشاعروں کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

ان کا اولین شعری مجموعہ ''صدف'' ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد تواتر سے شعری مجموعے منظرِ عام پر آتے رہے۔ جن میں مندرجہ شامل ہیں: ''جلتی بجھتی آنکھیں'' (۱۹۷۰ء)، ''ادھ کھلا دریچہ'' (۱۹۷۷ء)، ''خالی آسمان'' (۱۹۸۵ء)، ''بکھر جانے کی رُت'' (۱۹۸۷ء)، ''دیوار پہ دستک'' (۱۹۹۱ء)،

''ٹوٹا ہوا پل''، (۱۹۹۳ء)، ''کون اسے جاتا دیکھے'' (۱۹۹۴ء)، پیشانی میں سورج'' (۱۹۹۵ء)، ''جاگن والی رات'' (۱۹۹۶ء)، ''اترے میری خاک پر ستارہ'' (۱۹۹۷ء) ''معلوم سے آگے'' (۱۹۹۷ء) ''اندھیرا دیکھ سکتا ہے'' (۱۹۹۹ء)، ''ایک چراغ اور بھی'' (۲۰۰۴ء)، ''آنے والا کل'' (۲۰۰۵ء) اور ''مٹی جیسے لوگ'' (۲۰۱۰ء)۔ اس نے اردو غزلوں اور پاکستانی ادب کا انتخاب بھی کیا۔ نثر میں شہزاد احمد کی تصانیف میں ''مذہب، تہذیب اور موت''، ''تخلیقی زاویے''، ''ذہن انسانی کا حیاتیاتی پس منظر''، ''نفسی طریق علاج میں مسلمانوں کا حصہ''، ''سائنسی انقلاب''، اور ''دوسرا رخ'' شامل ہیں۔

ان کے کیے ہوئے تراجم میں ''ارمان اور حقیقت''، ''فرائیڈ کی نفسیات کے دو دور''، ''آج اور کل سائنس کے آئینے میں''، ''سائنس کے عظیم مضامین''، ''وقت کا سفر''، ''الفریڈ ایڈلر'' اور ''اوس پنسکی'' علامہ اقبال کے خطبات کا ترجمہ ''اسلامی فکر کی نئی تشکیل'' ان کے نمائندہ تراجم میں شمار ہوتا ہے۔ کسی بھی فن پارے کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کرنا، فن پارے کی از سر نو تخلیق تصور کیا گیا ہے۔ ترجمہ کرنے والی شخصیت کو یہ بھی علم ہونا چاہیے کہ وہ جس زبان سے ترجمہ کر رہے، کیا ہمارا معاشرہ یا ہمارا ماحول اس کے مطابق ہے۔ زبان پر مکمل دسترس ہونے کے ساتھ ساتھ علامتوں، محاوروں اور استعاروں کے بارے میں بھی بخوبی آگاہ ہونا چاہیے۔ ترجمہ آسان کام نہیں ہے بل کہ مشکل ترین صنف ہے۔ شہزاد احمد چوں کہ انگریزی ادب کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے، اس لیے انھوں نے کمال ہنر مندی سے ان خطبات کو آسان لفظوں میں رواں ترجمہ کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ شہزاد احمد نے ٹیلی ویژن کے لیے دو سیریل ''دیوار'' اور ''وفا'' لکھے۔ انھیں پاکستان کے ممتاز ادبی انعامات ملے جن میں آدم جی ایوارڈ (۱۹۷۱ء) ''نقوش ایوارڈ برائے شاعری (۱۹۸۹ء)، علامہ اقبال انعام برائے شاعری (۱۹۹۳ء)، نقوش ایوارڈ برائے تراجم (۱۹۹۶ء) اور ۱۹۹۷ء میں صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی۔ انھوں نے ۲۰۰۷ء میں احمد ندیم قاسمی کی وفات کے بعد ادارہ مجلس ترقی ادب لاہور کے ڈائریکٹر کا چارج سنبھالا۔ ۲۰۱۲ء میں شہزاد احمد اپنے مالک حقیقی کے پاس چلے گئے ان کی قابل ذکر کتاب:

اسلامی فکر کی نئی تشکیل (خطباتِ اقبال کا سلیس اور رواں ترجمہ)

پبلشرز: مکتبۂ خلیل غزنی لاہور، اشاعت، طبع اول ۱۹۸۹ء طبع دوم ۲۰۰۰ء، صفحات ۲۳۱، قیمت ۱۲۰ روپے

شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر

(۱۹/اپریل ۱۹۲۵ء-۲۰۱۶ء)

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ممتاز استاد، مقالہ نگار، ماہرِ اقبالیات، اور بہترین اخلاق کے مالک تھے۔ انھوں نے بحیثیت اقبال شناس عالمی سطح پر نام پیدا کیا ہے۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ۱۹/اپریل ۱۹۲۵ء کو حیدر آباد دکن میں محمد نذیر الدین صدیقی کے ہاں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی ڈھوکی کے قاضی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والدِ گرامی محمد نذیر الدین صدیقی نے ریاضی میں ایم اے کیا اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کے شعبہ دارالترجمہ میں مترجم تعینات ہوئے۔ محمد نذیر الدین صدیقی نے ریاضی کی انگریزی کی تقریباً سترہ کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ۱۹۴۷ء میں انتقال کر گئے جبکہ والدہ ۱۹۵۴ء میں انتقال کر گئیں۔ یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو ان کی شادی محترمہ بلقیس کے ساتھ ہوئی۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے اکنامکس میں ایم اے کیا۔ ان کے والد بحیثیت جج کام کرتے رہے۔

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی نے بچپن کا زمانہ حیدر آباد دکن میں بسر کیا وہ جس محلے میں ان کا بچپن گزرا اس محلے کا نام ''مگر باؤلی'' تھا۔ شمس الدین اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان سے دو سال چھوٹا معین الدین صدیقی، تیسرے نمبر پر ان کی بہن رضیہ جہاں آرا جبکہ چوتھے نمبر پہ وحید الدین صدیقی ہیں۔ کل تین بھائی اور ایک بہن تھے۔ شمس الدین نے دارالعلوم ہائی سکول دکن میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور میٹرک بھی وہیں سے کیا اور ریاست بھر میں اول پوزیشن پر رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ انھوں نے امیر جماعت اسلامی مولانا مودودی کی دفتر کے قریب مکان کرائے پر لے لیا۔ شومئ قسمت انھیں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں بڑے

بھائی کی حیثیت سے وہ بہن بھائی کی پوری سرپرستی کرتے رہے ۱۹۵۲ء میں وہ پشاور چلے گئے۔ نومبر ۱۹۵۲ء میں اسلامیہ کالج پشاور انگریزی کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۹۳ء میں وہ ریٹائرڈ ہوئے۔ یاد رہے کہ انھوں نے چالیس سال پشاور میں گزارے۔ یادر ہے ۱۹۶۷ء میں وہ پی ایچ ڈی کے لیے لندن تشریف لے گئے وہاں لندن یونیورسٹی سے مرزا محمد رفیع سوداؔ پر تحقیقی کام کیا۔

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے سوداؔ کا دیوان بھی مرتب کیا ہے جو دو جلدوں میں مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۷۳ء میں شائع کیا۔ سودا کے نئے دیوان اغلاط سے پاس ہیں وگرنہ پہلے دیوان میں لاتعداد نقص موجود تھے۔ شمس الدین صدیقی نے نہایت عرق ریزی سے ان اغلاط کو دور کر کے نئے سرے سے دیوان مرتب کیے۔ جسے علمی و ادبی حلقوں نے خوب سراہا۔ شمس الدین اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''سودا کے اردو کلام کا یہ ایڈیشن شائقین ادب کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرے گا۔ یہ ایڈیشن ایک مبسوط مقدمے اور فرہنگ کے ساتھ لندن یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے پیش کیا گیا تھا اور اس پر اپریل ۱۹۶۷ء میں مرتب کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل بھی گئی۔ اب لندن یونی ورسٹی کی اجازت سے یہ ایڈیشن مقدمہ اور فرہنگ حذف کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔''

سوداؔ کی غزلیات کا دیوان مرتب کرتے وقت انھوں نے ان کے کلام کو چھ مختلف حصوں میں منقسم کیا پہلا حصہ میں وہ کلام شامل ہے جو کسی شک و شبہے کے سودا سے منسوب کیا جا سکتا ہے یہ کلام ''ج'' اور ''ل'' میں شامل ہے۔ دوسرے حصہ میں گمان غالب ہے کہ سودا ہی کا ہے یہ بھی ''ج'' اور ''ل'' دونوں میں شامل نہیں بل کہ ''آ'' اور ''انج'' یا دونوں میں شامل ہے۔ تیسرے حصہ میں وہ کلام شامل ہے جو مذکورہ بالا چاروں نسخوں میں نہیں۔ اس میں شک و شبہے کی گنجائش موجود ہے۔ چوتھے حصہ میں وہ کلام شامل ہے جو صرف ایک نسخے یا کسی ایک تذکرے میں موجود ہے لیکن خود شمس الدین صدیقی نے کسی نسخے میں نہیں دیکھا۔ پانچواں حصہ میں وہ کلام ہے جو شمس الدین صدیقی نے کسی مخطوطے میں نہیں دیکھا البتہ قاضی عبدالودود نے بعض نسخوں میں دیکھا اور چند دیگر احباب نے کتب خانہ آصفیہ میں دیکھا اور دکن کے ایک مخطوطے میں دیکھا اور اسے نقل کر کے شمس الدین صدیقی کو ارسال کیا۔ یہ کلام بھی مشکوک ہے۔ چھٹے حصے میں وہ کلام شامل کیا گیا ہے جو سودا کے مطبوعہ

ایڈیشنوں میں تو ملتا ہے لیکن کسی مخطوطے میں نہیں ملا یہ کلام بھی مشکوک اور شک وشبہ کی گنجائش لیے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے نہایت عرق ریزی اور محنتِ شاقہ سے سوؔدا کے دیوان کو مرتب کیا ہے۔ اردو ادب ہمیشہ ان کے احسان مقروض رہے گا۔

وہ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۴ء تک اور پھر ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۲ء تک شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی کے صدر کی حیثیت سے کام کیا۔ وہ بڑے بااصول اور محنتی استاد تھے۔

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے پشاور یونی ورسٹی اور کئی اداروں میں اردو کی ترویج کے لیے تاریخی کردار ادا کیا۔ وہ اپنے شاگردوں کے لیے راہنمائی کا ''شمس'' تھے۔ انھیں اردو سے لگاؤ اور ادب سے گہرا شغف تھا۔ ممتاز اقبال شناس ڈاکٹر ایوب صابر (پیدائش ۱۹۴۲ء) کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ان کے استاد رہے۔ انھوں نے پشاور یونیورسٹی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے بہت سے اقبالیاتی مضامین رسائل وجرائد کی زینت بنتے رہے۔ ان کے زیرِ تربیت متعدد سکالرز آج پاکستان کے مختلف علاقہ جات میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر ایوب صابر کا کہنا ہے کہ یونیورسٹی آف پشاور کے ادبی مجلّہ ''خیابان'' ۱۹۶۲ء کے خصوصی شمارہ ''اقبال نمبر'' میں ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کا ایک بہت اہم مضمون ''اقبال کا تصورِ حسن'' شائع ہوا۔ جسے احباب نے بہت سراہا۔

ڈاکٹر ایوب صابر نے بتایا کہ جب ڈاکٹر شمس الدین صدیقی غدود کے عارضہ میں مبتلا ہوئے تو انھوں نے ۷۰ء کی دہائی میں ایبٹ آباد میں قیام کیا۔ وہ نہایت ملنسار اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ ایبٹ آباد کے قیام کے دوران وہ علمی و ادبی پروگراموں میں شریک ہوتے رہے۔

پشاور کے تعلق رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر اباسین یوسف زئی اور ڈاکٹر نذیر احمد تبسّم کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ذہین فطین شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بڑی سنجیدگی سے درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ وہ درس وتدریس کی خدمات کے علاوہ عوامی زندگی سے بہت دور رہتے تھے۔ یوں تو انھوں نے اقبالیات کے حوالے سے بہت سا کام کیا۔ لیکن عشرت حسن انور کی کتاب ''میٹا فزکس آف اقبال'' کا اردو ترجمہ کر کے انھوں نے عشرت حسن کے مؤقف کو قارئین تک پہنچانے کے لیے ایک اہم اقبالیاتی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس ترجمے اور تبصرے سے اقبالؔ کا فلسفہ عجم سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے مابعد الطبیعات ایسے مشکل موضوع کے ترجمہ و

تبصرہ پر قلم اٹھانے کی کوشش کی ہے جو ایک گتھیاں سلجھانے کا عمل ہے۔

کتاب کا پیش لفظ سید ظفر الحسن (علی گڑھ) نے لکھا ہے اور دیباچہ ''عشرت انور (مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) کا ہے۔ کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ باب اول میں مذہب اور فلسفہ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے اور اقبال کے فلسفے کے ماخذات پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں وجدان کے طریقِ کار پر اظہار رائے کرتے ہوئے مترجم نے کانٹ کے ساتھ موازنہ بھی کیا ہے۔ تیسرا باب اقبال کے فلسفہ خودی پر مشتمل ہے، جو بذات خود ایک مابعد الطبیعاتی فلسفہ بھی ہے اور عمل بھی...... باب چہارم میں، عالم مادی کے بارے میں علامہ اقبال کے مابعد الطبیعاتی فلسفہ کو پیش کیا گیا ہے۔ باب پنجم میں، وجود مطلق یا خدا کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔ احباب کا کہنا ہے کہ وہ پشاور سے کراچی اور پھر امریکہ تشریف لے گئے۔ ان کا بیٹا ظہیر الدین صدیقی اور بیٹی سلمیٰ صدیقی سے رابطے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود ثابت ہوئی۔ بہت کوشش کے بعد ڈاکٹر اباسین یوسف زئی کی وساطت سے پتہ چلا ہے کہ جامعہ پشاور کے شعبہ اردو نے ۲۰۰۴ء میں ان پر ایم فل کی سطح کا ایک مقالہ قلم بند کروایا۔ یہ مقالہ محترمہ نویدہ نے ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی سرپرستی میں تحریر کیا جس کا عنوان ''ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی احوال و آثار'' ہے۔ ممتاز شاعر نے ڈاکٹر نذیر احمد تبسم بتایا ہے کہ شمس الدین صدیقی کا ۲۰۱۶ء میں امریکہ میں انتقال ہو گیا ہے۔

OOO

صابر کلوروی، پروفیسر، ڈاکٹر

(۲۲ مارچ ۱۹۴۹ء۔۲۲ مارچ ۲۰۰۸ء)

ڈاکٹر صابر کلوروی ۲۲ مارچ ۱۹۴۹ء میں تحصیل ایبٹ آباد میں بانڈہ پیر خان کے قریب واقع گاؤں کلور میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول مانسہرہ سے ۱۹۶۵ء میٹرک کا امتحان نمایاں حیثیت کے ساتھ پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں ۱۹۶۹ء میں بی ایس سی اور ۱۹۷۵ء میں ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ متعدد چھوٹی موٹی ملازمتوں کے بعد ۱۹۷۷ء میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ صدر شعبہ اردو پشاور یونی ورسٹی بھی رہے۔ ''باقیات شعر اقبال، تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' ان کے پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ تھا۔ صابر کلوروی کے مضامین سیارہ ڈائجسٹ، اردو ڈائجسٹ، قومی ڈائجسٹ، حکایت، ماہ نو، اقبال ریویو، صحیفہ اور قومی زبان میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ تصانیف درج ذیل ہیں: '' سائنس سے بھی عجیب تر'' (۱۹۷۵)، ''یادِ اقبال'' (۱۹۷۷ء)، '' داستانِ اقبال'' (۱۹۸۲ء)، ''نقوشِ اُردو'' (۱۹۸۳ء)، ''عروض و بدائع'' (۱۹۸۴ء)، ''اشاریہ مکاتیبِ اقبال'' (۱۹۸۴ء) ''اقبال کے ہم نشین'' (۱۹۸۵ء) اور '' تاریخ تصوف'' (علامہ اقبال کی غیر مطبوعہ کتاب پر حواشی، (۱۹۸۵ء)۔

پروفیسر صابر کلوروی نے یہ کتاب '' تاریخ تصوف'' کے نام سے مرتب کی اور اقبال کی اس نامکمل تصنیف کو تکمیلی رنگ دے کر شائع کروایا۔ کتاب کے آغاز میں جسٹس جاوید اقبال کا وہ خط شامل ہے، جو انھوں نے صابر کلوروی کو اجازت نامہ کے طور پر لکھا۔ اس کے علاوہ علامہ کے ان خطوط کے اقتباسات بھی شامل ہیں، جن سے علامہ کے اس کتاب کو تصنیف کرنے کا ارادہ ظاہر ہوتا

ہے کتاب کے تمام ابواب ہی علامہ کے فلسفہ وفکر کے مظہر ہیں۔خاص طور پر پہلے تین ابواب جو کہ علامہ لکھ چکے تھے، قابل توجہ ہیں۔تیسرا باب حسین بن منصور حلاج نہایت دل چسپ ہے۔

علامہ محمد اقبال کے غیر مدون کلام پر تحقیق بہت بڑا ادبی کارنامہ ہے اور ڈاکٹر صابر کلوروی نے نہایت عرق ریزی سے ''کلیات باقیات شعر اقبال'' (متروک اردو کلام) مرتب کر کے یقیناً ایک اہم کارنامہ نجام دیا ہے۔قبل ازیں ''سرودِ رفتہ'' اور ''باقیات شعر اقبال'' میں بہت سا متروک کلام منظر عام پر آچکا ہے۔لیکن ڈاکٹر صابر کلوروی نے کمال فن کا مظاہرہ کر کے اقبال کا منتشر کلام یک جا کر دیا ہے۔

صابر کلوروی نے ''اشاریہ مکاتیب اقبال'' کے نام سے ایک جامع اشاریہ ترتیب دیا ہے۔اس مقصد کے لیے اُنھوں نے مکاتیب اقبال کے ۱۳ مجموعوں سے استفادہ کر کے اقبال کے فکری سفر کی عکاسی کی ہے۔ان کے خطوط ایک عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ان تاریخ ساز خطوط کو ترتیب زمانی کے ساتھ سپرد تحریر کرنا ایک تحریک کا پس منظر پیش کرنا ہے۔ان کی اقبالیاتی کتب کے حوالے درج ہیں۔

تاریخ تصوف

پبلشرز: مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور، اشاعت: طبع دوم ۱۹۸۷ء، صفحات ۱۰۰، قیمت: ۲۵ روپے ۵۰ پیسے

کلیات باقیاتِ شعر اقبال (متروک اردو کلام)

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: ۲۰۰۴ء، صفحات: ۵۵۴، قیمت ۳۰۰ روپے

اشاریۂ مکاتیبِ اقبال

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: ۱۹۸۴ء، صفحات: ۱۷۸، قیمت ۳۰ روپے

داستانِ اقبال

پبلشرز: نشریات، لاہور، اشاعت: ۲۰۰۹ء، صفحات ۳۳۶، قیمت: ۳۵۰ روپے

ooo

صہبا لکھنوی

(۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء - ۳۰ مارچ ۲۰۰۲ء)

سید شرافت علی نہ صرف شخصی عظمت میں شرافت کا مظاہرہ کرتے رہے بل کہ اپنے والد گرامی سید محمد علی کی سرپرستی میں بھوپال اور لکھنؤ میں اصلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ سید محمد علی اپنے دور کے نامور وکیل تھے۔ سید شرافت علی ۲۵ ردسمبر ۱۹۱۹ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ان کا وطن لکھنؤ تھا، اس لیے علمی و ادبی کاموں کے لیے انھوں نے صہبا لکھنوی نام کا انتخاب کیا۔ صہبا لکھنوی نے ممتاز اردو شاعر، ادیب، صحافی اور محقق کی حیثیت سے بہت شہرت پائی۔ جہانگیریہ ہائی سکول بھوپال سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اسمٰعیلیہ کالج اندھیری بمبئی سے بی اے کی سند لی۔ ان کی پہلی تخلیق ہفت روزہ ''آفتاب'' امرتسر میں شائع ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں ان کا تقرر ریاست بھوپال کے محکمہ مالیات میں ہوا لیکن جلد ہی انھوں نے اس ملازمت کو چھوڑ کر مدرس کا پیشہ اپنایا۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے بھوپال سے ماہنامہ ''افکار'' کا اجراء کیا۔ ''افکار'' اردو کے بلند پایہ ادبی رسائل میں شمار ہوتا رہا ہے ۱۹۵۱ء میں کراچی سکونت اختیار کر لی اور پھر کراچی سے ''افکار'' کا آغاز کیا۔ اس کا احمد ندیم قاسمی نمبر بہت یادگار ہے۔ ''افکار'' کے دیگر نمبر بھی بڑے یادگار ثابت ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میں صہبا لکھنوی کا شعری مجموعہ ''ماہ پارے'' شائع ہوا۔ دوسرا شعری مجموعہ ''خاکے'' کے نام سے تیار کیا، جس کا دیباچہ احمد ندیم قاسمی نے تحریر کیا لیکن ۱۹۴۶ء کے فسادات میں یہ مسودہ فسادات کی نذر ہو گیا۔ بچوں کے لیے دس کہانیوں کا ایک سیٹ شائع ہوا۔ ان کی تصانیف میں سفرنامہ مشرقی پاکستان ''میرے خوابوں کی سرزمین'' (۱۹۶۲ء)، تحقیق ''اقبال اور بھوپال'' (۱۹۷۳ء) شامل ہیں۔ دیگر کتب

میں ''مجاز ایک آہنگ'' (۱۹۵۸ء)، ''زیر آسماں'' (شعری مجموعہ)، ''برطانیہ میں اُردو''، ''غالب ایک صدی''، ''ارمغان مجنوں''، ''رئیس امروہوی فن وشخصیت'' اور ''منٹو ایک کتاب'' شامل ہیں۔

صہبا لکھنوی اقبال کا تعلق بھوپال ریاست سے مضبوط کرنے کے لیے ان تمام عمارتوں، ان تمام جگہوں اور ان تمام لوگوں کو زیر بحث لائے ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح اقبال سے رہا ہو۔ ان تمام مقامات کو اقبال کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں بھوپال کے مشہور آرٹسٹ عبدالحلیم انصاری کی کوئلہ سے بنائی ہوئی علامہ اقبال کی قلمی تصویر شامل ہے۔ علاوہ ازیں نواب حمید اللہ خان، شہزادہ عابدہ سلطان، راس مسعود اور بیگم راس مسعود، شاہ اسد الرحمٰن قدسی، مولوی معظم رسول صدیقی، ڈاکٹر سید عبدالباسط، ممنون حسن خان، سید عبدالحئی، محمد احمد سبزواری، چودھری خاقان حسین، محترمہ اختر جمال، ڈاکٹر سید محمد یوسف، مسیح صدیقی، محمد خلیل اللہ خان، جاوید اقبال (عمر نو سال) کی تصاویر شامل ہیں۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کا مختار مسعود کے نام ۲ جولائی ۱۹۳۰ء کا خط بھی کتاب کی زینت ہے۔ اقبال اور بھوپال کے بارے میں کئی ایک تقاریب کا اہتمام کیا گیا ہے۔

صہبا لکھنوی نے کمال محنت اور لگن سے اقبال کے بھوپال میں گزرے شب و روز محفوظ کر دیے ہیں۔ صہبا لکھنوی کوئی چالیس سال بعد بھوپال گئے اور پرانے احباب سے ملاقاتیں کیں اور اقبال کی یادگاروں کو دیکھا۔ حکومت مدھیہ پردیش، اقبال شناس ممنون حسن خاں اور ان کے دوستوں کی کاوشوں کو سراہا۔ ان کے دوستوں کی بھرپور کوششوں سے شیش محل جہاں علامہ اقبال نے قیام کیا، اس کے سامنے کھرنی والا میدان ''اقبال میدان'' سے موسوم ہوا۔ کل ہند اقبال ادبی مرکز کا قیام اور ایک لاکھ روپے کے سالانہ اقبال اعزاز یہ کی ابتداء ہوئی۔ یہ اعزاز جن ممتاز دانش وروں کو مل چکا ہے، ان میں سردار جعفری، عصمت چغتائی، اختر الایمان، قرۃ العین حیدر اور آنند نرائن ملا کے نام بہت نمایاں ہیں۔ صہبا لکھنوی ۳۰ مارچ ۲۰۰۲ء کو انتقال کر گئے۔ ان کی ایک کتاب اقبالیاتی ادب میں قابل تذکرہ ہے۔

اقبال اور بھوپال

ناشر: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت ۲۰۰۰ طبع سوم، صفحات ۴۰۸، قیمت ۲۵۰ روپے

ooo

صدیق جاوید، ڈاکٹر

(یکم اپریل ۱۹۳۶ء۔۲ نومبر ۲۰۱۳ء)

ڈاکٹر صدیق جاوید نے جہاں اقبال کو نئی تفہیم کے ساتھ پیش کیا ہے وہیں انھوں نے عملی تنقید کے نمونے بھی قارئین کی سامنے رکھ دیے ہیں۔ تفہیم کا یہ انداز قاری کو فکر اقبال کے گہرے سمندر میں اس انداز سے لے جاتا ہے کہ وہ اپنی پسند کے صدف تلاش کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے علامہ محمد اقبال کی بعض نظموں کا نئے تناظر میں تجزیہ کیا ہے۔

یوں تو ''بالِ جبریل'' کی غزلوں اور نظموں کے تجزیاتی مضامین مختلف کتابوں کی زینت ہیں لیکن ڈاکٹر صدیق جاوید کا انداز واقعی نئی تفہیم ہے۔ آج اقبال ہم نہیں ہیں لیکن ان کے مطمعِ خیال صدیق جاوید کی وجہ سے اقبالیاتی ادب کا جھومر بن گیا ہے۔ انھوں نے کہیں نظم، کہیں غزل اور کہیں تو ایک ہی شعر کو اپنے اندازِ تفہیم سے پیش کر کے کئی شارحینِ اقبال کو متحیّر کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صدیق جاوید نے اقبال کے مستشرقین اور کئی ناقدین کو آڑے ہاتھوں لیا ہے کہ انھوں نے اقبال کو صحیح طور پر پرکھنے کی جانچ پڑتال نہیں کی۔ غزل ہو یا نظم ڈاکٹر صدیق جاوید کی عمیق نظری کا قابلِ ستائش ہے۔ اقبال کا ذہنی ارتقاء اور فکر اقبال کے اہم ترین گوشے اس کتاب کی وجہ سے ہمارے لیے حُسنِ معانی اور مفاہیم کے در وا کرتے ہیں۔ ۹۰۰ صفحات پر مشتمل کلام اقبال کے فکری پہلو ۹۰۰ کلومیٹر کی مسافت طے کرتے نظر آتے ہیں ڈاکٹر صدیق جاوید بلاشبہ اس کتاب کی وجہ سے اقبال شناسوں کی صف اول میں شامل ہو گئے ہیں۔

اقبال پر تحقیق کرنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے، جتنا ہمارے

جسم کو خوراک کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب فکر اقبال کو نئے تناظر میں دیکھنے کی دعوت دیتی ہے۔ اقبالیات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اقبالیاتی سکالرز کے لیے روشنی کا منبع ثابت ہوگی۔

ان کی اقبالیاتی کتب کے حوالے درج ذیل ہیں۔

فکرِ اقبال کا عمرانی مطالعہ

پبلشرز: اقبال اکادمی لاہور پاکستان، اشاعت: ۱۹۹۶ء، صفحات ۳۳۶ قیمت ۲۰۰ روپے

اقبال: نئی تفہیم

پبلشر: سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، اشاعت: ۲۰۰۳ء، صفحات ۸۲۸، قیمت: ۹۰۰ روپے

اقبال پر تحقیقی مقالے

پبلشرز: بزم اقبال۔ کلب روڈ۔ لاہور، اشاعت جون ۱۹۸۸ء، صفحات: ۱۴۴، قیمت ۵۵ روپے

ooo

ضیاءالدین احمد برنی

(۳ فروری ۱۸۹۰ء۔۳ مئی ۱۹۶۹ء)

مولانا ضیاءالدین احمد برنی ۳ فروری ۱۸۹۰ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کے والدِ گرامی منشی محمد الدین اپنے زمانے کے ممتاز خطاط تھے۔اسی طرح ان کے ایک بھائی یوسف دہلوی نے بھی خوش نویسی میں خوب نام کمایا۔مولانا ضیاءالدین احمد برنی نے ممتاز اردو ادیب، مترجم، عالم دین، صحافی اور مصنّف کی حیثیت شہرت پائی۔نائب مدیر''ہمدرد'' بھی رہے۔بحیثیت مترجم دارالترجمہ بمبئی (۱۹۱۸۔۴۵ء) رہے۔مولانا ضیاءالدین احمد برنی کراچی سے نکلنے والے رسالہ''کتابی دنیا'' کے بانی مدیر تھے۔ان کی علمی وادبی خدمات بہت وسیع ہیں۔انھوں نے مختلف محاذوں پر کام کیا اور ہر محاذ پر کامیابی وکامرانی سے سرفراز ہوئے۔

ان کی کتب میں''جمال الدین افغانی''،''عظمتِ رفتہ''،''جہاں آرا بیگم''،''لائف آف محمد علی''اور''اقبال از عطیہ بیگم''شامل ہیں۔بعض پراگندہ ذہن رکھنے والے ادیبوں نے اقبال اور عطیہ بیگم کے تعلقات کو غلط رنگ کی کوشش کی ہے۔ڈاکٹر محمد ایوب صابر نے اپنی کتاب''اقبال دشمنی میں'' ایسے منہ پھٹ اور خود ساختہ ناقدین کا منہ توڑ جواب دیا ہے۔فکر اقبال اور ان کی شخصیت کے دفاع میں جو اقبال شناس برسرِعمل رہے۔ان میں ایک نام مولانا ضیاءالدین احمد برنی کا بھی ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ عطیہ فیضی، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے لیے عطیۂ خداوندی تھی جس نے علامہ اقبال کو کئی اچھے مشوروں سے نوازا، ان کے تخلیقی کام کی ستائش کی اور ان کی مایوسیوں میں امید کی کرن ثابت ہوئیں۔ہمارے معاشرے میں ایسے احباب کی کمی نہیں ہے جو لوگوں کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوں۔عطیہ فیضی

ایسی نفیس خاتون تھیں جنھوں نے شاعر مشرق کو حوصلہ دیا اور قومی خدمت پر ابھارا۔

مولانا ضیاء الدین احمد برنی نے بھی اس پراگندہ فضا کو صاف کرنے کی بھرپور انداز میں سعی کی ہے۔ عطیہ فیضی کے نام انگریزی زبان میں لکھے گئے اقبال کے خطوط کا ضیاء الدین احمد برنی نے نہایت عمدگی سے اردو ترجمہ کر کے ان تمام خطوط کو کتابی صورت دی ہے۔ اقبال کے دیگر خطوط کی نسبت عطیہ بیگم کے نام لکھے گئے خطوط میں اقبال نے کھل کر اپنے دلی جذبات و احساسات کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے نجی سے نجی معاملات کو بھی صیغہ راز میں نہیں رکھا۔

خطوط اپنے عہد کی عکاسی کرتے ہیں لہٰذا ان خطوط میں اقبال کی تصانیف، سیاسی صورت حال اور معاشرتی مسائل کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان خطوط میں فلسفیانہ گفت گو بھی شامل ہے۔ یہ خطوط نہیں بل کہ ایک عہد کا عہد نامہ ہے جن کو زبان غیر سے زبان اردو میں ڈھال کر ضیاء الدین احمد برنی نے ایک علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے۔ ضیاء الدین احمد برنی نے اس مجموعہ مکاتیب میں عطیہ بیگم کی ڈائری کے کچھ اوراق بھی اس میں شامل کر دیے ہیں جن کا تعلق علامہ محمد اقبال سے تھا۔ مولانا ضیاء الدین احمد برنی ۳ مئی ۱۹۶۹ء کراچی میں انتقال کر گئے اور پاپوش نگر کراچی میں دفن ہوئے۔

ان کی اقبال کے حوالے سے کتاب کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

اقبال از عطیہ بیگم

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: باراول ۱۹۵۶ء، باردوم ۱۹۶۹ء بارسوم ۱۹۸۱ء
صفحات: ۱۶۴، قیمت ۱۶ روپے

ooo

طفیل دارا

(یکم اپریل ۱۹۲۳ء۔۱۶ر اگست ۱۹۹۷ء)

پروفیسر محمد طفیل دارا یکم اپریل ۱۹۲۳ء میں امرتسر میں میاں لبھو کے ہاں پیدا ہوئے۔ان کے والدِ گرامی ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔۱۹۳۷ء میں سکول میں آٹھویں کلاس میں داخلہ ہوا۔۱۹۳۹ء میں انھوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور ایف اے ۴۱۔۱۹۴۰ء میں پاس کیا۔ ایف اے کے دوران انھوں نے منشی فاضل اور ادیب عالم کے امتحانات بھی پاس کیے۔اس کے بعد انھوں نے ملازمت اختیار کر لی۔قیامِ پاکستان کے بعد طفیل دارا ہندوستان سے ہجرت کر کے لاہور تشریف لے آئے۔پرائیویٹ طور پر بی اے کا امتحان پاس کیا۔۱۹۹۲ء میں ایم اے اردو کیا۔۱۹۵۴ء وطن اسلامیہ ہائی سکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کا آغاز کیا اس کے بعد وہ ایم اے او کالج لاہور میں بحیثیت اردو پروفیسر تعینات ہوئے۔محمد طفیل دارا صدر شعبہ اردو اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور بھی تعینات رہے۔ان کی متعدد کتب میں ''لاشریک'' (حمد)، ''المزمل'' (نعت)، ''بعد از خدا (نعت)، کرنوں کی پھوار''، ''جشن ظلمات''، ''تیشہ فرہاد''، '' پیام اقبال''، ''اقبال اور نسوانی حسن'' اور ''اقبال کا مردِ مومن'' شامل ہیں۔طفیل دارا نے عرق ریزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ''اقبال اور نسوانی حسن'' کتاب تحریر کر کے ایک دل چسپ موضوع کا انتخاب کیا ہے۔اُنھوں نے اقبال کی شخصیت کے ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، جن کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ کتاب کا سرورق بھی کتاب کی طرح رنگین ہے۔اس کتاب کو مختلف مضامین میں تقسیم کرنے کے بجائے ایک ہی موضوع یعنی ''اقبال اور نسوانی حسن'' کو نکتۂ اظہار بنایا گیا ہے۔یہ طویل مضمون پوری

کتاب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

طفیل دارا ۱۶/ اگست ۱۹۹۷ کو لاہور میں انتقال کر گئے انھیں میانی صاحب لاہور دفن کیا گیا۔ اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال اورنسوانی حسن

پبلشرز: آئینہ ادب چوک مینار انارکلی لاہور، اشاعت اپریل ۱۹۸۳ء، صفحات ۶۴، قیمت ۱۰ روپے

ooo

ظہورالدین احمد، ڈاکٹر

(۱۳؍اکتوبر۱۹۱۴ء۔۱۲فروری۲۰۱۴ء)

ڈاکٹر ظہورالدین احمد برعظیم پاک و ہند کے نامور دانش ور، محقق، ماہر تعلیم، فارسی سکالر، اور مصنف کے حوالے سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ وہ ۱۳؍اکتوبر۱۹۱۴ء کو امرتسر میں پیدا ہوائے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ اپنے والد منشی جان محمد کے ہمراہ لاہور تشریف لے آئے۔ فارسی ادب پر دسترس کی وجہ سے انھیں گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ فارسی میں ملازمت مل گئی۔ وہ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۷۱ء تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی پڑھاتے رہے۔ بطور صدر شعبہ اردو ریٹائرڈ ہوئے۔ انھوں نے اوری اینٹل کالج لاہور میں تدریس کے دوران فارسی ادب پر عالمی شہرت حاصل کی۔ وہ بہت سی اردو، فارسی کتب کے مصنف، مرتب اور مترجم رہے۔ پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ اور ارتقاء کے لیے ایک طویل عرصہ تک تحقیقی کام کیا۔

عرصۂ دراز سے تصنیف و تالیف اور تراجم کے سلسلہ میں مقبول عام ہیں انھیں عربی، اردو، فارسی حتیٰ کہ انگریزی پر بھی عبور حاصل ہے۔ فارسی ادب میں ان کا مقام و مرتبہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان کا پہلا ادبی و تحقیقی کام ۱۹۵۷ء میں منظر عام پر آیا۔ مختلف رسائل و جرائد میں ظہورالدین احمد کے شائع شدہ مضامین ''مطالعہ اقبال'' کی صورت ہمارے سامنے ہیں۔ ظہورالدین احمد سمجھتے ہیں کہ علامہ محمد اقبال ایک ایسے نابغہ روزگار تھے کہ جن کے فکر و فلسفہ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی نظم و نثر کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے۔ علامہ محمد اقبال نے اپنے اردو اور فارسی کلام میں لاتعداد ایسی باتیں اور ایسے قرآنی واقعات اور احادیث کو نقل کیا ہے جن کی راہنمائی اور ہدایت سے مسلم امہ کے حالات

واقعات بدل سکتے ہیں۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد ماہر اقبالیات ہیں۔ انھوں نے اقبال کا مطالعہ بڑی عمیق نظری سے کیا ہے۔ انھوں نے اقبال کے فارسی اور اردو کلام کو جس انداز سے دیکھا اور پرکھا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ ایک ایک مصرعہ، ایک ایک شعر اور ایک ایک ترکیب و تلمیح کا بڑی ہی باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے وسعت مطالعہ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ عرب شعراء کے حوالے سے بھی ان کا مطالعہ اور معلومات قابلِ تعریف ہیں۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد کے ادبی سرمایہ میں ''ابوالفضل: احوال و آثار'' (۱۹۷۳ء)، ''نیا ایرانی ادب'' (۱۹۵۷ء)، ''ایران شناسی'' (۱۹۵۸ء)، ''ایرانی ادب حصہ اول دوم (۱۹۹۱ء تا ۲۰۰۳ء)، ''ہشت بہشت'' (تصحیح و ترتیب، ۱۹۸۲ء)، ''عبرت نامہ'' از محمد قاسم عبرت لاہور (تصحیح و حواشی خلاصہ کتاب مقدمہ، ۱۹۷۷ء)، ''رسائل فارسی علامہ دوانی'' (۱۹۹۰ء) شامل ہیں۔

انھوں نے نصائح لقمان کا ترجمہ بھی کیا۔ انھیں جائزہ ادبی، موقوفات افشارِ ایران کے اعزاز سے بھی نوازا گیا۔ وہ ۱۲؍فروری ۲۰۱۴ء کو رحلت فرما گئے اور انہیں لاہور میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے کتاب کے آغاز میں علامہ محمد اقبال کا تعارف دیا ہے۔ اس تعارف نامے میں اقبال کی سوانح، تعلیم، خودی، بے خودی، تصوف، مومن، مردِ حُر، مردِ حق، مردِ کامل یا انسان کامل، عشق، اقبال اور قرآن، ملا، قلندر، فرنگ، اقبال کا نظریۂ فن، نظریۂ شعر، غزل فارسی، مثنوی، دوبیتی، اور اسلوبِ بیان پر سیر حاصل گفت گو کی ہے۔ ان کی کتاب ''مطالعۂ اقبال'' کا حوالہ یہ ہے۔

مطالعۂ اقبال

پبلشر: الفیصل ناشران و تاجران، لاہور، اشاعت: جنوری ۲۰۰۷ء، صفحات: ۱۶۸، قیمت ۱۵۰ روپے

ooo

عابد علی عابد، سیّد

(۱۹۰۶ء۔۱۹۷۱ء)

سید عابد علی عابد ۱۹۰۶ء میں ڈیرہ اسماعیل خان میں پیدا ہوئے۔ اُردو زبان وادب کے ممتاز اور مشہور محقق، نقاد، ادیب، ڈرامہ نگار، مترجم، فیچر نگار، مدیر اور ماہرِ تعلیم اور ماہرِ اقبالیات تھے۔ ان کے والدِ گرامی فوج میں ملازم تھے بسلسلہ ملازمت ڈیرہ اسماعیل خان میں بھی مقیم رہے۔ انھیں دادا کے پاس لاہور بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ مشن ہائی سکول رنگ محل میں داخل ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک کرتے ہی باپ نے اسے ڈیرہ اسماعیل خان واپس بلایا اور ایک سکول میں استاد ملازمت دلوادی۔ عابد علی عابد میں پڑھنے کا ذوق بہت تھا یہی وجہ ہے کہ وہ پرائیویٹ طور پر امتحانات دیتے رہے اور آگے بڑھتا رہے۔ ۱۹۲۲ء میں منشی فاضل اور ۱۹۲۳ء میں بی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ پھر انھوں نے لا کالج میں داخلہ لیا اور دو سال بعد فرسٹ ڈویژن میں ایل ایل بی کے امتحان میں کامیابی پائی۔ ۱۹۳۰ء میں ایم اے فارسی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ شادی کے بعد انھوں نے کچھ عرصہ گجرات میں وکالت بھی کی جو کامیاب نہ رہی مگر تصدق حسین اور موسیقار رفیق غزنوی جیسوں کی صحبت نصیب ہوگئی۔ عابد علی عابد نے ۱۹۳۲ء میں دیال سنگھ کالج لاہور میں بطور جزوقتی لیکچرر ملازمت شروع کی اور پانچ سال بعد مستقل لیکچرر بن گئے۔ ۱۹۴۷ء میں ان کا تقرر بطور پرنسپل ہوا لیکن کالج چلانے والے ٹرسٹ سے اختلافات کے باعث ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اسی دوران وہ شاعر، نقاد، اور استاد کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے۔ بے روزگاری کے باعث انھوں نے قلم کاری کو ہی پیشہ بنایا اور ریڈیو کے لیے ڈرامے اور فیچر لکھنے سے لے کر کتابوں کے تراجم اور تحریر تک سبھی کچھ کیا۔ ۱۹۵۷ء میں مجلس ترقی ادب نے مجلّہ ''صحیفہ'' جاری کیا تو عابد علی عابد

کے مدیر بنے۔ ۱۹۶۲ء میں مجلس نے انھیں باقاعدہ ملازمت دے دی۔ یہ تعلق ان کی موت تک قائم رہا۔
انھوں نے شاعری کا آغاز بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں ہی کر دیا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں پندرہ روزہ ''ہزار داستان'' اور ہفتہ وار ''نونہال'' کا اجراء ہوا تو عابد علی عابد ان کے لیے بھی مضامین وغیرہ لکھتے رہے۔ وہ باقاعدگی سے ان پرچوں کے علاوہ دیگر پرچوں میں مضامین اور نظمیں لکھتے رہے۔ ان کے دو شعری مجموعے ''شب نگار بنداں'' (۱۹۵۵ء) اور بریشم عود'' (۱۹۶۶ء) جب کہ لاہور کے ایک ادارے نے ۱۹۹۳ء میں ''میں کبھی غزل نہ کہتا'' شائع کیا۔ اس نے کچھ عرصہ افسانہ نگاری بھی کی اور چار افسانوی مجموعے اردو ادب کو دیے، جن میں ''حجاب زندگی اور دیگر افسانے'' (۱۹۲۳ء) ''قسمت اور دوسرے افسانے'' (۱۹۳۲ء)، ''طلسمات'' (۱۹۳۶ء) اور ''داغ ناتمام'' (۱۹۵۰ء) شامل ہیں۔ ان کے: ول دراصل ریڈیائی نوعیت کے ہیں اور ڈراموں کی مانند ریڈیو سے قسط وار نشر ہوتے رہے اور بعد ازاں کتابی صورت میں بھی منظر عام پر آئے ''چاندنی'' (۱۹۴۴ء) ''شمع'' (۱۹۴۷ء)، ''دکھ سکھ'' (۱۹۴۹ء) اور سہاگ (۱۹۴۹ء)۔ تراجم کے میدان میں بھی عابد علی عابد نے گراں قدر کام انجام دیا ہے جس میں ادب اور فلسفہ دونوں شامل ہیں۔ مثلاً پیئر لوئی کا ''ایفروڈائٹ'' (۱۹۳۷ء) سنکلیئر لوئس کا ''Dodsworth'' (۱۹۵۸ء)، والٹر لارڈ کا ناول ''A Night to Remember'' (۱۹۵۹ء) ول ڈیورانٹ کی مشہور کتاب ''اے سٹوری آف فلاسفی'' (۱۹۶۳ء) اور ایلن ڈاؤنز کی ''Recent American Drama''
شاعری افسانے، ناول اور تراجم لکھنے کے باوجود بحیثیت نقاد عابد علی عابد کا کام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ اس کی تنقید کی کتب شائع ہونے کا آغاز ۱۹۵۶ء میں ''انتقاد'' سے ہوا جو متفرق تنقیدی مضامین کا مجموعہ تھا۔ ان کی تواتر کے ساتھ مندرجہ ذیل کتب سامنے آئیں۔ ''اصولِ انتقاد اور ادبیات'' (۱۹۶۰ء)، ''شعر اقبال'' (۱۹۵۹ء)، ''تلمیحات اقبال''، (۱۹۷۱ء)، ''البدیع'' (۱۹۸۵ء)، ''البیان'' (۱۹۸۹ء) اور ''مقالات عابد'' (۱۹۸۹ء) نیز انھوں نے نصابی و درسی کتب بھی تدوین کیں، جیسے ''راہبرِ ادب'' (۱۹۳۵ء) ''اُردو نظمیں'' (۱۹۶۰ء) اور گنجینۂ ادب''۔ سید عابد علی عابد ۱۹۷۱ء کو دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی اقبالیاتی کتب یہ ہیں:

تلمیحاتِ اقبال

پبلشرز: بزم اقبال لاہور، اشاعت: دسمبر ۱۹۸۵ء، صفحات ۸۲۲، قیمت ۹۰ روپے

شعرِ اقبال (اقبال کے شعور تخلیق کا جائزہ)

پبلشرز:، بزم اقبال۔ لاہور، اشاعت: جون ۱۹۷۷ء (طبع دوم)، صفحات: ۴۳۹، قیمت ۳۵ روپے

عاشق حسین بٹالوی

(۱۹۰۳ء۔ ۱۷ر جولائی ۱۹۸۹ء)

عاشق حسین بٹالوی ۱۹۰۳ء میں بٹالہ ضلع گورداسپور میں آغا غلام اکبر خان کے ہاں پیدا ہوئے۔ عاشق حسین بٹالوی نے ادیب، مورخ، محقق، شاعر، دانش وراور افسانہ نگار کی حیثیت سے اُردو ادب میں خوب شہرت پائی۔ اعجاز حسین بٹالوی کے بڑے بھائی تھے۔ عاشق حسین بٹالوی نے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کی تحریکِ پاکستان کے حوالے سے خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۹ء میں انھیں گولڈ میڈل سے سرفراز کیا گیا۔

ان کی کتابوں میں ''اقبال کے آخری دوسال''، ''سوز ناتمام (افسانے)، ''ہماری قومی جدو جہد''، ''چند یادیں چند تاثرات''، ''تاریخ اور افسانہ''، سقوط سلطنت برطانیہ (انگریزی)

ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۶۷ء میں حکومتِ پاکستان نے انھیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔ اقبالیات کے حوالے سے ان کی کتاب ''اقبال کے آخری دوسال'' نہایت اہم ہے۔ ادبی حلقوں میں اس کو خوب سراہا گیا۔

عاشق حسین بٹالوی بہت خوش بخت ہیں، جنھوں نے اقبال کے ساتھ بہت سا وقت گزارا۔ ان کی یہ کتاب ''اقبال کے آخری دوسال'' ایک ایسی کوشش ہے جو قاری کے دل میں اقبال سے محبت دو چند کر دیتی ہے۔ بہت سے محققین نے اقبال کی زندگی کے آخری دور کو جو کہ نہایت اہمیت کا حامل تھا، نظر انداز کر دیا، یہ علامہ کی زندگی کے آخری دوسال تھے، جس میں قومی جدو جہد میں اقبال کا کردار بھر پور انداز میں سامنے آیا۔ جیسا کہ کلام اقبال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سیاسی فکر اور قانونی بصیرت کے

حامل تھے، اس لیے آخری دو سال کے لمحات کا احاطہ بہت ضروری ہے۔

عاشق حسین بٹالوی نے یہ کتاب مرتب کر کے ان حالات کی نشاندہی کی ہے جن میں مسلمانوں نے کانگریسی وزارتوں کے زیرِ اثر کسمپرسی کے دن گزارے۔ مسلم لیگ کی الیکشن میں ناکامی کے محرکات، محمد علی جناح کے لیے علامہ اقبال کے مشورے، ۱۹۳۵ء کے انڈین نیشنل ایکٹ کے اثرات، چودھری رحمت علی کے تجویز کردہ نام ''پاکستان'' کے قیام کا خواب اور اسی قسم کی سوچ علامہ اقبال کے آخری ایام میں ان کے لیے محشرِ خیال رہی۔ اقبال کے خطوط بنام جناح کتاب کا محاصل ہے۔ حواشی و تعلیقات نے کتاب کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ یہ کتاب تاریخ، سیاسیات، ادب اور اقبالیات سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ کتاب کا انتساب ملک برکت علی کے نام ہے۔ ''اقبال کے آخری دو سال'' عاشق حسین بٹالوی کی ایسی محنت ہے جس کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جاتا رہے گا۔

عاشق حسین بٹالوی ۷ار جولائی ۱۹۸۹ء کو لندن میں رحلت فرما گئے۔ انھیں ماڈل ٹاؤن قبرستان، لاہور میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال کے آخری دو سال

پبلشرز: سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، اشاعت ۱۹۸۹ء، صفحات ۱۰۷، قیمت ۲۱۰ روپے

OOO

عالم خوندمیری، پروفیسر

(۱۴ر اگست ۱۹۲۲ء۔اپریل ۲۰۰۰ء)

پروفیسر ڈاکٹر عالم خوندمیری ۱۴ر اگست ۱۹۲۲ء کو حیدر آباد (آندھرا پردیش، بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ممتاز ماہر تعلیم، ادیب، دانش ور تھے۔ ان کا خاندان علم و آگہی اور سلسلۂ رُشد و ہدایت کے حوالے سے خاصی شہرت رکھتا تھا۔ ایم اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر صاحب نے حیدر آباد اسٹیٹ بنک میں ملازمت اختیار کی۔ بعد ازاں وہ عثمانیہ یونی ورسٹی میں درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر عالم خوندمیری نے ''علامہ اقبال کے تصورِ زمان'' پر مقالہ تحریر کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس دوران عالم خوندمیری علم تفسیر و فقہ کی تعلیم مولانا سید شاہ قطب الدین صابری سے حاصل کرتے رہے۔ جرمنی، مصر، بیروت، نیویارک کی مختلف یونی ورسٹیوں میں لیکچر اور مقالہ جات دیتے رہے۔ ان کے کئی مقالات اخبارات کی زینت بنے۔ ان کے مضامین کو دنیا بھر میں سراہا گیا۔ مہدی ارسلان ان کا بیٹا ۸ ستمبر ۱۹۵۸ء کو پیدا ہوا۔ عالم خوندمیری کینسر کے مرض میں مبتلا رہے اور آخر کار اس مرض کے سامنے ہار گئے اور وہ اپریل ۲۰۰۰ء میں وفات پا گئے۔

پروفیسر عالم خوندمیری نے بعض مشکل ترین موضوعات کو نہایت سادہ اور آسان زبان میں قاری کے لیے پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے سرسید احمد خان کے دور سے اقبال تک کے ذہنی سفر کو نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ جس مشن اور سوچ کو لے کر سرسید نے مسلمانوں کی حالت زار بدلنے کی کوشش کی تھی اقبال نے اُسی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ پروفیسر

عالم خوندمیری اقبال کے بعض مخفی گوشوں کو قارئین کے سامنے لانے میں کامیاب و کامران ہوئے ہیں۔

اقبال: انسانی تقدیر اور وقت

ناشر: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، اشاعت: ۲۰۱۰ء، صفحات: ۱۶۶، قیمت ۱۵۰ روپے

OOO

عبادت بریلوی، ڈاکٹر

(۱۴ راگست ۱۹۲۰ء۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۹۸ء)

اُردو ادب سے دل چسپی رکھنے والوں میں کون ہے، جو ڈاکٹر عبادت بریلوی کے نام سے واقف نہیں بہ حیثیت ادیب اور نقاد ان کی تمام تصانیف کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ خادم اُردو ڈاکٹر عبادت بریلوی یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں ایک عرصہ تک پیشہ تدریس سے منسلک رہے۔ انھیں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور محسن اردو ڈاکٹر سید عبداللہ کے ساتھ نفاذ اردو کی تحریک میں حصہ لینے کا شرف حاصل ہے۔ انھوں نے قومی زبان اردو کی عبادت سمجھ کر خدمت کی اور یوں اسم بامسمّٰی ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اردو تنقیدی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی شاعری پر تو لاتعداد کتب منظر عام پر ہیں لیکن نثر کے حوالے سے اہم کتب میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتاب ''اقبال کی اردو نثر'' کو معتبر سمجھا جاتا ہے۔ ''اقبال کی اردو نثر'' میں ڈاکٹر عبادت بریلوی نے نہ صرف علامہ اقبال کی نثر کو موضوع بنایا ہے بل کہ ان کی نثر کی خصوصیات اور اسلوب کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

عبادت بریلوی کا شمار محبانِ اُردو میں ہوتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی تحریک سے وابستہ رہے۔ انھوں نے نفاذ اردو کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ یومِ اقبال کے سلسلہ میں منعقدہ تقاریب میں ان کی شرکت کو یقینی سمجھا جاتا تھا۔ حکیم محمد سعید کی شام ہمدرد میں بھی انھوں نے اقبال کے حوالے سے مقالات پڑھے۔ راقم الحروف (ہارون الرشید تبسّم) کو ان سے ملنے اور ان کی بزم میں شرکت کا موقع ملا۔

ان کی اقبالیاتی کتب کے تذکرے درج ذیل ہیں۔

جشنِ اقبال

پبلشرز یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور، اشاعت ۱۹۷۹ء، صفحات ۷۲

اقبال کی اُردو نثر

پبلشرز: مجلس ترقی ادب لاہور، اشاعت: نومبر ۱۹۷۷ء، صفحات ۳۰۰، قیمت: ۳۸ روپے

اقبال اوراحوال وافکار

پبلشرز: مکتبہ عالیہ، لاہور، اشاعت: باراول ۱۹۷۷ء بار دوم ۲۰۰۹ء، صفحات: ۱۷۲، قیمت ۱۷۵ روپے

OOO

عبدالحمید عرفانی، ڈاکٹر، خواجہ

(۶ نومبر ۱۹۰۷ء۔ ۱۱ مارچ ۱۹۹۰ء)

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی ۶ نومبر ۱۹۰۷ء مغلاں والی ضلع سیال کوٹ میں خواجہ محمد دین کے ہاں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی نے بحیثیت شاعر، ادیب، ماہرِ اقبالیات، ماہر تعلیم خوب شہرت پائی۔ درس وتدریس کو پیشہ اپنایا۔ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں بطور پرنسپل ۶۸۔۱۹۷۲ء تک تعینات رہے۔ پریس و کلچرل اتاشی پاکستان ایمبسی ایران میں ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۵ء۔ ۱۹۴۶ء تا ۱۹۵۸ء خدمات انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی نے علامہ محمد اقبال کو ایران میں متعارف کروانے میں فعال کردار ادا کیا۔ فارسی مجلّہ ''ہلال'' کراچی کے مدیر (۱۹۵۸۔۱۹۵۵ء) بھی رہے۔ ٹینس کے عمدہ کھلاڑی تھے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت ایران کی طرف سے انھیں ''نشانِ سپاس درجہ اول'' جب کہ حکومت پاکستان کی طرف سے ''ستارۂ امتیاز'' سے سرفراز کیا گیا۔

ان کی معروف کتب میں ''افغانی، اقبال واتحاد اسلام''، ''رومی عصر''، ''کشمیر در شعر فارسی''، ایران صغیر: کشمیر''، ''شرح احوال و آثار ملک الشعراء بہار''، ''اقبال ایرانیوں کی نظر میں''، ''فارسی ترجمہ ضربِ کلیم''، ''داستانہای عشقی پاکستان''، ''سرود سرمد''، ''مولوی الف دین نفیس''، ''اقبال ایران'' شامل ہیں۔

''فارسی ترجمہ ضرب کلیم وشرح احوال اقبال'' ایرانیوں کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے۔ خواجہ صاحب نے فارسی ترجمہ کے لیے اقبال کو ایرانیوں تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی طرح ایک اور اہم کتاب ''اقبال ایرانیوں کی نظر میں'' خواجہ عبدالحمید عرفانی کا مرتب کردہ شاہ کار

ہے۔ کتاب میں اقبال کے متعلق ایرانی اقبال شناسوں کے نذرانۂ عقیدت نظم ونثر کی صورت شامل ہیں۔ مرتب نے یہ تحقیقی شہ پارے ایران میں اپنے سات سالہ قیام کے دوران جمع کیے۔

اس کتاب کی وجہ سے ایران کے ادبی حلقوں میں خواجہ عبدالحمید کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ کتاب تیس (۳۰) ابواب پر مشتمل ہے جن میں اقبال کے متعلق مختلف ایرانی اقبال شناسوں کے تاثرات ہیں۔ ان میں مختلف مقالات، خطبات سے انتخابات اور قصائد شامل ہیں۔

کتاب میں مختلف تصاویر بھی دی گئی ہیں جو مختلف تقریبات اقبال میں ایران کے معززین کی تقاریر کرتے ہوئے اور ایران کے بڑے شعراء کی تصاویر ہماری معلومات میں اضافہ کا باعث ہیں۔ خاص طور پر ملک الشعراء بہار، سید محیط طباطبائی، سید تقی زادہ، اور ایران کے ملی شاعر صادق سرمد کی قیمتی تصاویر کتاب کو مزید پرکشش بناتی ہیں۔ مرتب نے ایران میں اقبال کو ہر دلعزیز بنانے میں جو کردار ادا کیا ہے، کتاب پڑھ کر اس کارنامے کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے ایران جانے سے پہلے ایران میں اقبال کے بارے میں لوگوں کو اتنی معلومات نہیں تھیں۔ یہ حمید عرفانی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ایران میں اقبال شناسی کو فروغ حاصل ہوا۔ حواشی اور تعلیقات کے اضافہ نے اس کی اہمیت کو دوچند کر دیا ہے۔ شعراء ایران اور ڈاکٹر علامہ اقبال کی فکری ہم آہنگی سمجھنے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی نے اقبال کو ایران میں متعارف کروانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھا۔ انھوں نے اردو کلام کا فارسی ترجمہ کر کے ایرانیوں کے لیے پیش کرتے رہے، جب کہ ان کے خیالات کو اردو سانچے میں ڈھال کر پاکستانیوں اور اردو طبقہ کے لیے پیش کر کے ایک بہت بڑی علمی وادبی خدمت انجام دی ہے۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی ۱۱ مارچ ۱۹۹۰ء کو سیالکوٹ میں انتقال کر گئے۔

ترجمہ فارسی : ضرب کلیم و شرح احوال اقبال

ناشر: اقبال اکادمی کراچی، اشاعت ۱۹۵۷ء، صفحات ۱۶۰، قیمت: ۹ روپے

اقبال ایرانیوں کی نظر میں

پبلشرز: اقبال اکادمی کراچی، اشاعت: اپریل ۱۹۵۷ء، صفحات: ۳۷۷، قیمت: ۱۰ روپے آٹھ آنے

○○○

عبدالرؤف عروج

(۱۹۳۲ء۔ ۷ امئی ۱۹۹۰ء)

عبدالرؤف عروج ۱۹۳۲ء میں اورنگ آباد، مہاراشٹر میں پیدا ہوئے۔ پاکستان بننے کے بعد لاہور اور پھر کراچی میں سکونت اختیار کی۔ انھوں نے کئی اخبارات میں کام کیا۔ مثلاً روزنامہ امروز، مشرق، انجام، حریت، اور ماہنامہ نیاراہی۔ تصانیف میں درج ذیل قابلِ ذکر ہیں۔ اردو مرثیہ کے پانچ سو سال، بزمِ اقبال، رجالِ اقبال، خسرو اور اہلِ خسرو، اقبال اور بزمِ اقبال، میر اور اہلِ میر اور فارسی گوشعرائے اردو۔ عبدالرؤف عروج کا ایک شعری مجموعہ "چراغ آفریدم" کے نام شائع ہو چکا ہے۔

شاعر وادیب، صحافی، محقق اور ممتاز ادیب عبدالرؤف عروج کراچی کے ادبی حلقوں میں بہت مقبول رہے۔ ان کی ادبی شہرت ان کے تخلیقی کام کی وجہ سے ہے۔ ممتاز نقاد مشفق خواجہ نے ایک ملاقات پر ان کے بارے میں بہت سے تعریفی کلمات ارشاد فرمائے۔ "رجال اقبال" ان کی تحقیق اور عرق ریزی کا شاہکار ہے۔ جس میں انھوں نے ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کی تحریروں، تقریروں، نجی ملاقاتوں اور بیانات کی روشنی میں ان کے معاصرین، عقیدت مندوں، احباب، دوست اور پرستاروں کا اجمالی تعارف پیش کیا ہے۔ اقبالیاتی کتب کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

رجالِ اقبالؒ

پبلشرز: نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی، اشاعت: مارچ ۱۹۸۸ء، صفحات ۵۱۶، قیمت ۱۵۰ روپے

اقبال اور بزمِ اقبال (حیدر آباد دکن)

پبلشرز: دارالادب، پاکستان، کراچی، اشاعت: ۱۹۷۸ء، صفحات: ۱۶۴، قیمت: ۱۸ روپے

عبدالسّلام خورشید، ڈاکٹر

(۱۲؍اگست ۱۹۱۹ء۔ ۱۱فروری ۱۹۹۵ء)

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ۱۲؍اگست ۱۹۱۹ء بٹالہ ضلع گورداس پور میں مولانا عبدالمجید سالک کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کے والدِ گرامی مولانا عبدالمجید سالک ''انقلاب'' کے مدیر رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے ایک علمی وادبی گھرانے میں پرورش پائی۔ لفظ وقرطاس سے رشتہ ایک فطری عمل تھا۔ اور یہ رشتہ انھوں نے مرنے تک نبھایا ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کئی محاذوں پر برسرِعمل رہے اور ہر میدان میں کامیابی کے پرچم بلند کیے۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ممتاز صحافی، محقق اور کارکن تحریک پاکستان بھی تھے۔ انھوں نے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا درس وتدریس سے بھی وابستہ رہے وہ سابق صدر شعبہ صحافت پنجاب یونی ورسٹی لاہور رہے اور صحافت کے اسرار و رموز طالب علموں کو سکھاتے رہے۔ اس کے علاوہ بانی سیکرٹری پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (۱۹۳۷ء) رہے۔

ان کی مشہور کتب میں ''رو میں ہے رخش عمر''، سرگزشت اقبال''،'' وے صورتیں الٰہی''، ''دنیائے اسلام کی صحافت''،''صحافت پاکستان و ہند میں''،''کاروان صحافت''،''تاریخ نظریہ پاکستان'' اور''آج کا مصر'' شامل ہیں۔

حکیم الامت علامہ اقبال پر بہت سی سوانح عمریاں لکھی گئیں ہیں لیکن ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی تحریر کردہ ''سرگزشتِ اقبال'' کا انداز بہت منفرد ہے۔ اقبال کا سلسلہ ہائے روز و شب اس کتاب میں قاری کے ساتھ مثل ماہتاب چلتا ہے۔ مولف نے حیات اقبال کو ایک سفر کی مانند پیش کیا

ہے۔ یہ سفر خاندانی تعلیم وتربیت سے لے کر موت کے دروازے تک پہنچتا ہے۔ یہ کتاب ۳۸/ابواب پر مشتمل ہے جس میں علامہ اقبال کی زندگی کے تمام گوشوں کے بارے میں معلومات کا ایک خزینہ موجود ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں عبدالسلام خورشید رقم طراز ہیں :

"یہ کتاب صرف میری کوششوں کا نتیجہ نہیں اس میں ان نامی گرامی ماہرین اقبالیات اور دوسرے محققین کی مدد بھی شامل حال ہے جنھوں نے حضرت علامہ اقبال کی بے شمار تحریروں، تقریروں، بیانات اور مکاتیب کو بڑی تلاش اور کرید کے بعد مجموعوں کی صورت میں یک جا کر دیا۔ میں نے اس سے پورا استفادہ کیا اور ان پر مستزاد، اقبال کے ہم عصر اخباری مآخذ کی چھان بین خود بھی کی اور کوشش کی کہ حضرت علامہ کی زندگی کا کوئی پہلو نظر سے اوجھل نہ رہے بہر حال میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں کہ یہ کتاب اقبال کی سوانح پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے اور سچ پوچھیے تو علم کی دنیا میں کوئی کاوش بھی حرف آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی کیوں کہ تحقیق کا عمل جاری رہے تو نت نئے افق سامنے آتے رہتے ہیں۔"

اقبالیاتی ادب میں ان کی یہ ایک اہم دستاویز ہے جسے ادبی حلقوں نے بہت سراہا ہے۔ اقبالیاتی ادب میں اسے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کو بھی یاد کیا جاتا رہے گا۔ ان کی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

سرگزشتِ اقبال

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت ۱۹۷۷ء، صفحات: ۶۱۱

ooo

عبدالصبور طارق

(-----۔۲۶دسمبر ۱۹۹۰ء)

سید عبدالصبور طارق اردو کے شاعر اور ادیب، مؤرخ تھے۔تحریک پاکستان کے کارکن بھی تھے۔ انھوں نے تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کئی کتابیں تصنیف کیں اور کئی کتابوں کے مؤلف بھی تھے۔ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔ ان کی وفات ۲۶ دسمبر ۱۹۹۰ء کو لاہور میں ہوئی اور انھیں میانی صاحب کے بڑے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

عبدالصبور طارق کی علامہ محمد اقبال پر ایک کتاب ''علامہ اقبال اور قرونِ اولیٰ کے مسلمان مجاہدین'' کے عنوان سے ہے؛ جس میں انھوں نے مسلمانوں کی صفات اور ان کے کارناموں کو اقبال کی شاعری کے حوالے سے اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کی مسلم امہ اور مجاہدین اسلام کے ساتھ دلی محبّت کا قابل تقلید ہے۔اقبال شناسی کا یہ اہم موضوع جس کامیابی کے ساتھ عبدالصبور طارق نے نبھایا ہے، یہ انھی کا حصہ ہے۔انھوں نے کتاب کو۱۲؍ابواب میں تقسیم کر کے ان میں جزوی موضوعات پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ پہلے باب میں مسلمانوں کی سیرت وکردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا باب، مسلمان سپہ سالاروں کے اخلاق وکردار پر مبنی ہے۔ تیسرے باب میں مجاہدین اسلام کے مافوق الفطرت واقعات شامل کیے ہیں، جن کے مطالعہ سے ہمارا ایمان تازہ ہوجاتا ہے۔ چوتھے باب میں قرونِ اولیٰ کے مسلمان مجاہدین کا ضابطۂ اخلاق اور دستور العمل ہے۔نویں باب میں مسلمان مجاہدین کے دوسری قوموں کے ساتھ عہد ناموں کا ذکر ہے اور بارہویں باب میں قرونِ اولیٰ کے

مسلمان مجاہدین کی فتوحات کا، جذبہ شہادت اور ایمانی حرارت سے تسخیر کائنات کی دعوت ملتی ہے۔ ان ابواب کے مطالعے سے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی صفات کے ساتھ ساتھ تاریخ اسلام سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ان کی اقبال کے حوالے سے کتاب کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

علامہ اقبال اور قرونِ اولیٰ کے مسلمان مجاہدین

پبلشرز: فیروز سنز، لاہور، طباعت: باراول ۱۹۸۸ء، قیمت ۱۰۰ روپے، صفحات ۳۶۶

○○○

عبداللہ، ڈاکٹر، سید

(۱۹۰۶ء۔۱۹۸۶ء)

پاکستان اسلام اور اردو کے نام پر حاصل کیا گیا۔قیامِ پاکستان کے بعد جن لوگوں نے قومی زبان کے فروغ اور ملک میں اس کے نفاذ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان لوگوں میں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کا نام سرفہرست ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد آپ کو ''بابائے اُردو''، ''محسن اردو'' اور ''قائد اردو'' کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن گلزار اردو میں انھوں نے اپنی محنت شاقہ سے جو پھول اگائے تھے،اس کی خوش بو سے بہی خواہان اردو کے اذہان معطر ہیں اور ملک کے در و بام سے سید عبداللہ کی خدمات جلیلہ فضاؤں میں محوِ پرواز ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۹۰۶ء میں ہزارہ ڈویژن صوبہ سرحد کی تحصیل اور ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم انھوں نے اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ان کے والدِ گرامی اپنے دور کے ایک نامور عالم دین، ماہر علومِ دینیہ اور حکیم تھے۔ان کے والد کی خواہش تھی کہ یہ بچہ بڑا ہو کر ملک وملت کی خدمت کرے اور قوم کا قابلِ فخر فرزند بنے۔رب کائنات نے ان کی دعا قبول فرمائی اور سید صاحب کی ذات گرامی دلدادگانِ ادب کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوئی۔

مانسہرہ اور ایبٹ آباد میں تعلیم سے فارغ ہو کر سید صاحب لاہور آ گئے اور مولانا احمد علی خطیب جامع مسجد شیراں والا کی شخصیت نے انھیں بہت متاثر کیا۔سید صاحب اکثر درس سنتے اور اہم

باتوں کو تحریر کر لیتے۔ سید صاحب ان کے درس قرآن حکیم سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد سید صاحب علی گڑھ چلے گئے۔ اس وقت جامع ملیہ اسلامیہ علی گڑھ ہی میں تھا، یہاں سید عبداللہ کو مولانا محمد علی جوہر کی صحبت میسر آ گئی۔ مولانا محمد علی جوہر بے باک مقرر، شعلہ بیان شاعر اور نڈر صحافی تھے۔ اس بطل حریت نے سید صاحب کی بھرپور رہنمائی کی۔ ان کے علاوہ انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا سورتی اور مولانا جیراج پوری سے بھی فیض حاصل کیا۔ سید صاحب نے اپنے خیالات زندگی تحریر کرتے ہوئے مولانا سورتی کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مولانا سورتی نے ان کا نظریہ حیات تشکیل کرنے میں بڑا اہم حصہ لیا تھا۔

علی گڑھ سے آپ لاہور چلے گئے اور اورئینٹل کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۲۲ء میں منشی فاضل کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں فارسی میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد پنجاب یونی ورسٹی لائبریری میں بطور فہرست ساز کے ملازم ہو گئے۔ اس دوران انھوں نے عربی اور فارسی کے تمام نسخہ جات کو از سر نو ترتیب دیا اور یہ اتنا بڑا کام تھا جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ ان کے اس کارہائے نمایاں سے قیمتی مسودات ضائع ہونے سے بچ گئے۔

یونی ورسٹی کی لائبریری میں خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ انھوں نے تنقید و تحقیق کا سلسلہ بھی شروع کر لیا۔ یہاں انھیں کتابوں سے بھرپور استفادہ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ۱۹۳۲ء میں ایم اے عربی مکمل کیا اور ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ جو کسی علم کی تدریسی سطح پر سب سے بڑی ڈگری ہے، حاصل کی۔ پھر اپنی ان خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر آپ اورئینٹل کالج میں لیکچرار ہو گئے۔ سید صاحب کی ذاتی کوششوں کی بناء پر ۱۹۴۸ء میں پہلی مرتبہ اردو کلاسز کا اجراء ہوا۔ ملک کے نامور ادیبوں اور شاعروں نے اس ادارے سے ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر مرزا محمد منور، امجد الطاف، قیوم نظر، یوسف ظفر، ریاض احمد، ڈاکٹر ممتاز منگلوری، امجد اسلام امجد اور عطاالحق قاسمی ایسی شخصیات نے ڈاکٹر سید عبداللہ سے اکتسابِ فیض کیا۔

سید عبداللہ بہت خوش قسمت انسان تھے کہ ان کے شاگردوں نے بھی دنیائے ادب میں بہت نام کمایا اور اُن کی پہچان بنے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کو خود بھی مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر محمد اقبال اور پروفیسر حافظ شیرانی جیسی عظیم شخصیات کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ سید عبداللہ اپنے اساتذہ کرام کی بہت

زیادہ عزت کیا کرتے تھے اور تحقیق و تنقید کے میدان میں انھوں نے اپنے اساتذہ کرام سے بہت کچھ سیکھا اور پھر تمام عمر اس پر عمل کرتے رہے۔ استاد اور شاگرد کا مقدس رشتہ سمجھنے کے لیے سید صاحب کی ذاتِ گرامی مشعلِ راہ ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ''اچھا استاد ہمیشہ اچھا شاگرد رہتا ہے۔'' ان سے جب بات ہوتی تو وہ ہمیشہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ ''جب میں طالبِ علم تھا اور اب بھی طالبِ علم ہوں، محنت کیا کرتا تھا'' سید صاحب اپنی تمام تر کامیابیوں میں اپنے اساتذہ کا دل سے احترام کرتے تھے بل کہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ انھوں نے فی الواقع ایک طالب علمانہ زندگی گزاری۔ وہ مسجد کی خدمت ہو یا اسسٹنٹ لائبریرین کی ذمہ داریاں اور اورینٹل کالج میں لیکچررشپ کا عرصہ ہو یا اسی کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے گزارا ہوا زمانہ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی شعوری زندگی کے آغاز سے لے کر اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ کے صدر کی حیثیت سے وفات تک ایک طالبِ علم رہے اور علم کی اعلیٰ ترین منزلوں پر پہنچ کر بھی عالمانہ کبر و نخوت سے انھوں نے اجتناب کیا، بس یوں سمجھیے کہ حصول علم ہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں سید عبداللہ نے اورینٹل کالج کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لی۔ اگرچہ ابھی ان کی ملازمت ختم ہونے کا وقت نہیں آیا تھا۔ وہ اس کالج سے بطور پرنسپل ریٹائر ہوئے۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ اُردو دائرہ معارفِ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے اور وفات تک وہاں خدمات انجام دیتے رہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا سارا کام انھوں نے خود کیا۔ ابھی تھوڑا ہی کام باقی تھا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ شائع شدہ تصنیفات میں ''نقد میر، فارسی ادب میں ہندوؤں کا حصہ۔ اردو نثر ملا وجہی سے عبدالحق تک، اردو شاعری ولی سے اقبال تک، مباحث، اطرافِ غالب، اشاراتِ تنقید، مسائلِ اقبال، مقاصدِ اقبال، معارفِ اقبال، متعلقاتِ اقبال، خطباتِ اقبال، سہل اقبال، پاکستان میں اردو کا مسئلہ، اردو ادب، طیف غزل، تعلیمی خطبات، پاکستان تعبیر و تعمیر، کلچر کا مسئلہ، کم و بیش چودہ مسودات مکمل صورت میں یا کسی حد تک نامکمل حالت میں منظر اشاعت ہیں۔ اردو ادب میں یہ مسودات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ عزیز محترم، فکریات و نظریات، ادب و فن، جدیدیت کے چند رخ، پاکستانیت، اسلام سوشلزم اور سوانحی خاکہ اُردو ادب میں۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کو بہت سے خطابات سے نوازا گیا۔ انھوں نے ملک کی تمام بڑی ادبی

تنظیموں میں شامل ہو کر کارہائے نمایاں انجام دیے۔ سید صاحب اکادمی ادبیات پاکستان کے بنیادی رکن تھے۔ مجلس ترقی ادب کے رکن اور انجمن ترقی اردو کے خصوصی ناظم تھے۔ ۱۹۵۹ء حسن کارکردگی کا صدارتی تمغہ ملا اور اسی سال ایران کی حکومت نے انھیں نشان سپاس دیا۔ مغربی پاکستان اردو اکادمی کے جنرل سیکرٹری رہے۔ مقتدرہ قومی زبان لاہور شاخ کے مشیر تھے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کی پوری زندگی اصولوں کے گرد گھومتی رہی۔ وہ اپنے افکار و خیالات کے اعتبار سے بھی نہایت متوازن اور معتدل شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اردو زبان کو پاکستان کے اتحاد کی ضامن قرار دیتے تھے۔ انھوں نے قومی زبان کو قومی زندگی میں رائج کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیا۔ وہ اپنی بصیرت اور فہم و فراست سے ان رجحانات کا سد باب کرنا چاہتے تھے، جو ملک کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں تھے۔ انھوں نے کبھی دولت اور نام و نمود کے لیے کام نہیں کیا۔ انھوں نے تقریبات کی صدارت اور کتابوں کی رونمائی میں مضامین پڑھنے سے گریز کیا، لیکن ہر لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کے لیے انھوں نے اپنی تحریری رائے کا اظہار ضرور کیا۔

انھوں نے اپنی ساری زندگی اردو ادب کی بے لوث خدمت میں گزاری۔ اردو سے ان کا عشق سب پر آشکار تھا۔ وہ ساری عمر اردو کے لیے افسر شاہی سے لڑتے رہے۔ وہ عام گفت گو اردو میں کرتے۔ انھوں نے اردو کو اس کا جائز حق دلوانے کے لیے متعدد مضامین لکھے۔ بڑی بڑی کانفرنسوں کا انعقاد کروایا۔ ملک کے طول و عرض میں انجمن ترقی اردو کے کارکنوں نے ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اردو کے لیے بھرپور کام کیا۔ قومی سطح پر یہ ایک بڑا کام تھا وہ اردو کو اپنی زندگی کا حصہ سمجھتے تھے اور ہر آنے والے مہمان سے پہلا سوال یہ کرتے کہ "آپ کے شہر میں اردو کا کیا حال ہے۔"

بے لوث اور درویشانہ خصوصیات رکھنے والے سید صاحب نے کبھی اپنا ادبی گروپ بنانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی وہ خود کسی ادبی گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہر حال میں اپنے مشن کو جاری و ساری رکھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب ۱۹۸۶ء کے شروع میں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور اس حملہ کی زد میں ان کی زبان بھی آ گئی تو ڈاکٹروں کی ہدایت پر انھیں ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا لیکن وہ فالج کے باوجود اپنے دفتری امور انجام دیتے رہے۔ اپنے رفقائے کار سے گفت گو لکھ کر کرتے۔ کسی شخص کی اس سے بڑھ کر اور عظمت اور عزم کی پختگی کیا ہو گی کہ اس

کا آدھا دھڑ مفلوج ہے۔ خوراک ایک نالی کے ذریعے ناک کے راستے معدے میں پہنچائی جا رہی ہے اور زبان کام کرنے سے انکار کر رہی ہے اور اس کے چہرے کی شگفتگی اور طبیعت کی مٹھاس اسی طرح برقرار رہے۔

جب بھی کوئی ان کی عیادت کے لیے جاتا۔ وہ ملاقاتی کا ہاتھ چومتے اور پھر مسکراتے ہوئے وکٹری کے نشان کے طور پر اپنا ہاتھ فضاء میں بلند کر دیتے اور کئی دوستوں سے کاغذ اور قلم کی وساطت سے لمبی گفت گو کر لیتے۔ عالمانہ غرور سے اجتناب، طالب علموں جیسی محبّت اور اپنے سے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی ڈاکٹر صاحب کی شخصی عظمت کے مینار تھے وہ محبّت بانٹتے تھے، اور نفرتوں کے خلاف تھے۔ ان کی محبت سب کے لیے تھی اور نفرت کسی کے لیے بھی نہیں تھی۔ ان کا اصلاح کرنے کا انداز بہت ہی مثبت تھا۔ انھوں نے کسی کی انا کو مجروح نہیں کیا اور نہ ہی اپنا قد بلند کرنے کے لیے کسی کی حیثیت کو کم کرنے کی کوشش کی۔

اُن کی شخصی عظمت کا اعتراف تمام مکاتب فکر کی طرف سے ہوا اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب چودہ اگست ۱۹۸۶ء کو ان کا انتقال ہوا۔ اس روز کسی اخبار میں ان کی وفات کی خبر شائع نہ ہوئی کیوں کہ اس روز اخبارات کی چھٹی تھی لیکن اس کے باوجود ان کے چاہنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے ان کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔ بعد ازاں انھیں گلشن راوی کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی نماز جنازہ میں دیگر شخصیات کے علاوہ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جاوید اقبال، جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد، ڈائریکٹر اقبال اکادمی مرزا محمد منور نے شرکت کی۔ ۲۵ اردو نگر۔ اردو منزل نزد سمن آباد موڑ لاہور ان کی اقامت گاہ پر ان کے چاہنے والوں کا ایک جم غفیر تھا، جو ان کے انتقال پر ملک کے تمام علاقوں سے اظہار تعزیت کے لیے جمع تھا۔ صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق، وزیر اعلیٰ پنجاب، میاں نواز شریف، گورنر پنجاب سید سجاد حسین قریشی اور دیگر احباب ان کی اقامت گاہ پر گئے اور پسماندگان سے اظہار افسوس کیا۔ ان کی اقبال کے حوالے سے کتابوں کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

مطالعۂ اقبال کے چند نئے رُخ

پبلشرز: بزمِ اقبال، لاہور، اشاعت: جون ۱۹۸۴ء، صفحات: ۳۳۰، قیمت: ۴۰ روپے

طیف اقبال

پبلشر: لاہور اکیڈمی، لاہور، اشاعت: ۱۹۶۴ء، صفحات ۲۵۶، قیمت ۴ روپے

مسائل اقبال

ناشر: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، اشاعت اول مئی ۱۹۷۴ء۔ طبع دوم جون ۱۹۸۷ء، صفحات: ۳۷۲، قیمت ۴۰ روپے

ooo

عبدالمجید سالک

(۱۸۹۴ء۔۱۹۵۹ء)

عبدالمجید سالک ان خوش نصیبوں میں شامل ہیں جنھیں علامہ اقبال کا قرب حاصل رہا۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال مشاورت کے لیے عبدالمجید سالک کو بہت اہمیت دیا کرتے تھے۔ عبدالمجید سالک اور ڈاکٹر علامہ اقبال کی غیر رسمی گفت گو بھی کئی کتابوں میں شامل ہے۔ وہ عبدالمجید سالک کا شمار ان اقبال شناسوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے کلامِ شاعر بزبان شاعر سے حظ اٹھایا۔ برعظیم پاک و ہند کے نام ور صحافی، ادیب، شاعر، افسانہ نگار، خاکہ، مزاح نگار، مترجم اور کالم نویس تھے۔ عبدالمجید سالک ۱۸۹۴ء کو بٹالہ، ضلع گورداسپور میں غلام قادر کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعالیٰ بٹالے اور پٹھان کوٹ میں ہوئی۔ پھر اینگلو عربیک کالج دہلی سے تکمیل کی۔ بچوں کے لیے بہت سی کتب لکھیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کی دو تین کتابوں کا بھی ترجمہ کیا۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۷ء مولانا ظفر علی خان کے ہمراہ روز نامہ ''زمیندار'' کے عملہ ادارت میں شامل رہا۔ تحریک خلافت میں حصہ لینے کے باعث ۱۹۲۱ء میں ایک سال کی قید کاٹی۔ پھر مولانا غلام رسول کے اشتراک سے روز نامہ ''انقلاب'' (۱۹۲۷ء) جاری کیا جو قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء تک باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ یہ روز نامہ ''انقلاب'' ۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۸ء سے جاری رہا۔ عبدالمجید سالک ''فانوس خیال''، ''پھول''، ''تہذیب نسواں کی ادارت بھی کرتے رہے۔ عبدالمجید سالک کا شعری مجموعہ ''راہ رسم منزلہا'' منصۂ شہود پر آیا۔ ان کی دیگر کتب میں ''ذکرِ اقبال''، ''سرگزشت (خودنوشت)'' ''یارانِ کہن''، ''چمپا اور دوسرے افسانے'' اور ''مسلم ثقافت ہندوستان میں'' شامل ہیں۔
عبدالمجید سالک ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء لاہور میں انتقال کر گئے اور انھیں مسلم ٹاؤن لاہور میں دفن

کیا گیا۔عبدالمجید سالک ممتاز اقبال شناس کے حوالے سے بہت معروف ہوئے۔ان کی کتاب ''ذکرِ اقبال'' بہت مقبول ہوئی۔عبدالمجید سالک کو علامہ اقبال کی صحبت سے بہرہ مند ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کی تحریر میں کشش اور اثر ہے۔''ذکرِ اقبال'' سات ابواب پر مشتمل ہے۔مصنف نے تمام ابواب میں علامہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو موثر، مدلل اور ذاتی تجربات کی روشنی سے مزین کیا ہے۔ہر باب اقبال کی زندگی کا ایک جہان نو ہے۔منفی و مثبت ہر بات کو عبدالمجید سالک نے مختلف حوالوں مشاہدوں اور چشم دید تجربوں سے پیش کیا ہے۔اسلوب نہایت سادہ اور واقعات ترتیب زمانی کے اعتبار سے شامل کیے گئے ہیں۔ہر باب کی حیثیت مسلمہ ہے۔ان کی اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

ذکرِ اقبال

ناشر: بزم اقبال، لاہور، اشاعت: جولائی ۱۹۹۳ء طبع سوم، صفحات: ۳۰۴، قیمت ۸۰ روپے
تازہ ترین ایڈیشن: اشاعت: جہلم بک کارنر، فروری ۲۰۱۶ء

ooo

عبدالمغنی، ڈاکٹر

(۱۹۳۶ء۔۵ستمبر۲۰۰۶ء)

پروفیسر عبدالمغنی ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ان کے والد عبدالرؤف ندوی مشہور عالم دین تھے۔عبدالمغنی کا تعلق صوبہ بہار کے ضلع اورنگ آباد کے ذی علم گھرانے سادات سے تھے۔عبدالمغنی نے ابتدائی تعلیم مدرسہ میں حاصل کی،اس کے بعد انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے انھوں نے پٹنہ یونی ورسٹی سے ایم اے انگریزی کرنے کے بعد انگریزی زبان وادب میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ان کے مقالے کا عنوان تھا "T.S.Eliot's Concept of Culture"،تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد درس وتدریس کا پیشہ اپنایا۔وہ بنیادی طور پر انگریزی زبان وادب کے استاد تھے انھوں نے ایک طویل عرصہ پٹنہ یونی ورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔انھوں نے ہندوستان میں اردو زبان کی ترویج وترقی کے لیے ان تھک محنت کی ہے۔وہ بھارت کی متھلا یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے اور اسی عہدہ سے ریٹائرمنٹ لی۔انھوں نے اردو زبان کے تحفظ اور اس کی ترقی کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔وہ عربی، اردو، فارسی اور انگریزی زبان وادب پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔اس کے علاوہ اسلامی تاریخ،فلسفہ اور دینیات پر انھیں اچھی خاصی دسترس تھی۔وہ ایک جید عالم،انشاپرداز، محقق،نقاد،صحافی،خطیب اور مجاہد اردو تھے۔ان کی بے پناہ کوششوں کے طفیل ریاست بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل سکا۔اردو کے علاوہ انھوں نے جس پر سب سے زیادہ کام کیا وہ اقبال ہے۔اقبال ان کا پسندیدہ موضوع رہا۔وہ اقبال کی شاعری اور فکر کے زبردست مداح اور عاشق تھے اور اس معاملے میں خاصے انتہا پسند واقع ہوئے

تھے۔اقبال کے فکر وفن پر ان کی تنقید اس اعتبار سے بڑی متوازن اور معتدل ہے کہ وہ اقبال کی شاعری میں ان کی فکر کے ساتھ، ان کے فن کو بھی برابر کی اہمیت دیتے ہیں۔عبدالمغنی علامہ اقبال کو عالمی سطح کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے اور یہ ان کی سوچی سمجھی رائے تھی۔

پروفیسر عبدالمغنی بنیادی طور پر ایک بلند پایہ نقاد تھے۔وہ ٹھوس دلائل سے بات کرتے۔وہ ادب میں نظریاتی مباحث میں صرف اپنے پیمانوں پر انحصار کرتے۔دوسروں کے مؤقف کا احترام کرتے لیکن جہاں کہیں اختلاف کی راہ نکلتی ہوانھوں نے کبھی کسی خوف کا مظاہرہ نہیں کیا بل کہ اپنے مؤقف کی کھل کر تائید کی ہے وہ اپنے مؤقف کی صداقت کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھتے۔وہ دنیا کے مختلف ممالک میں ہونے والی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شریک ہوتے رہے۔لاہور میں بھی تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں اورینٹل کالج پنجاب یونی ورسٹی نے ایک شام منانے کا اہتمام کیا۔اس تقریب کے حوالے سے ممتاز شاعر وادیب اور نقاد انور سدید لکھتے ہیں:

''مغنی صاحب نے پاک و ہند کے اردو ادب پر ایک سیر حاصل فی البدیہہ تقریر کی اور پاکستان کے ادیبوں کے نام اور کام کا تذکرہ اس افراط سے کیا کہ شرکائے مجلس ان کے مطالعے کی وسعت پر حیرت زدہ رہ گئے۔اس تقریب میں ہی انھوں نے علامہ اقبال کا شمار دنیا کے عظیم ترین شعراء میں کیا تو ایک ''اقبال شناس'' نے نکتہ اعتراض اٹھایا'' کیا آپ نے دنیا کے سب عظیم شاعروں کو پڑھا ہے؟'' اور مغنی صاحب نے انکساری سے جواب دیا'' میں سب عظیم شاعروں کو پڑھنے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن انگریزی کے حوالے سے میں نے دنیا کا جتنا عظیم ادب پڑھا ہے اقبال اس میں وقیع مقام رکھتے ہیں۔۔۔ان کی روشنی کا ماخذ قرآن حکیم تھا، جس سے بیشتر عالمی شہرت یافتہ شاعروں نے استفادہ نہیں کیا اور وہ دانش کے اس آسمانی ماخذ سے محروم رہ گئے، اقبال نے ان سب پر فوقیت حاصل کرلی۔''

پروفیسر ڈاکٹر عبدالمغنی نے اقبال کو ہمیشہ فوقیت دی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کئی مضامین اور اقبال کے حوالے سے متعدد کتب سامنے آ چکی ہیں جن میں خاص طور پر ''اقبال اور عالمی ادب''، ''اقبال کا نظام فن''، ''نقطہ نظر ـــ تنویر اقبال''، ''اقبال کا ذہنی ارتقاء''، اور ''شاعر اقبال'' (انگریزی)۔ ڈاکٹر عبدالمغنی ادب میں اخلاقی نقطہ نظر کے فروغ کے حامی نقاد تھے۔ڈاکٹر عبدالمغنی اسلامی سوچ رکھنے والے ایسے نقاد تھے، جو اخلاقیات کو ترجیح دیتے تھے۔ان کے نزدیک جس ادب میں اخلاقی سبق نہ ہو

وہ فن پارہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ انھیں اقبال اسی لیے پسند تھا کہ اقبال اخلاقیات کا درس دیتے ہیں وہ اسلامی نقطہ نظر کی بات کرتے ہیں۔ وہ اردو کے ایک بلند پایہ نقاد، ادب شناس، دانش ور اور ماہر اقبال تھے۔ انھوں نے اقبال کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ انھوں نے سیکڑوں مضامین بھی لکھے جو مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ وہ اسلامی نظریات کے علم بردار اور ہندوستان میں اردو زبان وادب کے ترجمان تھے۔ عبدالمغنی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں غالب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ حکومت بہار کے محکمہ راج بھاشا کی جانب سے بھی انھیں انعام پیش کیا گیا۔ وہ بہت سی علمی، تعلیمی اور ادبی انجمنوں سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالمغنی ۵ ستمبر ۲۰۰۶ء کو پٹنہ (بھارت) میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے تھے۔ ان کی وفات کے وقت عمر ۷۰ برس تھی۔ ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال اور عالمی ادب

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت طبع اول ۱۹۸۲ء، طبع دوم ۱۹۹۰ء، صفحات ۲۰۶ قیمت ۴۰ روپے

اقبال کا نظامِ فن

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان لاہور، اشاعت: اول ۱۹۸۵ء۔ دوم ۱۹۹۰ء، صفحات ۵۱۷ قیمت ۱۲۵ روپے

تنویرِ اقبال

پبلشرز: مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور، اشاعت ۱۹۹۰ء بار اول، صفحات ۲۹۶، قیمت: ۸۴ روپے

ooo

عبدالواحد معینی، سید

(۲۹ جنوری ۱۸۹۸ء۔۳ مارچ ۱۹۸۰ء)

سید عبدالواحد معینی، ایس اے واحد کے نام سے بھی معروف تھے۔عبدالواحد معینی ۲۹ جنوری ۱۸۹۸ء کو اجمیر شریف میں سید عبدالمجید معینی کے ہاں پیدا ہوئے۔سید عبدالواحد معینی ممتاز ادیب، ماہر اقبالیات، سابق ڈائریکٹر اقبال اکادمی، اقوام متحدہ کے سابق مشیر جنگلات بھی رہے ہیں۔ان کی مشہور کتابوں میں ''باقیاتِ اقبال''، ''مقالاتِ اقبال''، ''نقش اقبال''، ''Introduction to Iqbal''، ''Thought & Reflectios of Iqbal''، ''Iqbal: His Art and Thought''، ''Studies in Iqbal''

''باقیاتِ اقبال'' میں اقبال کا غیر مدون کلام جمع کر دیا گیا ہے۔سید عبدالواحد معینی اور ان کے دستِ راست محمد عبداللہ قریشی ایسے لوگ بھی سامنے آئے، جنھوں نے اقبال کے کلام کو نہ صرف تلاش کیا بل کہ اسے کتابی صورت میں شائع کروا کر ایک علمی و ادبی خدمت بھی انجام دی ہے اور ایسی نظمیں اور غزلیں سامنے آئیں، جو محبانِ اقبال کی نظروں سے اوجھل چلی آ رہی تھیں۔ یہ کتاب اقبالیاتی ادب کے محققین اور عقیدت مندانِ اقبال کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔کتاب کی تقریظ مولانا عبدالحق نے لکھی ہے۔کتاب تین حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے میں ۶۳ نظمیں شامل ہیں۔دوسرے حصے میں وہ اشعار ہیں جو ''بانگ درا'' کی نظموں سے حذف کر دیے گئے اور تیسرے حصے میں علامہ کی غیر مطبوعہ غزلیات شامل ہیں۔اقبال کے فکر و فن پر متعدد زبانوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ہر مصنف کا اپنا اپنا زاویہ نظر ہے۔اقبال کی خوش بختی ہے کہ انھیں دنیا بھر میں شہرت دوام

حاصل ہے۔"IQBAL : His Art And Thoughts" سید عبدالواحد کی کتاب ہے جو یکم جولائی ۱۹۴۴ء کو مرتب کی گئی۔ سید عبدالواحد کی اس انگریزی کتاب کا نعیم اللہ ملک نے اردو ترجمہ کر کے اقبال شناسوں کے لیے آسانی پیدا کی ہے۔ ترجمہ کرنا بہت مشکل فن ہے۔ ان مضامین کے تراجم میں مترجم نے روحِ فکرِ اقبال کو مجروح نہ ہونے دیا۔

''اقبال: فکروفن'' وہ اہم کتاب ہے جو علامہ اقبال کی حیات و نظریات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کتاب کو بارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب کا عنوان ''سوانحی خاکہ'' ہے جس میں علامہ اقبال کے شب و روز کو خوب صورت پیرایہ میں یوں بیان کیا ہے کہ گویا کوزے میں دریا بند کرنے کی کوشش ہو۔

عبدالواحد معینی کی بعض انگریزی کتابوں کو اردو قالب میں بھی ڈھالا گیا ہے۔ عبدالواحد معینی ۳ مارچ ۱۹۸۰ء کو کراچی دارفانی سے کوچ کر گئے۔ انھیں احاطہ مزار عبداللہ شاہ غازی، کلفٹن، کراچی میں دفن کیا گیا۔ ان کی اقبالیات کتب کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

باقیاتِ اقبالؒ

ناشر: آئینہ ادب، لاہور، اشاعت باردوم ۱۹۶۶ء بارسوم ۱۹۷۸ء، صفحات ۶۰۸، قیمت ۶۰ روپے

مقالاتِ اقبال

پبلشرز: القمر انٹرپرائزز غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور، اشاعت: ۲۰۱۱ء، صفحات ۳۷۶، قیمت ۳۰۰ روپے

اقبال فکروفن

پبلشرز: ابوذر پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت: نومبر ۲۰۰۸ء، صفحات: ۲۵۲، قیمت ۴۰۰ روپے

ooo

عشرت حسن انور، ڈاکٹر

(۱۴ جون ۱۹۱۸ء۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۸۴ء)

ممتاز ماہر تعلیم، ماہر لسانیات، ممتاز شاعر اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر عشرت حسن انور ۱۴ جون ۱۹۱۸ء کو محلّہ نواب پورہ، مراد آباد یوپی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نورالحسن اپنے علاقے میں بہت بڑے زمیندار تھے۔ انھوں نے نہ صرف زمین کا سینہ چاک کر کے کئی بنجر علاقوں کو سیراب کی بل کہ لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے شبانہ روز محنت کی۔ اپنے علاقے کی بلدیہ میں وہ بحیثیت چیئرمین کئی مرتبہ منتخب ہوتے رہے۔ انھوں نے اتنی بار الیکشن لڑا کہ شہری انھیں ''چیئرمین صاحب'' کا خطاب دینے پر مجبور ہو گئے۔ نورالحسن کے خاندان میں تعلیم کا رواج نہ تھا۔ انھوں نے اس خاندانی روایت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے اور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ان کے بچوں نے دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کی تعلیم بھی حاصل کی۔ بڑے بیٹے ڈاکٹر ظہورالحسن شارب نے ایل ایل بی کے علاوہ سیاسیات میں پی ایچ ڈی کر لی، انھوں نے وکالت میں نام پیدا کرنے کے علاوہ تصوف کے بارے میں کم از کم ۷۰ کتابیں تصنیف کیں اپنے چچا خادم حسن کے خلیفہ مجاز اور اجمیر شریف میں مقیم رہے۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور نے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی۔ جب کہ نصرت حسن نے تاریخ میں ایم اے کرنے کے علاوہ پی سی ایس بھی کر لیا۔ نورالحسن کی اکلوتی بیٹی نے علی گڑھ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور لاہور کو اپنا مسکن بنایا۔

ڈاکٹر عشرت حسن گوناگوں خوبیوں کے حامل تھے انھوں نے یوپی بورڈ سے ۱۹۳۳ء میں میٹرک اور ۱۹۳۵ء میں ایف اے پاس کیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۳۷ء میں بی اے کی ڈگری

حاصل کی اور پھر ۱۹۳۹ء میں اسی یونیورسٹی سے فارسی زبان وادب میں ایم اے کرلیا۔ڈاکٹر عشرت حسن انور نے ''اقبال کی مابعد الطبیعیات'' پر سید ظفر الحسن کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ انگریزی میں تھا جس کا ترجمہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے کیا جسے اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور چین کا تعلیمی دورہ کیا وہاں لن ٹو انسٹی ٹیوٹ اور اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کمنگ میں ہندوستانی اور ہندی کلچر کے لیکچرار رہے۔انھیں چین کا موسم سازگار نہ آیا یرقان اور فالج کے حملے میں ان کی صحت بہت خراب ہوگئی۔ بیماری سے شکست کھا کر وہ واپس آ گئے۔

ڈاکٹر عشرت حسن انور کی شادی ان کے چچا کی بیٹی مہتاب سے ہوئی۔ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دو صاحبزادوں راحت حسن اور فرحت حسن اور ایک بیٹی عفت حسن سے نوازا۔ راحت حسن ایم ایس سی کر کے سائنس کی وادی کے سیاح بن گئے ہیں انھیں اردو شاعری سے بھی لگاؤ ہے خود بھی شعر کہتے ہیں۔فرحت حسن نے مسلم یونیورسٹی سے ایم اے تاریخ کرنے کے بعد پی ایچ ڈی مکمل کی۔ڈاکٹر عشرت حسن انور کی بیٹی عفت اپنے چچازاد رفعت حسن سے شادی کے بعد کراچی مقیم ہیں۔

ان بیماریوں کا علاج کرواتے رہے جب اللہ تعالیٰ نے صحت اور تندرستی عطا کی تو ایک بار پھر درس وتدریس کی طرف راغب ہوئے اس بار انھوں نے اجمیر شریف میں مسلم ہائی سکول میں اسسٹنٹ ہیڈ ماسٹر کی خدمات انجام دیں۔عشرت حسن انور ۱۹۴۵ سے ۱۹۴۸ء تک شبلی ڈگری کالج اعظم گڑھ میں فارسی ادب کے لیکچرار تعینات رہے۔ یکم نومبر ۱۹۴۸ء سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فلسفہ کے سینئر لیکچرار تعینات ہوئے۔اس کے بعد انھوں نے تمام زندگی علی گڑھ میں ہی بسر کی۔۲۵ ستمبر ۱۹۷۳ء کو انھیں ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر کر دیا گیا۔ڈاکٹر عشرت حسن انور نے بڑی جانفشانی سے تعلیمی خدمات انجام دیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے در و دیوار آج بھی ان کی محبتوں کے اسیر دکھائی دیتے ہیں۔انھوں نے علم کے موتی نچھاور کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔طالبِ علموں سے بے پناہ محبت اور پیار ملا۔ جون ۱۹۷۸ء کو ڈاکٹر صاحب ریٹائرڈ ہوئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد وہ باقی زندگی علی گڑھ میں ہی قیام پذیر رہے۔۲۹ ستمبر ۱۹۸۴ء کو رحلت فرما گئے۔

''اقبال اور مشرق و مغرب کے مفکرین'' میں ڈاکٹر عشرت حسن انور نے اس قوسِ قزح کے مختلف رنگوں کا جائزہ نہایت عالمانہ انداز میں لیا ہے۔انھوں نے علامہ کے نظامِ فکر کو مختلف نظام ہائے فلسفہ کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔مغربی مفکرین کے ساتھ ساتھ صوفیانہ نظریات کی بھی

وضاحت کی ہے۔

ڈاکٹر عشرت حسن انور کے مضامین پر مبنی اس کتاب کی تدوین شیما مجید نے کی ہے اس کتاب کو پہلے ڈاکٹر صاحب نے ''اقبال کا فکری پس منظر'' کے نام سے شروع کیا تھا لیکن ان کی زندگی میں ان کی یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ بعد میں ''بزمِ اقبال'' نے موضوع کی مناسبت سے اس کا نام ''اقبال اور مشرق و مغرب کے مفکرین'' تجویز کیا۔ یہ کتاب جنوری ۱۹۸۹ء منظرِ عام پر آئی۔

کتاب میں مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیباچہ بھی شامل ہے۔ کتاب میں آٹھ مضامین شامل ہیں جن میں علامہ کے افکار کو مشرقی و مغربی مفکرین کے افکار کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس بات کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اقبال نے جدید فلسفہ کو اسلامی افکار سے ہمکنار کیا اور اپنی شاعری میں اسلامی تعلیمات کو جدید رنگ میں ملون کر کے پیش کیا ہے۔

کتاب کے آخری مضامین خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن میں مصنف نے مولانا روم اور شنکراچاریہ کے افکار کے درمیان مماثلتیں دکھائی ہیں یہ مضامین اپنے اچھوتے موضوع کی وجہ سے نہایت اہم ہیں۔ علامہ اقبال کے افکار چونکہ مختلف مفکرین کے افکار سے اثر پذیر ہیں اس لیے ان مفکرین کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اس ضرورت کو ڈاکٹر عشرت حسن انور نے نہایت خوش اسلوبی اور کامیابی سے پورا کر دیا ہ۔ انھوں نے ان نظام ہائے فلسفہ کی اس طرح وضاحت کی ہے کہ ہمارے ذہن کے بند دریچے ایک کے بعد ایک کھلتے چلے جاتے ہیں۔ کتاب کے مقدمہ میں طارق زیدی لکھتے ہیں:

> ''وہ جب کسی فلسفی نظام فکر کی بات کرتے ہیں تو صرف اس فلسفی کے نظام فکر ہی کو واضح نہیں کرتے بلکہ اس فلسفی کے افکار کو فکری تاریخ کے پس منظر کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔''

اقبال اور مشرق و مغرب کے مفکرین

تدوین شیما مجید، ناشر: ڈاکٹر وحید قریشی، بزمِ اقبال، اشاعت ۱۹۸۹ء، صفحات ۲۰۰، قیمت ۵۵ روپے

ooo

عزیز احمد

(۱۹۱۴ء۔۱۹۷۸ء)

پروفیسر عزیز احمد ۱۹۱۴ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ عزیز احمد اردو کے ممتاز ناول نویس، افسانہ نگار، نقاد، محقق اور مترجم کے طور پر معروف ہیں۔ گورنمنٹ کالج اورنگ آباد سے ایف اے کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۸ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے لندن چلے گئے اور لندن یونی ورسٹی سے انگلش اور فارسی میں آنرز کیا اور واپس وطن آ کر درس وتدریس کے شعبہ سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں نظام حیدر آباد کی بہودر شہوار کے اتالیق مقرر ہوئے۔ چار سال تک اسی شاہی خانوادے کے ساتھ منسلک رہے۔ عزیز احمد کی علمی ادبی زندگی کا آغاز اس وقت سے ہوا جب وہ جامعہ عثمانیہ میں پڑھ رہے تھے۔ انھیں شاعری کا بے حد ذوق پیدا ہوا۔ ۱۹۴۳ء میں ان کی تین اہم ترین منظومات پر مشتمل ایک مجموعہ ''ماہ لقا اور دوسری نظمیں'' منصۂ شہود پر آیا۔ ۱۹۴۹ء میں وہ پاکستان آ گئے اور ۱۹۵۸ء تک یہیں رہے اور محکمہ فلم اور پبلی کیشنز میں ڈائریکٹر اور حکومت کے دیگر مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ عزیز احمد نے ''ماہ نو'' اور ''ہلال'' کی ادارت بھی کرتے رہے۔ ۱۹۵۸ء میں وہ لندن چلے گئے اور سکول آف اورینٹل میں پڑھانے لگے۔ ۱۹۶۰ء میں وہ ٹورانٹو یونی ورسٹی کے شعبہ اسلامیات سے منسلک ہو گئے اور آخر تک وہیں رہے۔

ان کی تاریخ کے حوالے سے کتب نے انھیں خاصی شہرت عطا کی جس سے ان کا نام عالمی سطح پر گونجنے لگا۔ ۱۹۷۳ء میں لندن یونی ورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ اس کے بعد رائل سوسائٹی آف کینیڈا نے اپنا فیلو بنایا۔ اہم تصانیف اور تراجم مندرجہ ذیل ہیں:

ناول............ ''گریز''، مرمر اور خون''، ''ہوس''، ''آگ''، ''ایسی بلندی ایسی پستی'' اور ''شبنم''

ادبی تنقید...... ''ترقی پسند ادب''''اقبال نئی تشکیل''،''اقبال اور پاکستانی ادب''

تراجم...... ''معمار اعظم (ابسن کے دی ماسٹر بلڈر کا ترجمہ)،''بوطیقا''(ارسطو کی Poetics کا ترجمہ)

''رومیو جیولٹ (شیکسپیئر کا ڈرامہ)،''طربیہ خداوندی''(دانتے کی ڈیوائن کامیڈی کا حصہ)

''خطباتِ گارساں دتاسی''،''مقالات گارساں دتاسی''،''تیمور وغیرہ تاریخی اور اسلامی موضوعات پر بھی ان کی متعدد کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔اقبالیاتی ادب میں ان کی دو کتب نے ان کو اقبال شناسوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔وہ ایک ماہر اقبال شناس کے طور پر معروف ہوئے ہیں۔ ان کے اقبالیاتی کام کو ادبی حلقوں نے خوب سراہا ہے۔

عزیز احمد معدودے چند ایسے ادباء اور ناقدین میں سے تھے جنھوں نے ادب کی مختلف جہتوں میں خوب نام کمایا ان کا شمار شعبہ تعلیم، ناول نویسی، مترجم، اقبال شناسی، محقق اور نام ور ناقدین میں ہوتا ہے۔''اقبال نئی تشکیل''ان کی ایسی شاہکار کتاب ہے جو مختلف مقامات سے شائع ہوئی۔امریکہ، حیدر آباد (انڈیا) اور لاہور سے شائع ہونے والے اس کتاب کے ایڈیشن، اس کی اہمیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔عزیز احمد نے ترقی پسندانہ انداز میں اقبال کے فن شاعری کو سراہا ہے۔

اقبال کے افکار کی تفہیم میں عزیز احمد کا نام بھی شامل ہے۔عزیز احمد کا شمار ترقی پسند ناقدین میں ہوتا ہے''اقبال نئی تشکیل''ان کی وہ لازوال تصنیف ہے جس کی حیثیت کل بھی مسلم تھی اور آج بھی اس کی وہی قدر و قیمت ہے۔

''اقبال اور پاکستانی ادب'' بھی عزیز احمد کے مقالوں پر مبنی کتاب ہے۔یہ ان سات مقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ممتاز شاعر و ادیب، نقاد اور ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر ڈاکٹر طاہر تونسوی نے ان بکھرے مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل دے دی۔تمام مضامین میں عزیز احمد کا ترقی پسندانہ رویہ جھلکتا نظر آتا ہے۔ان میں ''کلاسیکی تصورات پر کی گئی تنقید'' اور ''اقبال اپنی رباعیات کی روشنی میں'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان کی دو اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال نئی تشکیل

پبلشرز: (۱) اقبال اکیڈمی، آندھرا پردیش (انڈیا)، اشاعت ۲۰۰۸ء، صفحات ۲۸۴، قیمت ۲۵۰ روپے

اقبال اور پاکستانی ادب

پبلشرز: مکتبۂ عالیہ لاہور، اشاعت اول ۱۹۷۷ء دوم ۱۹۸۷ء، صفحات ۱۲۸، قیمت ۲۵ روپے

عطااللہ، شیخ

(۱۸۹۶ء۔ ۲۷دسمبر ۱۹۶۸ء)

شیخ عطاء اللہ ۱۸۹۶ء کو پیدا ہوئے۔ گجرات میں زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا۔ انھوں نے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہجرت کے پاکستان آ گئے اور ہیلی کالج آف کامرس لاہور میں اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ترقی پا کر وائس پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اسلامیہ کالج چنیوٹ کے بانی پرنسپل تھے۔ شیخ عطا اللہ اقتصادیات میں خوب دسترس رکھتے تھے۔ انھوں نے ساری عمر علمِ اقتصادیات پڑھایا۔ ان کے فرزند گرامی مختار مسعود نے بھی ادبی دنیا میں خوب نام کمایا ان کی تصنیف ''آوازِ دوست'' کو خوب شہرت نصیب ہوئی۔ شیخ عطااللہ، علامہ محمد اقبال کی بزمِ دوستاں میں شریک ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں علامہ اقبال سے عقیدت و محبت بہت زیادہ تھی۔ وہ ان کے کلام کو پڑھتے رہتے۔ اقبال کے خطوط نہ صرف پڑھتے بل کہ انھوں نے اقبال کے بعض خطوط کو جمع کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ شیخ عطااللہ نے علامہ محمد اقبال کے مختلف شخصیات کو لکھے ہوئے خطوط ''اقبال نامہ'' (اول) اور ''اقبال نامہ'' (دوم) میں یکجا کر کے ایک بہت بڑا اقبالیاتی کام انجام دیا۔ عظیم لوگوں کے ساتھ وابستہ ہر چیز عوام کے لیے ایک سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے گو خطوط کا تعلق انسان کی ذاتی زندگی سے ہوتا ہے۔ لیکن بڑے لوگوں کے خطوط میں بھی عوام کی دلچسپی واصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اس لیے بہت سی مشہور شخصیات کے خطوط شائع کیے گئے تا کہ ان خطوط سے معاشرے کا ہر فرد استفادہ کر سکے۔

علامہ اقبال جیسی عظیم شخصیت کے قلم سے نکلنے والا ہر جملہ ایک فکر کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے خطوط اردو کا قیمتی سرمایہ ہیں، جن میں اقبال کے افکار جا بجا درخشاں نظر آتے ہیں۔ شیخ عطا اللہ نے ''اقبال نامہ'' کے عنوان سے مجموعہ مکاتیب اقبال مرتب کیا ہے۔ جس میں اقبال کے خطوط نامور شخصیات کے نام شائع کیے گئے ہیں۔ اس مجموعہ میں 54 خطوط شامل ہیں۔ اس کا مقدمہ نواب صدر یار جنگ بہادر ڈاکٹر حبیب الرحمٰن صاحب نے تحریر کیا ہے۔ ان خطوط میں علامہ اقبال کے ملی اور مذہبی افکار نمایاں ہوتے ہیں کچھ خطوط میں شعر و شاعری پر تبصرہ بھی شامل ہے۔

مکاتیب اقبال کو یکجا کرنا ایک مشکل کام تھا۔ برعظیم پاک و ہند کے طول و عرض میں علامہ اقبال کے خطوط ایک کتاب میں اکٹھا کرنا دریا، کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ سوانح عمریوں اور شخصی عظمت اور ادبی رفعت پر اظہار رائے کے لیے یہ خطوط ایک بنیادی ماخذ ہیں۔ ''خطوط اقبال'' ہمہ گیر معلومات کے حامل ہیں۔ یہ ایک عہد کی سیاسی، سماجی، علمی، اَدبی، معاشی، اور اخلاقی رویوں کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ مکاتیبِ اقبال پر مشتمل یہ کتاب اقبال کے افکار سے دل چسپی رکھنے والے لوگوں کے لیے ایک مشعل راہ ہے، جس میں علامہ اقبال کے خیالات ان کے اپنے الفاظ میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔

شیخ عطا اللہ نے خطوط مرتب کرنے کی افادیت و اہمیت کے بارے میں لکھا ہے:

> ''جو خطوط حاصل ہو سکے بلا کم و کاست شامل مجموعہ کر لیے گئے ہیں۔ ہر شخص اپنے مذاق و جستجو کے مطابق ان میں اپنی تسکین کا سامان مہیا پائے گا۔ کس کے لیے کون سے خطوط اور کون سی شے جاذب توجہ ہوگی ہمارے واردات قلبی اور سطح ذہنی پر موقوف ہے...... میں نہیں کہہ سکتا کہ ایک چوتھائی صدی بعد ان مکاتیب کے پڑھنے والوں کی نگاہ میں کون سی چیز زیادہ محبوب ہوگی، لہٰذا میں نے ان خطوط کو بھی اس مجموعہ میں شامل کر لیا ہے جو آج دوستوں کی نظر میں قطعاً غیر اہم ہیں۔ عین ممکن ہے کل وہی خطوط بڑے معرکے کی چیز ثابت ہوں اور کتنے ہی اہم مسائل کا فیصلہ ان کی روشنی میں کیا جا سکے۔''

شیخ عطا اللہ ۲۷ دسمبر ۱۹۶۸ء کو ۲۷ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ شیخ عطا اللہ غازی علم الدین شہید سے خاص عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں وصیت کر رکھی تھی کہ ان کو غازی علم الدین شہید کے اطراف میں دفن کیا جائے۔ لہٰذا ان کی وفات کے بعد شیخ عطا اللہ کی قبر غازی علم الدین شہید

کے مزار کے مشرقی کونے کے ساتھ لب سڑک موجود ہے۔
ان کی اقبال کے حوالے سے کتب کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

اقبال نامہ مجموعہ مکاتیبِ اقبال (حصہ اوّل)

پبلشرز: مرکنٹائل پریس، لاہور، ناشر: شیخ محمد اشرف، تاجر کتب، صفحات ۴۷۴

اقبال نامہ (حصہ دوم) یعنی مجموعہ مکاتیبِ اقبال

پبلشرز: شیخ محمد اشرف۔ تاجر کتب کشمیری بازار، لاہور، اشاعت: ۱۹۵۱ء، صفحات: ۳۹۸

نوٹ: ڈاکٹر تحسین فراقی کی کاوشوں سے اقبال نامہ اول اور دوم اقبال اکادمی پاکستان نے ۲۰۰۵ء میں ایک جلد میں شائع کرنے کا اہتمام کیا۔

اقبال نامہ مجموعہ مکاتیبِ اقبال (یک جلد)

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعتِ اول: ۲۰۰۵ء، اشاعت دوم، ۲۰۱۲ء صفحات ۶۸۶،
قیمت ۶۰۰ روپے، محل فروخت ۱۱۶ میکلورڈ روڈ، لاہور فون نمبر: ۳۷۵۷۲۱۴

ooo

عطیہ بیگم

(۱۸۷۷ء۔۴جنوری۱۹۶۷ء)

عطیہ فیضی ممتاز علمی وادبی اور سماجی شخصیت تھیں۔عطیہ فیضی استنبول میں ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئیں۔ان کے والدِ گرامی حاجی حسین علی آفندی کاروبار کے سلسلہ میں استنبول میں مقیم تھے۔عطیہ فیضی اردو کی معروف ادیبہ، ماہرہ موسیقی وفنونِ لطیفہ تھیں۔لارڈ کرزن اور رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ بھی شناسائی رہی۔۱۹۰۶ء میں تعلیمی وظیفے پر یورپ جانے کے لیے منتخب ہوئیں۔اگلے ہی برس ان کی ملاقات علامہ محمد اقبال سے ہائیڈ برگ میں ہوئی۔عطیہ فیضی کا نام کسی تعارف کامحتاج نہیں۔وہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی مداح تھیں۔ایک عرصہ تک ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔اقبال کی کامیابیوں پر مبارک دینے اوران کی عزت افزائی کرنے میں عطیہ فیضی نے ہمیشہ فیاضی کا ثبوت دیا۔علمی وادبی مباحث میں بھی وہ شریک گفت گورہتیں۔دونوں میں کافی دوستی رہی اور آپس میں خطوط کاتبادلہ بھی ہوتا رہا۔ علامہ محمد اقبال ان کے بہت متاثر تھے۔عطیہ فیضی نے علامہ محمد اقبال کے تمام خطوط کتابی صورت میں بھی شائع کردیے۔۱۹۰۷ء میں واپس آنے پر شبلی نعمانی سے بھی ملاقات ہوئی تو انھوں نے عطیہ فیضی کی شان میں پورا قصیدہ کہہ دیا۔عطیہ فیضی نے ۱۹۱۳ء میں یہودی مصور فیضی رحمین سے شادی کرلی۔قیام پاکستان کے بعد کراچی منتقل ہوگئیں۔

ان کی کتب میں ''زمانۂ تحصیل'' (مجموعہ خطوط۱۹۰۶ء،مطبوعہ۱۹۲۲ء)،''اقبال از عطیہ بیگم'' (علامہ محمد اقبال کے خطوط کا مجموعہ۔انگریزی)،''ہندوستانی موسیقی''،اور''ہندوستانی سنگیت'' شامل ہیں بشیر احمد ڈار نے بھی ''لیٹرز آف اقبال'' میں ۵۵صفحات پر اقبال کے خطوط بنام عطیہ بیگم

شامل کیے ہیں۔ان انگریزی خطوط میں اردو اشعار کے حوالے بھی موجود ہیں۔ڈیئر مس عطیہ، ڈیئر عطیہ بیگم، مائی ڈیئر فیضی، یا مس فیضی کے القاب سے شروع ہونے والے یہ خطوط نجی، ادبی، سیاسی، سماجی، اور علمی موضوعات پر مشتمل ہیں۔

''اقبالز لیٹرز ٹو عطیہ بیگم'' مرتبہ رحمٰن ایس اے، وکٹری پرنٹنگ پریس بمبئی، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے فروری ۱۹۴۷ء کو خوب صورت سرورق کے ساتھ شائع کی جس کے صفحات کی تعداد ۸۸ تھی۔ بعد میں اس کتاب کو ۱۹۶۹ء میں آئینہ ادب لاہور نے بڑے اہتمام سے زیور طباعت سے آراستہ کیا۔

عطیہ بیگم کے نام ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے طویل خطوط پر مشتمل یہ کتاب اصل مکاتیب کے عکس کے ساتھ پہلی دفعہ شائع ہوئی ہے۔ جو ایک نادر ادبی تحفہ سے کم نہیں ہے۔ان خطوط کا متن لیٹرز آف اقبال میں بھی موجود ہے۔

عطیہ فیضی ۴ جنوری ۱۹۶۷ء کو کراچی میں انتقال کر گئیں اور انھیں احاطہ سلیمانی بوہرے، میوہ شاہ، کراچی میں سپرد خاک کیا گیا۔ان کی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

Iqbal's Letters to Attiya Begum

پبلشرز: اکیڈمی آف اسلام پبلی کیشنز، وکٹری پرنٹرز پریس بمبئی۔ ۷، اشاعت: فروری ۱۹۴۷ء، صفحات ۸۸

ooo

علی عباس جلالپوری، پروفیسر

(۱۹۱۴ء۔۱۹۶۹ء)

علی عباس ۱۹۱۴ء کو جلال پور شریف ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔علی عباس جلالپوری اردو کے ممتاز ادیب، نقاد، اور دانش ور تھے۔انھوں نے اردو قارئین کو فلسفیانہ موضوعات سے متعارف کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔پنجاب یونی ورسٹی سے اردو، فلسفہ اور فارسی میں ماسٹر ڈگریاں حاصل کیں انھوں نے حصول علم کے بعد درس وتدریس کو اپنایا۔

علی عباس جلالپوری قادرالکلام ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر فلاسفر تھے۔ان کی کتب فلسفہ کے طالب علموں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔علی عباس جلالپوری کی مشہور کتابوں میں ''رُوحِ عصر''، ''کائنات اور انسان''، ''عام فکری مغالطے''، ''روایات فلسفہ''، ''وحدت الوجود تے پنجابی شاعری''، ''مقالاتِ جلالپوری''، ''خردنامہ جلالپوری''، ''جنسیاتی مطالعے''، ''رسوم اقوام''، ''تاریخ کا نیا موڑ''، ''روایات تمدن قدیم''، ''مقامات وارث شاہ''، ''اقبال کا علم الکلام'' اور ''تاریخ کا نیا موڑ'' شامل ہیں۔

''اقبال کا علم الکلام'' لکھ کر پروفیسر سید علی عباس جلالپوری نے ایک نازک مسئلے پر خامہ فرسائی کی ہے۔''علم کلام'' جدید دور کی اہم اصطلاح اور ضرورت ہے۔اقبال کے عہد میں بھی اس مسئلے کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔سر سید احمد خان اور مولانا شبلی نعمانی دونوں کی رائے اس مسئلے پر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔بہت سے لوگوں نے علامہ اقبال کے افکار کو اس حوالے سے مختلف معانی پہنائے۔علی عباس جلالپوری نے اقبال کے تصورات علم کلام کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ان کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔

ان تصریحات کی وجہ سے ایک عام قاری بھی فلسفے کے مشکل الفاظ کو بآسانی سمجھ سکتا ہے۔
ان تصریحات کی وجہ سے اقبال کے افکار کو سمجھنے میں کافی سہولت ہوگئی ہے۔اس کے علاوہ اصطلاحات کے عنوان سے اردو اصطلاحات کو انگریزی میں بیان کیا گیا ہے تاکہ وہ لوگ جو انگریزی زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ان اصطلاحات کے مفہوم سے آگاہ ہوجائیں۔اس کے بعد کتابیات ہیں جن میں سے زیادہ تر مولانا شبلی نعمانی اور سر سید احمد خان، علامہ اقبال، عبدالسلام ندوی کی ہیں، اس کے علاوہ مصنف نے کئی انگریزی کتابوں کے نام بھی لکھے ہیں۔جن سے استفادہ کیا گیا۔

علامہ اقبال کا علم کلام، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کی طرف ایک اشارہ ہے۔اقبال کا نظریہ اجتہاد بھی علم کلام سے وابستہ ہے۔آج دنیا گلوبل ولیج بن رہی ہے ترقی کی دوڑ میں دیگر ممالک کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں جدید علوم سے استفادہ کرنا چاہیے۔جدیدیت کی پٹڑی پر سبک رفتاری کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔یہ کتاب علم تصوف اور علم کلام میں دل چسپی رکھنے والوں کے لیے معلومات کا گنجینہ ہے۔

علی عباس جلال پوری ۱۹۶۹ء کو انتقال کر گئے۔ان کی کتابوں کا ایک قیمتی خزینہ قارئین کے ذہنوں کو جلا بخشتا رہے گا۔کسی نے کہا تھا کہ شخص مرتا ہے۔شخصیت نہیں مرتی، وہ ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔علی عباس جلالپوری شخص نہیں بل کہ ایک شخصیت تھے۔ان کی اقبالیاتی کتاب کا تذکرہ درج ہے۔

اقبال کا علم الکلام

پبلشرز: خردافروز، جہلم، اشاعت: ستمبر ۱۹۸۷ء، صفحات ۲۷۸، قیمت: ۴۵ روپے

ooo

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر

(۱۵/اگست ۱۹۲۴ء۔ ۱۳ جون ۲۰۰۷ء)

اردو کے ممتاز ادیب، محقق، مؤرخ، ماہرِ تعلیم اور نقاد کے حوالے سے مشہور ہیں۔ غلام حسین ذوالفقار ۱۵/اگست ۱۹۲۴ء بٹالہ ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ ایف اے کی تعلیم کے لیے ایم اے او کالج امرتسر میں داخلہ لیا۔ جہاں پرنسپل ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر اور اساتذہ میں فیض احمد فیض، کرامت حسن جعفری، عظیم الدین احمد اور مہر ادریس شامل تھے۔ برعظیم پاک و ہند کی تقسیم کے بعد جب فسادات شروع ہو گئے تو ۲۷/اگست، ۱۹۴۷ء میں وہ خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور آ گئے اور پھر لاہور میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ پہلے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا اور پھر بی اے کیا۔ پنجاب یونی ورسٹی سے ایم اے (اردو) اور بعد ازاں ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی نگرانی میں ''اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر'' کے عنوان سے مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ انھوں نے ایک طویل عرصہ تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ صدر شعبہ اردو پنجاب یونی ورسٹی لاہور (۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۷ء۔ ۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۴ء) اردو چیئر استنبول (۱۹۸۵ء تا ۱۹۹۰ء) ناظم بزم اقبال و مدیر سہ ماہی ''اقبال'' لاہور (۱۹۹۴ء تا وفات)۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ماہر اقبالیات، مؤرخ، نقاد، غالب شناس اور محقق ہیں۔ اقبالیات کے حوالے سے ان کا کام سند تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۱۳ جون ۲۰۰۷ء کو ۸۲ سال کی عمر میں لاہور میں انتقال کر گئے۔ انھیں پنجاب یونی ورسٹی کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی معروف کتب یہ ہیں:

''اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر'' (۱۹۶۶ء) ''تاریخ اورینٹل کالج لاہور'' (۱۹۶۲ء)

''محاسن خطوط غالب''(۱۹۶۹ء) ''اقبال کا ذہنی ارتقاء''(۱۹۷۸ء)
''تاریخ جامعہ پنجاب''(۱۹۸۲ء) ''قومی زبان کی بازیافت''(۱۹۸۶ء)
''پنجاب تحقیق کی روشنی میں''(۱۹۹۱ء) ''مولانا ظفر علی خان: حیات، خدمات و آثار(۱۹۹۳)
''جلیانوالہ باغ کا قتل عام اور مظالم پنجاب''(۱۹۹۶ء)''تحریکِ ہجرت'' (۱۹۹۷ء)
''جدوجہد آزادی میں پنجاب کا کردار(۱۹۹۶ء) ''پاکستان: تصور سے حقیقت تک''۱۹۹۷ء)
''سر فضل حسین کا کردار تاریخ کے آئینے میں''(۱۹۹۷ء)''استنبول، ترکیہ، سفر و حضر میں(۲۰۰۱ء)
''جگر لخت لخت''(خودنوشت۔۲۰۰۵ء) ''مردم دیدہ وشنیدہ(۲۰۰۷ء)
''اقبال: ایک مطالعہ''(۱۹۸۷ء)۔

ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال ایک مطالعہ

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: ۱۹۸۷ء، صفحات: ۲۸۰، قیمت: ۶۵ روپے

اِقبال کا ذہنی ارتقا

پبلشرز: مکتبہ خیابان ادب لاہور، اشاعت: جنوری ۱۹۷۸ء، صفحات: ۲۱۶، قیمت: ۳۰ روپے

ooo

غلام مصطفیٰ تبسّم، صوفی

(۱۸۹۹ء۔۱۹۷۸ء)

اردو ادب میں بعض شخصیات مختلف علوم پر دسترس رکھنے کی وجہ سے بہت مقبول ہوئیں۔ انھوں نے انگریزی، اردو، فارسی، عربی، پنجابی، ہندی، اور جنوبی ایشیاء میں بولی جانے والی زبانوں کا سہارا لے کر اردو ادب کی رنگینیٔ خیال میں اضافہ کیا۔ ایسے عظیم تخلیق کاروں میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم سرفہرست ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انھیں بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ اگست ۱۸۹۹ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسی علاقہ کے چرچ مشن سکول سے حاصل کی۔ ۱۹۲۳ء میں ایف سی کالج لاہور سے بی اے آنرز مکمل کیا۔ ۱۹۲۴ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے فارسی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۲۶ء میں سنٹرل ٹریننگ کالج سے بیچرل ان ٹیچنگ (بی ٹی) کی ڈگری حاصل کی۔ ملازمت کا آغاز گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر میں بطور سینئر ٹیچر سے کیا۔

تعلیمی میدان میں ترقی کرتے کرتے وہ انسپکٹر آف سکولز امرتسر مقرر ہوئے۔ درس وتدریس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا وہ ۱۹۲۷ء۔۳۱ تک سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں لیکچرار کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ اس دوران اِن کی شہرت برعظیم پاک و ہند کے کونے کونے میں پھیلنا شروع ہوگئی۔ قراردادِ پاکستان کی منظوری کے بعد ۱۹۴۱ء میں وہ گورنمنٹ کالج لاہور آ گئے۔ حیران کن بات ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں فارسی اور اُردو شعبہ جات کے صدر تھے۔ اُردو، فارسی میں مہارت کی وجہ سے وہ علمی وادبی جرائد میں چھپنے لگے۔ ملازمت کے بعد وہ خانۂ فرہنگ ایران کے ڈائریکٹر ہفت روزہ لیل ونہار کے مدیر مقرر ہوئے۔ اُردو فارسی نثر کے علاوہ اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کا

اعتراف ہونے لگا۔ وہ ریڈیو پاکستان، پاکستان آرٹس کونسل، اقبال اکادمی پاکستان اور کئی دیگر اداروں کی سرپرستی کرتے رہے۔ انجمن ترقی اُردو، حلقہ اربابِ قلم، حلقہ اربابِ ذوق اور دیگر ادبی تنظیموں میں اُن کی شرکت لازمی تصور کی جاتی۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ہمہ صفت انسان تھے۔ استاد، نقاد، شاعر، مترجم، مقرر، سکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے اُن کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ اُنھوں نے انگریزی شاعری میں بھی طبع آزمائی فرمائی۔ مختلف شعراء کرام کے کلام کو پنجابی میں ڈھالنے کا فریضہ بھی انجام دیا۔ انھوں نے غالب کی بعض اردو غزلوں کو پنجابی میں ڈھالا۔ ایک غزل کا مصرع ہے۔

میرے شوق دا نہیں اعتبار تینوں
آ دیکھ میرا انتظار آ جا

بچوں کے لیے شاعری کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے بچوں کے ادب پر بہت کام کیا۔ بچوں کے لیے شاعری دراصل قوم کی آبیاری ہے۔ چوں کہ صوفی صاحب محبِ وطن استاد تھے۔ اس لیے وہ نونہالان وطن کو تعمیری پیغام دینا چاہتے تھے۔ کئی مشاعروں میں جب وہ اپنا کلام پیش کرتے تو سامعین سے آواز آتی ''ٹوٹ بٹوٹ کی موٹر کار'' سنائیے۔ ان کے کئی ملی نغمے مقبول ہوئے۔

☆''اے پتر ہٹاں تے نہیں وکدے'' ☆''جھولنے'' ☆ ٹوٹ بٹوٹ اور ٹول مٹول ایسے شعری مجموعے ہیں جو بچوں کے ادب میں بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

ان کی شستہ شگفتہ بیانی بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول ہے'' دامن گل'' اور'' انجمن'' ان کے ایک دو شعری مجموعے اردو ادب کی زینت ہیں'' صد شعر اقبال'' ان کی اہم کتاب ہے۔ شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال کے سو اشعار کی شرح کر کے انھوں نے اقبالیاتی ادب کی گراں قدر خدمت کی ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اشعار کی تشریح اور مختلف ادبی موضوعات پر بذریعہ ٹیلی ویژن طالب علموں کو ذوق شعر سے آشنا کرتے رہے۔ ان کا یہ پروگرام ایم۔ اے اردو کے طلباء و طالبات کے علاوہ فکر اقبال سے شغف رکھنے والے احباب بڑی دل چسپی سے دیکھا کرتے تھے۔

''صد شعر اقبال'' فکرِ اقبال کے اہم گوشوں کی تفسیر ہے۔ ایم اے اردو کے طلباء طالبات اقبال کے بنیادی فلسفے سے ہم آہنگ ہونے کے لیے اس کتاب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ انتخاب کلام

بھی قابل ستائش ہے اور شعر کا فکر و فن پیش کرنے کا انداز بھی نہایت عمدہ ہے۔۲۰۰۲ء سے پنجاب یونی ورسٹی نے ''صد شعر اقبال'' سے پچاس اشعار مطالعہ پاکستان (بی اے) میں شامل نصاب کیے۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے اردو اور فارسی کے مقبول ترین شاعر مرزا غالب کی بعض اردو غزلوں کا بڑی خوب صورتی کے ساتھ پنجابی منظوم ترجمہ کیا ہے، جو بڑا مقبول ہوا۔ اُردو، فارسی اور انگریزی تراجم کا یہ انداز صوفی صاحب کی وسعت مطالعہ کا غماز ہے۔ اُنھوں نے اقبال، امیر خسرو، اور شیکسپیئر کی تخلیقات کے عمدہ تراجم کیے ہیں۔ ''جاہ و جلال'' ڈراموں کا مجموعہ آفاقی حلقوں میں مقبول ہے۔ ۱۹۵۰ء میں شہنشاہِ ایران نے اُنھیں قالین کا تحفہ عنایت کیا۔ اُن کی گراں قدر خدمات کو تسلیم کرتے ہوئے ۱۹۵۹ء میں ایرانی حکومت نے نشان سپاس سے نوازا۔ قائد اُردو ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی اُردو کی خدمت کے عوض اُنھیں ''نشان سپاس'' سے سرفراز کیا۔

ایران کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی اُن کے تراجم کی پذیرائی ہوئی۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان بھی صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی صلاحیتوں کی معترف تھے۔ ۱۹۶۲ء میں اُنھوں نے صوفی صاحب کو تمغۂ اعزاز اور ۱۹۶۷ء میں ستارہ امتیاز عطا کیا۔ اُنھیں کئی طلائی اور نقرئی میڈل بھی دیے گئے۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم پنجابی انگریزی، فارسی، عربی اُردو اور ہندی زبانیں سمجھ سکتے تھے۔ اُردو اور فارسی کے اُستاد کی حیثیت سے اُنھوں نے اپنے طالب علموں کو زبان و بیان کے راز و رموز سکھائے۔ فارسی شاعری کی طرف رجحان زیادہ تھا لیکن کالج کے اساتذہ کی تحریک پر اُنھوں نے اُردو کی طرف توجہ دی۔ اُن کی شاعری میں موضوعات کی کثرت ہے۔ اُردو، فارسی اور پنجابی خیالات کو یک جا کرنے کی روایت صوفی تبسم کے ہاں نمایاں ہے۔ اُنھوں نے نہ تو صداقت چھوڑی اور نہ جدیدیت سے تہی دامن رہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کی طرح اُنھوں نے ہر طبقہ کو اپنی شاعری میں شامل کیا۔ فن کی پختگی، زبان پر قدرت اور مشاہدہ اُن کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ غم دوراں، غم جاناں، مٹھاس درد، کرب، سوز اور جذبات کے اظہار میں کلاسیکی انداز اُن کا شاعرانہ فن ہے۔ سادگی، سلاست، موسیقیت اور احساس جمال نے ان کی شاعری کو انمول بنا دیا ہے۔ اُن کا بہت سا کلام ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں آج بھی شامل کیا جاتا ہے۔

دل کو جب بے کلی نہیں ہوتی
زندگی زندگی نہیں ہوتی

سو بار چمن مہکا سو بار بہار آئی
دنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی
اک لحظہ بہے آنسو، اک لحظہ ہنسی آئی
سیکھے ہیں نئے دل نے انداز شکیبائی
یہ بزم محبت ہے، اس بزم محبت میں
دیوانے بھی شیدائی، فرزانے بھی شیدائی

صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم اپنی ذات میں انجمن تھے۔ وہ اِس اعتبار سے بھی خوش قسمت رہے کہ انھیں ان کی زندگی میں بھی پذیرائی حاصل ہوئی۔ وہ ۷ فروری ۱۹۷۸ء کو فوت ہوئے۔ ان کے انتقال سے اردو ادب ایک ''صوفی'' سے محروم ہو گیا۔ ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

شرح صد شعرِ اقبال

پبلشرز: اُردو سائنس بورڈ، لاہور، اشاعت: نومبر ۱۹۷۷ء، صفحات: ۲۷۳، قیمت ۲۰ روپے

علامہ اقبال سے آخری ملاقاتیں

پبلشرز: ماورا پبلشرز ۳ بہاولپور روڈ لاہور، اشاعت: ۱۹۸۹ء، صفحات: ۱۲۸، قیمت: ۵۵ روپے

ooo

غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر

(۱۹۱۲ء۔۲۰۰۵ء)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ۱۹۱۲ء میں جبل پور (سی پی) ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ جبل پور میں ہی ابتدائی حاصل کی۔ ۱۹۲۳ء میں انھوں نے پرائمری کا امتحان پاس کیا۔ نو جماعت تک اسلامیہ ہائی سکول جبل پور میں زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ کالج سے میٹرک اور پھر ۱۹۳۱ء میں انٹر میڈیٹ کیا ۱۹۳۵ء میں ایم اے فارسی، ۱۹۳۶ء میں ایم اے اردو اور ایل ایل بی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں پی ایچ ڈی بھی کر لی جس میں مقالہ کا عنوان ''سید حسن غزنوی'' تھا۔ پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو میں کامیابی کے بعد ۱۹۳۷ء میں کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی (برار) میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں وہ کراچی چلے اور اسلامیہ کالج میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ مولوی عبدالحق نے اردو کالج میں اسے بحیثیت صدر شعبہ اردو مقرر کیا۔ جولائی ۱۹۵۶ء میں سندھ یونی ورسٹی میں صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۴ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد سندھ یونی ورسٹی نے اسے ''پروفیسر امریطس'' کے منصب جلیلہ پر فائز کیا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کی تصنیفات، تالیفات اور تراجم کی بڑی تعداد ہے۔

''سید حسن غزنوی''، ''تاریخ بہرام شاہ غزنوی''، ''چند فارسی شعراء''، ''فارسی پر اردو اثر''، ''مکتوبات شاہ احمد سعید دہلوی''، ''ارشاد رحیمہ''، ''حالی کا ذہنی ارتقاء'' (۱۹۵۶ء) ''تحقیقی مقالات''، ''علمی نقوش'' (۱۹۵۶ء)، ''تفسیر مولانا عبیداللہ سندھی'' (فارسی)، ''رسائل مشاہیر نقش بندی''، ''سندھی اردو لغت''، ''اردو سندھی لغت'' (ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے تعاون سے)، ''انتخابات مکتوبات

حضرت مجدد الف ثانی'' (اردو ترجمہ) اور ادبی مضامین کا مجموعہ ''ادبی جائزے'' وغیرہ سامنے آئے۔ اقبال اور قرآن'' ان کی ایک اہم ترین کتاب ہے۔ جسے اقبالیاتی ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

ادب کی لاتعداد خدمات کے اعتراف میں انھیں کئی تمغات واعزازات سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ۲۰۰۵ء میں اپنے مالک حقیقی کے پاس چلے گئے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان اپنے دوست حمید جالندھری کی وجہ سے اقبال سے رغبت ہوئی۔ یہی وہ رغبت تھی جس نے ان کو ماہر اقبالیات بنا دیا۔ اسی تعلق کی بدولت ''اقبال اور قرآن'' ایسی نایاب کتاب لکھی۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے اقبال کے فارسی اور اردو کلام کو بہت باریک بینی سے نہ صرف پڑھا ہے بل کہ ان میں شامل قرآنی واقعات، تلمیحات، آیات کریمہ اور استعاروں کو بطور خاص نہ صرف تلاش کیا ہے بل کہ ان پر سیر حاصل تجزیاتی مطالعہ بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان سے پہلے بھی کئی اقبال شناسوں نے اقبال اور قرآن کے حوالے سے لکھا ہے لیکن ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے ۱۱۱۸ صفحات پر مشتمل اس موضوع کو خوب نبھایا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے کلامِ اقبال میں آیات قرآنی کو جس خوب صورت انداز میں ڈھونڈ نکالا ہے۔ وہ قابلِ تعریف اور قابلِ ستائش ہے۔ انھوں نے مختلف آیات کو بطور حوالہ پیش کر کے اقبال شناسی اور قرآن حکیم سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ ان کی اس کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال اور قرآن

ناشر: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: ۲۰۱۰ء طبع ہشتم، صفحات: ۱۱۱۸، قیمت ۶۰۰ روپے

ooo

غلام دستگیر رشید، پروفیسر، ڈاکٹر

(۱۹۰۸ء۔۱۹۹۲ء)

پروفیسر ڈاکٹر غلام دستگیر رشید ضلع نلگنڈہ میں مولوی غلام محی الدین کے ہاں ۱۰/اکتوبر ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے۔ حیدر آباد جانے سے قبل انھوں نے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا جبکہ میٹرک کی سند کے حصول کے لیے انگریزی کا امتحان دیا۔ ان کے ہمدم دیرینہ رفیق خواجہ حمید احمد کا کہنا ہے کہ جب غلام دستگیر رشید نے نلگنڈہ سے حیدر آباد جانے کا ارادہ کیا تو مالی مشکلات کی وجہ سے تقریباً ۸۰ میل کا طویل فاصلہ پیدل طے کیا۔ ٹیوشن پڑھا کر اپنے اخراجات کی راہ نکالی۔ ایف اے سے بی اے اور پھر ایم اے کے امتحانات انھوں نے عثمانیہ یونی ورسٹی سے پاس کیے۔ غلام دستگیر رشید نے ۱۹۳۲ء میں ایم اے فارسی کا امتحان نمایاں نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ شعبہ اردو ناگ پور یونی ورسٹی سے بھی ایم اے اردو کیا اور گولڈ میڈل کے حق دار ٹھہرے۔ انھوں نے ''فارسی میں نعتیہ شاعری کا ارتقاء'' کے موضوع پر تنقیدی و تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس مقالہ میں انھوں نے پانچویں صدی ہجری سے لے کر چودھویں صدی ہجری کے طویل عرصہ پر محیط فارسی شاعری کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ ان کا یہ تحقیقی مقالہ تقریباً بارہ سو صفحات پر مشتمل تھا۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید نے یہ مقالہ آٹھ سالہ کی محنتِ شاقہ سے حاصل کیا۔ ان کے اس مقالہ کے حوالے سے ان کے استاد مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے:

> ''شاعروں کی طویل فہرست میں کلام کا انتخاب شعر کی نزاکت اور معنویت کی پرکھ اور اس کے اظہار کا سلیقہ ضمناً ہی سہی خود فارسی شاعری جن تغیرات و انقلابات سے گزری ہے ان

کو سمجھنے اور سمجھانے کی اہلیت، فارسی شاعری اور ادب کے علاوہ اسلامی تصوف کے اسرار و حقائق کے مطالعہ کے بغیر وہ اس مقالہ کی تکمیل میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔''

ان کی خوش قسمتی ہے کہ انھیں مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا عبدالقدیر حسرت، مولانا الیاس برنی سے اکتساب فیض کا موقع ملا۔ انھوں نے حصول علم کے بعد درس و تدریس کا شعبہ اپنایا اور ساری عمر اسی سے وابستہ رہے۔ وہ ایک طویل عرصہ نظام کالج میں فارسی پڑھاتے رہے۔ ۱۹۶۴ء میں بہ حیثیت صدر شعبہ فارسی خدمات انجام دیں اس کے بعد پروفیسر ایمریطس رہے۔ ان کی سب سے اہم کتاب ''تعلیم القرآن'' ہے۔ اس تالیف میں عبدالرحمٰن سعید بھی ان کے معاون رہے۔ اسلامی تہذیب کیا ہے، اسلام کے معاشی تصورات، اسلام کے سیاسی تصورات، اسلامی تقریب وغیرہ جیسے اعلیٰ معیار کے مضامین کو مرتب کر کے شائع کیا۔ ان کے پی ایچ ڈی کے مقالہ کا خاصہ The concept of Perfect Man in Persian Poetry کے نام سے زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید نے جامعہ دارالعرفان کا نصاب مرتب کیا اور اس ادارہ کے صدر نشین رہے۔

ان کا ایک اہم کارنامہ غزلیات رومی پر تاریخی تنقید اور تبصرہ پر مشتمل کتاب ''شمس معنوی'' ۱۹۳۶ء کو شائع ہوئی۔ علامہ اقبال نے اس کتاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ

''تحقیق و ترتیب مواد اور طرزِ استدلال و اظہار لائق داد ہیں۔''

''غرۃ الکمال'' میں انھوں نے خسرو کے دیوان کو کئی ضروری توضیحات اور تشریحات کے ساتھ مرتب کیا۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید کی حیدر آباد میں اقبال شناسی کی ترویج و ترقی کے لیے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے نسل نو کے لیے اقبال کی تفہیم اور اس کے فروغ کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ان کی فکرِ اقبال کے حوالے سے تین کتب شائع ہوئیں جن میں ''آثار اقبال'' (۱۹۴۴ء)، ''حکمتِ اقبال'' (۱۹۴۵ء) اور ''فکرِ اقبال'' (۱۹۴۵ء) شامل ہیں۔ انھوں نے علامہ اقبال سے ''رموز بے خودی'' کے ترجمہ کی اجازت مانگی تو علامہ محمد اقبال نے ۲ مارچ ۱۹۳۵ء کو انھیں لکھا:

''رموز بے خودی'' کا ترجمہ انگریزی اگر آپ کرنا چاہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ البتہ دو باتیں ضرور عرض کروں گا، ایک یہ کہ ترجمہ کی مشکلات اتنی ہیں کہ مترجم کا دل

توڑنے کے لیے کافی ہیں، دوم یہ کہ میں خود ترجمہ کی اصلاح نہیں کرسکتا۔"

علامہ محمد اقبال کے اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزی ترجمہ کی بات کی گئی ہے لیکن ڈاکٹر غلام دستگیر رشید نے انگریزی میں نہیں اردو میں ترجمہ کیا جو شائع نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید نے علامہ کا خط اور ترجمہ رموز بے خودی کا اصل مسودہ حیدر آباد میں اقبال اکیڈمی کو دے دیا۔

غلام دستگیر رشید، علامہ محمد اقبال کے بے حد چاہنے والے تھے وہ اقبال کے لیکچرز سننے کے لیے بھی حاضری دیتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں علامہ اقبال نے منعقدہ ٹاؤن ہال باغ عامہ حیدر آباد لیکچر دیا اس میں ڈاکٹر رشید بھی شریک ہوئے۔ اس کے علاوہ نواب بہادر یار جنگ کے ہاں ہونے والی درس اقبال کی محافل میں بھی شریک ہوتے رہے۔ ان کے لاتعداد مضامین اقبال شناسی کے فروغ میں نہایت معاون ہیں۔ اقبالیات پر ان کی خدمات کے اعتراف میں اپریل ۱۹۵۸ میں اقبال اکیڈیمی حیدر آباد نے ان کی خدمات میں پہلا اقبال ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ غلام دستگیر رشید ۲۵/ اپریل ۱۹۹۲ء کو انتقال کر گئے۔

محمد ظہیر الدین ان کی شخصیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"گہری اور وسیع علمیت کے ساتھ وسعت نظر اور فکری توازن، حکمت اور نکتہ آفرینی، صوفیانہ ذوق اور قلندرانہ مزاج، انکسار اور تواضع، بذلہ سنجی اور خوش مذاقی، طالب علموں کے ساتھ محبت اور شفقت، یہ ڈاکٹر رشید کے خاص اوصاف تھے۔"

ooo

غلام عمر خان، پروفیسر

(۲۱؍اکتوبر ۱۹۲۳ء۔۔۔۔۔۔۔۔)

پروفیسر غلام عمر خان ۲۱؍اکتوبر ۱۹۲۳ء کو محلہ حسینی علم حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سے میٹرک تک انھوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول دار الشفاء سے تعلیم حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان درجہ دوم میں پاس کیا۔ عثمانیہ یونی ورسٹی سے جون ۱۹۳۹ء کو انٹر میڈیٹ میں داخلہ لیا۔ انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد ان کے والد کا اصرار تھا کہ وہ سائنس مضامین پڑھیں اور ریاضی میں ایم اے کریں لیکن ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے سمجھانے پر غلام عمر خان کو اردو اور فارسی کے اختیاری مضامین کے ساتھ بی اے کی اجازت مل گئی۔ غلام عمر خان سارے اساتذہ کے محبوب طالبِ علم بن گئے۔ ڈاکٹر سید سجاد، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، عبد القیوم خان اور اعظم خان سے کسبِ فیض کرتے رہے۔ ان اساتذہ نے غلام عمر خان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ دوسرے درجہ میں بی اے پاس کرنے کے بعد انھوں نے ایم اے اردو میں داخلہ لیا۔ ان دنوں عمر خان جرمن مفکر نتشے سے بہت متاثر تھے۔ ڈاکٹر سید سجاد نے ان کے لیے ایم اے کا مقالہ ''اقبال اور مغرب'' تجویز کیا جس پر انھوں نے تنقیدی و تحقیقی مقالہ لکھا۔ مقالہ کے دوران انھوں علامہ محمد اقبال کو عمیق نظری سے پڑھا اور رائے دی کہ علامہ اقبال بھی نتشے سے بہت متاثر ہیں۔ ان کو احساس ہوا کہ ہمارے ہاں بھی ایک ایسا صاحب بصیرت مفکر موجود ہے جو مغرب کے صف اول کے مفکروں سے کسی طرح کم نہیں۔

پروفیسر عمر خان نے ''اقبال اور مغرب'' کے عنوان پر ایم اے کی سطح کا تحقیقی و تنقیدی مقالہ لکھا تو شعبہ اردو اور حیدر آباد کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کے خوب چرچے ہوئے۔ وہ ایک ذہین

طالب علم کے طور پر مقبول ہوئے۔اس تحقیقی مقالہ کی ایک کاپی آج بھی عثمانیہ یونی ورسٹی کی مین لائبریری میں محفوظ ہے۔ پھر اقبالیات میں ہی انھوں نے پی ایچ ڈی کا موضوع لینے میں دل چسپی کا مظاہرہ کیا۔ پی ایچ ڈی کے تحقیقی وتنقیدی مقالہ کے لیے انھیں ''اقبال کا تصور انسان کامل'' کا موضوع ملا۔ اس میں بھی ڈاکٹر سید سجاد کے مشورے اور تجاویز شامل تھیں۔ ۱۹۵۸ء میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد نظام کالج حیدر آباد میں درس وتدریس سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۷۸ء میں عثمانیہ یونی ورسٹی حیدر آباد کے شعبہ اردو میں ''اقبال چیئر قائم کرنے کا اعلان کیا۔ ہندوستان کی جامعات میں یہ پہلی اقبال چیئر تھی اس اقبال چیئر کے لیے پروفیسر غلام عمر خان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء کو پروفیسر غلام عمر خان عثمانیہ سے وظیفہ پر ملازمت کو خیر باد کہہ دیا۔اس کے بعد آندھرا پردیش میں اوپن یونی ورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو پروفیسر غلام عمر خان کی خدمات آندھرا پردیش اوپن یونی ورسٹی کے لیے حاصل کی گئیں۔ ۱۹۸۷ء میں غلام عمر خان نے ناگزیر حالات کی بنا پر ملازمت چھوڑ دی۔

۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر سید سجاد کی وظیفہ پر ریٹائرمنٹ ہوئی تو پروفیسر عبدالقادر سروری، صدر شعبہ اردو، عثمانیہ یونی ورسٹی مقرر ہوئے۔ پروفیسر غلام عمر خان ۱۹۵۰ء میں پروفیسر عبدالقادر سروری کی صاحبزادی محترمہ زبیدہ کلثوم سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹوں اور ایک لڑکی سے سرفراز کیا۔ ان کا ایک بیٹا خالد عمر خان لندن میں مقیم ہے اور دوسرا بیٹا ڈاکٹر شاہد عمر خان لاس اینجلس، امریکہ میں مقیم ہے جب کہ لڑکی ڈاکٹر عطیہ سلطانہ لیکچرار اردو، زنانہ کالج، کوٹھی حیدر آباد میں درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر عطیہ سلطانہ اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ اپنے والد پروفیسر غلام عمر خان کے ساتھ رہتی ہیں۔

علامہ اقبال کے ہاں عشق انسان کو کمزور نہیں کرتا بل کہ اس کی حرارت اور توانائی میں اضافہ کر کے اسے تسخیر کائنات کی دعوت دیتا ہے۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں نے اپنی کتاب ''اقبال کا تصور عشق'' میں علامہ کے تصور عشق کی بڑے موزوں انداز میں وضاحت کی ہے۔ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن مصنّف نے اس میں اقبال کے تصور عشق کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر دیا ہے۔ بقول مصنّف علامہ کے ہاں وجود انسانی میں عشق کا مقام قلب ہے۔ علامہ کے ساتھ ساتھ دوسرے مفکّرین کے خیالات کا احاطہ کرتے ہوئے غلام عمر خان نے اسلامی نقطۂ نظر اور صوفیاء کے خیالات کا علامہ کے نقطہ نظر سے موازنہ نہایت عمدگی سے کیا ہے۔ جس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ علامہ کے

تمام تصورات کی بنیاد اسلام ہی ہے۔ کتاب کی تمہید ملاحظہ ہو۔

''عہد وسطیٰ میں نشو ونما والے تصوف میں (دو ایک استثنائی صورتوں کے سوا) عشقِ الٰہی کا تصور بھی ترک دنیا اور فنائے ذات کے مخصوص رجحانات کے ساتھ پرورش پاتا رہا ہے۔ اقبال کا تصورِ عشق ان کے دوسرے مابعد الطبیعاتی اور معاشرتی تصورات کی طرح اسلامی بصیرت سے فیض یاب ہے۔ عشق کی اصطلاح کو اقبال نے نہایت وسیع اور ہمہ گیر مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ وہ عالمگیر قوت حیات جسے انیسویں اور بیسویں صدی کے مغربی مفکرین نے (Life Force) سے موسوم کیا ہے جسے ڈارون عزم للبقاء (Will to Live) سے تعبیر کرتا ہے اور شوپن ہار محض ایک اندھا یا بے مقصد عزم (Blind will) کہتا ہے، اور جس کے متعلق نٹشے کا خیال ہے کہ وہ نہ بے مقصد عزم ہے اور نہ محض عزم للبقاء بل کہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے عزم للقوت (will to power) ہے۔ اقبال نے اسی عالمگیر جذبہ یا عزم (Will) کو عشق سے تعبیر کیا ہے اور عشق کے مفہوم میں ایسی جامعیت پیدا کی ہے کہ بے مقصد عزم، عزم للبقاء، عزم للقوت، سب جذبہء عشق کے مختلف مظاہر (Manifestations) کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔''

اس اقتباس سے بہت حد تک علامہ کے تصور عشق کی وضاحت اور مصنف کے زاویہ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب کو مختصر شہ سرخیوں کے ساتھ ۱۵ موضوعات میں تقسیم کیا ہے، جن کا محور و مرکز تصور عشق ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ نے عشق کا جو منظم فلسفیانہ تصور پیش کیا ہے اس نے موجود رُوحِ اسلامی کو جلا بخشی ہے۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں کی یہ مختصر کتاب ان کے اقبال سے عشق کی آئینہ دار ہے۔

اقبال کا تصورِ عشق

پبلشرز: تخلیق مرکز، لاہور، اشاعت: ۱۹۷۸ء، صفحات ۸۰، قیمت ٦ روپے

ooo

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر

(۱۹۲۶ء۔۳راگست ۲۰۱۳ء)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری اردو کے مشہور نقاد، محقق اور ادیب ہیں۔ اردو زبان کی ترویج کرنے والوں میں ان کا نام سرفہرست ہے۔ فرمان فتح پوری کا اصل نام سید دلدار علی تھا۔ وہ ۱۹۲۶ء میں فتح پور (ہسوہ) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں سرکاری مدرسے میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں مدرسہ اسلامیہ فتح پور سے درجہ اوّل میں میٹرک پاس کیا۔ ساتویں پوزیشن حاصل کر کے وظیفے کے مستحق قرار پائے۔ ۱۹۴۸ء میں الہ آباد بورڈ یوپی سے ایف اے، ۱۹۵۰ء میں آگرہ یونی ورسٹی سے بی اے پاس کیا اور ۱۹۵۰ء میں کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔ فرمان فتح پوری نے ۱۹۵۸ء میں ایم اے اردو کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کی۔ اردو میں منظوم داستانوں پر اپنی گراں قدر تحقیق پر ۱۹۶۵ء میں پی ایچ ڈی اور ۱۹۷۴ء میں ''اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری'' کے موضوع پر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ عربی، فارسی، انگلش اور اردو جیسی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ تقریباً ۳۰ سال تک شعبہ اردو جامعہ کراچی سے منسلک رہے۔ ۱۹۸۵ء میں انھیں اُردو ڈکشنری بورڈ کے چیف ایڈیٹر کے عہدہ پر تعینات ہوئے۔ اُردو بورڈ کے سیکرٹری بھی مقرر ہوئے۔ فرمان فتح نے برعظیم پاک و ہند کے معروف ادبی جریدے ''نگار'' کی ادارت بھی کی جو علامہ نیاز فتح پوری نے تقسیم سے پہلے فروری ۱۹۲۲ء میں آگرہ سے جاری کیا تھا۔

فرمان فتح پوری ۱۹۹۶ء میں سندھ حکومت کے سول سروس بورڈ کے رکن بنے۔
ان کی مطبوعات میں ''اُردو رباعی''، ''تدریس اردو''، ''اُردو کی منظوم داستاں''، ''تحقیق و تنقید''،

’’نیا اور پرانا ادب‘‘، ’’نواب مرزا شوق کی مثنویاں‘‘، ’’قمر زمانی بیگم‘‘، ’’زبان اور اردو زبان‘‘، ’’اُردو املا اور رسم الخط‘‘، ’’اردو کی نعتیہ شاعری‘‘، ’’تاویل وتعبیر‘‘، ’’اقبال سب کے لیے‘‘، ’’اردو شعراء کے تذکرے تذکرہ نگاری‘‘، ’’میر انیس حیات اور شاعری‘‘، ’’ارمغان گولک پرشاد‘‘، ’’غالب شاعر امروز وفردا‘‘، ’’دریائے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی مطالعہ‘‘، ’’اردو افسانہ اور افسانہ نگاری‘‘، ’’ہندواُردو تنازع، نیاز فتح پوری دیدہ شنیدہ‘‘، ’’غزلیات غالب شرح ومتن‘‘، ’’عورت اور فنونِ لطیفہ‘‘ اور سینکڑوں مقالات شامل ہیں۔

حکومت پاکستان نے اسے ۱۹۸۵ء میں ’’ستارہ امتیازہ‘‘ سے سرفراز کیا۔

ادبی مجلّہ ’’نگار‘‘ ان کی نگارشات کا ایسا آئینہ ہے جس میں نگر نگر کے شعراء وادباء اپنا نگر آباد کیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے تنقید پر متعدد کتابیں لکھیں۔ ’’اقبال سب کے لیے‘‘ اقبال شناسی کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ کتاب یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی مالی امداد سے اردو اکیڈمی سندھ کراچی اور کراچی یونی ورسٹی کے اشتراک سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کو مواد کے اعتبار سے جامع کہا جا سکتا ہے۔ کتاب کا عنوان ’’اقبال سب کے لیے‘‘ اس لیے رکھا گیا کہ یہ کتاب چھوٹے بڑے، بوڑھے، جوان، تعلیم یافتہ اور نیم تعلیم یافتہ، طلباء واساتذہ، اور اہلِ علم اور ناقدین، مبصرین سب ہی فیض یاب ہو سکتے ہیں۔

فرمان فتح پوری ۸۷ سال کی عمر میں ۳ اگست ۲۰۱۳ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کے پس ماندگان میں اہلیہ چار لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں۔ ان کی مشہور زمانہ اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال سب کے لیے

پبلشرز: اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی، اشاعت: ۱۹۷۸ء، صفحات ۵۲۸

ooo

فقیر سیّد وحید الدین

(۱۹۰۴ء۔۱۴جولائی ۱۹۶۸)

فقیر سید وحید الدین لاہور کی معروف فقیر فیملی کے فرد تھے۔ کرنل فقیر سید وحید الدین ۱۹۰۴ء کولاہور میں پیدا ہوئے۔ ممتاز ادیب کے حوالے سے شہرت پائی۔ ان کو زیادہ تر شہرت اقبال کے حوالے سے حاصل ہوئی۔ ان کے والدِ گرامی کا نام فقیر سیّد نجم الدین تھا۔ جد امجد فقیر عزیز الدین مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر اعظم تھے۔ فقیر سید وحید الدین نے میٹرک لاہور اور بی اے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے پاس کیا۔ تیرہ برس کی عمر میں ان کی ملاقات علامہ اقبال سے ہوئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے گرویدہ ہو گئے۔

۱۹۲۸ء میں ریلوے میں ملازمت اختیار کی۔ دوسری جنگِ عظیم کے وقت ۱۹۴۰ء میں انڈین فوج میں کمیشنڈ آفیسر بھرتی ہوئے۔ ۱۹۴۳ء میجر کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے اور ایم بی ای کا خطاب انگریز حکومت سے ملا۔ انگریز انچیف فیلڈ مارشل آکن لیک نے ان کو عمدہ خدمات کے صلہ میں ایک تلوار بطور تحفہ دی اور کرنل کے عہدہ پر فائز کیا۔ ۱۹۴۵ء میں سابق فوجیوں کی بحالی اور آبادکاری کے لیے مشیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ پھر صوبہ بمبئی و مدارس میں ڈپٹی ریجنل کمشنر تعینات ہو کر بمبئی آ گئے۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان تشریف لے آئے اور ایک تجارتی کمپنی بنائی۔

فقیر سید وحید الدین کے والدِ گرامی فقیر سیّد نجم الدین اور علامہ اقبال کا گہرا تعلق تھا۔ وہ اقبال کی ذاتی زندگی سے اچھی طرح واقف تھے، اور ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں سے جو کہ عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں، آگاہ تھے۔ ''روزگار فقیر'' اقبال کی زندگی اور شخصیت کے انھیں

پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے۔ نجم الدین کے صاحبزادے فقیر سید وحید الدین نے اپنے والد اور علامہ کی محفلوں اور صحبتوں کا بہت قریب سے مطالعہ کیا "روزگار فقیر" انھی یادداشتوں کا گلدستہ ہے، جس میں علامہ کی زندگی کے مختلف واقعات رنگ برنگ پھولوں کی صورت میں کیف آور مہک سے لبریز ہیں۔

"روزگار فقیر"، پہلی دفعہ ۱۹۵۰ء میں شائع ہوئی اور اپنے عہد کی بہترین کتاب کہلائی۔ علمی وادبی حلقوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اقبالیات کے حوالے سے "روزگار فقیر" کا حصہ اول بہت مقبول ہوا۔ معروف کتب میں "انجمن"، "اقبال تصویروں میں"، "روزگار فقیر" (اول)، "روزگار فقیر (دوم) اور محسن اعظم ومحسنین" شامل ہیں۔ اپنے ہم عصر مشاہیر کے بارے میں ذاتی تاثرات پر مبنی خاکوں کا ایک مجموعہ "انجمن" کے نام سے شائع کیا۔ ۱۴جولائی ۱۹۶۸ کو وفات پائی۔ ان کی اقبالیاتی کتب کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

روزگار فقیر (جلد اول)

(شاعر مشرق سے چند ملاقاتوں کی یادداشت)

پبلشرز: آتش فشاں، لاہور، اشاعت: بار اول ۱۹۵۰ء، بار دوم جنوری ۱۹۸۸ء، صفحات ۲۶۸، قیمت ۷۵ روپے

روزگار فقیر (جلد دوم)

(شاعر مشرق کے واقعات، نادر اشعار اور تصاویر کا مجموعہ)

پبلشرز: آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت: بار اول ۱۹۶۴ء، بار دوم جنوری ۱۹۸۸ء، صفحات ۲۴۰، قیمت ۱۲۵ روپے

ooo

فیض احمد فیض

(۱۹۱۱ء۔۱۹۸۴ء)

اُردو ادب پر شاعری اور نثر میں جس شخصیت کا فیض عام جاری ہے وہ فیض احمد فیض ہیں۔لاتعداد کشتگانِ شعر وسخن نے ان سے فیض حاصل کیا۔ان کے فیض کی وجہ سے ترقی پسند تحریک نے فیض حاصل کیا۔علمی و ادبی اور سیاسی افق پر ان کا نام زندہ و پائندہ ہے۔فیض احمد فیض نے ۱۳فروری ۱۹۱۱ء کو''کالا قادر''،ضلع سیال کوٹ میں آنکھ کھولی اور چار برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنا شروع کر دیا۔۱۹۲۷ء میں مشن ہائی سکول سیال کوٹ سے میٹرک کیا۔ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے محسن استاد مولوی سید میر حسن سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے اور ۱۹۳۴ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے عربی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔۱۹۳۵ء میں امرتسر کے ایم اے او کالج میں فیض احمد فیض کا تقرر بحیثیت لیکچرر ہوگیا۔
۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر اور دیگر ترقی پسند تخلیق کاروں کے ساتھ مل کر''انجمن ترقی پسند مصنفین''کی بنیاد رکھی۔وہ لندن اور ہندوستان کے شاعروں ادیبوں کے مابین ایک رابطہ کار تھے۔ ۱۹۳۸ء میں اُنھوں نے ماہنامہ''ادبِ لطیف''کے مدیر کی حیثیت سے ایک نئے ولولے اور جوش سے کام کیا۔۱۹۴۰ء میں وہ کالج آف کامرس لاہور میں انگریزی کے لیکچرار مقرر کیے گئے۔قرارداد پاکستان کے دنوں میں اُنھوں نے اپنے قلم سے شعوری انقلاب کے لیے کام کیا۔۱۹۴۱ء میں مس ایلس جارج سے شادی ہوئی۔۱۹۴۲ء میں فوج میں بھرتی ہوئے اور بطور کیپٹن، میجر (۱۹۴۳ء) اور کرنل (۱۹۴۴ء) کے عہدے تک خدمات انجام دیں۔۱۹۴۷ء میں فوج سے استعفیٰ دے دیا۔وہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک

روزنامہ ''پاکستان ٹائمز''، ''امروز'' اور ہفت روزہ ''لیل ونہار'' کے مدیر رہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۹۴۸ء میں اُنھوں نے بطور مزدور رہنما ''سان فرانسسکو'' امریکہ میں منعقدہ عالمی اجلاس میں شرکت کی۔ ۱۹۵۰ء میں ٹریڈ یونین فیڈریشن کے صدر منتخب ہوئے۔ لندن سے واپسی پر عبداللہ ہارون کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔

۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خاں کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی سازش میں گرفتار ہوئے اور دیگر ترقی پسند شخصیات کے ساتھ ہی اُنھیں جیل کا منہ دیکھنا پڑا۔ ۲۰/اپریل ۱۹۵۵ء کو رہائی ملی لیکن قید کی یہ صعوبتیں اُن کے ذہنی لاوے کو کم نہ کرسکیں اور اِس آشفتہ سری کی وجہ سے ۱۹۵۸ء میں پھر گرفتار ہوئے اور ۱۹۵۹ء میں رہائی پائی۔ فیض احمد فیضؔ مرنجاں و مرنج شخصیت کے مالک تھے۔ اس لیے ادبی، علمی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی حلقوں میں بہت مقبول تھے۔ اُنھوں نے بہت سے ریڈیو ڈرامے بھی لکھے اور متعدد فلموں کے گانے بھی ...... اِن گانوں کی وجہ سے فلمی دنیا ان کی گرویدہ ہوگئی اور وہ اس میدان میں شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگے۔

فیضؔ کی شاعری میں اخترؔ شیرانی کی طرح شبنمی رنگ بھی موجود تھا اور جوشؔ کی طرح انگاروں کی حدت بھی تھی لیکن اُن کی شاعری ظاہر تو شبنم تھی اور باطن میں شعلہ تھی لیکن ظاہر کی شبنم اسی شعلے کی تھی، جو لاوے کا حصہ تھی۔ فیض احمد فیضؔ کے اندر خون پسینہ بہانے والے مزدوروں کو دیکھ کر ایک مدت سے کڑھ رہا تھا لیکن وہ پھر بھی پرامید تھا۔ فیضؔ کے اساتذہ کرام پطرسؔ بخاری اور صوفی تبسم ہیں اور صوفی تبسمؔ بہتر جانتے ہوں گے کہ ان کی شاعری میں ''مارکس ازم'' کا اثر کب غالب ہوا لیکن اتنا ضرور ہے کہ انھیں مذہب سے بہت لگاؤ تھا۔

اُن کی لاتعداد شعری تخلیقات اُن کے نام کو ہمیشہ زندہ و جاوید رکھیں گی۔ نقش فریادی ۱۹۴۱ء۔ دستِ صبا ۱۹۵۲ء۔ زنداں نامہ ۱۹۵۴ء۔ دستِ تہ سنگ ۱۹۶۵ء۔ سروادیٔ سینا ۱۹۷۱ء۔ شام شہر یاراں ۱۹۷۸ء۔ میرے دل میرے مسافر ۱۹۸۱ء۔ کلام فیض ۱۹۸۲ء۔ اور نثری فن پاروں میں۔ میزان (تنقیدی مضامین) ۱۹۶۲ء۔ صلیبیں میرے دریچے میں (خطوط) ۱۹۷۱ء۔ متاع لوح و قلم ۱۹۷۳ء۔ ہماری قومی ثقافت ۱۹۷۶ء۔ مہ و سال آشنائی ۱۹۸۰ء۔ سفرنامہ کیوبا ۱۹۷۴ء۔ علاوہ ازیں ''نسخہ ہائے وفا'' اور ''سارے سخن ہمارے'' دو کلیات ہیں۔

علامہ محمد اقبال کے بعد ن م راشدؔ، جوشؔ ملیح آبادی، یاس یگانہؔ، میراجی ایسے شاعر تھے،

جنھوں نے سادگی کو اپنا کر اپنے قارئین سے دادِ تحسین پائی لیکن اِن میں فیض کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے۔ جو سادگی کے ساتھ دلوں کی طرف بڑھ سکتے۔ مفہوم کے بغیر شعر بے روح جسم کی مانند ہے۔ اچھا شعر ''سپر سونک'' طیارے کی طرح ہوتا ہے جس کی آواز بعد میں سنائی دیتی ہے۔ اس طرح فیض کی شاعری میں غنایت بدرجہ اتم موجود ہے جس کے اثرات قاری کے ذہن پر مسلط رہتے ہیں۔ فیض کا ہر شعر مسحور کُن اور پُرکشش ہے اس کے مفہوم کو سمجھے بغیر بھی اِس سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ بعض ناقدین نے فیض احمد فیض کے فن میں نقائص بھی تلاش کیے ہیں، علمِ عروض کی خامیاں بھی نکالی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ان کی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کا نتیجہ تھا۔ کیوں کہ اُن کی سیاسی زندگی ان کی ادبی زندگی پر حاوی ہو چکی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ شاعری کو گھسیٹ کر سیاسی ڈرائنگ روم کی کانچ کی کرسی پر بٹھانا چاہتے تھے لیکن اُنھوں نے ایسا کرتے ہوئے بھی فن کو مرنے نہیں دیا۔

فیض احمد فیض کی زندگی سے ہمیں درس ملتا ہے کہ انسان کو مخالفتوں کے ہجوم میں بھی ہمیشہ اپنے وقار کو بلند رکھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کسی اعتراض کا تلخ جواب نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص اُن کی ذات سے نالاں نہیں تھا۔ اُن کے بڑے بڑے مخالفین بھی اُن کا تہہِ دل سے احترام کرتے تھے۔

۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء بروز منگل، دن ایک بجکر ۱۵ منٹ پر میو ہسپتال میں انتقال فرما گئے۔ ان کی ایک اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

انتخاب پیامِ مشرق (منظوم اُردو ترجمہ)

ناشر: اقبال اکادمی پاکستان۔ لاہور، اشاعت: ۱۹۷۷ء، صفحات: ۲۱۱

○○○

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

(۱۸۹۰ء۔۱۹۵۵ء)

سیاسی وسماجی اعتبار سے جوناگڑھ تقسیم ہند سے پہلے برعظیم پاک و ہند میں اہم مقام کا حامل رہا۔ جوناگڑھ کی ایک منفرد ادبی حیثیت بھی ہے۔ جوناگڑھ کو جن لوگوں نے ادبی شناخت عطا کی، ان میں قاضی احمد میاں اختر کا نام بھی سرفہرست ہے۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھ میں ۱۸۹۰ء میں عبداللہ میاں کے ہاں پیدا ہوئے ان کا تعلق زمیندار گھرانے سے تھا۔ ان کے دادا کا نام قاضی سلیمان تھا۔ ان کے جدامجد فرخ سیر کے عہد میں سندھ سے ہجرت کر کے جوناگڑھ میں مقیم ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ایف اے تک حاصل کی۔ ایف اے علی گڑھ سے پاس کیا۔ انھیں ریاست جوناگڑھ سے بھاگ کر پرتگال کے زیرانتظام بحر ہند کے شہر ''دیو'' میں سکونت اختیار کرنا پڑی۔ ۱۹۴۹ء میں کسمپرسی کی حالت میں پاکستان آئے۔

قاضی اختر جوناگڑھی اردو، فارسی، عربی اور اسلامیات کے مستند عالم، ماہر لسانیات اور کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ قاضی صاحب نے مسلمان مفکروں، موجدوں اور سائنسدانوں پر سب سے پہلے کام کیا۔ تحریک پاکستان میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جوناگڑھ کے میئر بھی رہے۔ اس کے علاوہ سیکرٹری نواب آف جوناگڑھ بھی خدمات انجام دیں۔ صدر جمعیت المسلمین کاٹھیاواڑ بھی منتخب ہوئے۔ اس حیثیت سے انھوں نے ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد صدر کاٹھیاواڑ مسلم لیگ بھی مقرر ہوئے اور دو سال یعنی ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۲ء کام کیا۔ جوناگڑھ سے ہی ''شہاب'' کا بھی اجراء کیا۔ یہ رسالہ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۴ء تک چھپتا رہا مگر پھر نامساعد حالات کی وجہ

سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ سال بھر کی اشاعت نے کئی سینئر اور سنجیدہ طبقہ کی خوب توجہ حاصل کی۔ ایرانی شعرا کے دواوین بھی مرتب کیے جن میں سے ایک ایران میں شائع ہوا۔ چند نایاب مضامین کو "مقالات اختر" کے نام سے شائع کیا۔ دیگر قابل ذکر تصانیف میں "انارکلی"، "طبقات"، "الامم"، "اسلام کا اثر یورپ پر"، "اسلامی کتب خانے"، "اسلامی کتب خانے اور ان کا نظم و نسق"، "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ"، "حیات نظامی"، "زرگل"، "سیپارہ دل"، "علم اور اسلام"، "علامہ شبلی بحیثیت شاعر"، "لمحات اختر"، "مسلمانان سلف میں مطالعۂ کتب کا شوق" شامل ہیں۔

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے اقبال کے فکروفن پر لکھے گئے کئی منفرد نوعیت کے مضامین "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ" میں پیش کر کے اقبالیاتی ادب میں اپنی شمولیت کا اعلان کر دیا ہے۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آیا ہے۔ یہ مضامین اپنی افادیت کے اعتبار سے منفرد اور تحقیقی ہیں۔ ہر مضمون اپنی جگہ ایک کتابی حیثیت میں ہے۔ اس لیے اقبال اکادمی نے مصنّف کی وفات کے بعد ان کے ان مضامین کو کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ اقبال اکادمی کا یہ اقدام قابل ستائش ہے۔ عمومی طور پر شعرا، ادبا کو ان کی وفات کے بعد فراموش کر دیا جاتا ہے لیکن قاضی میاں اختر خوش بخت ہیں کہ ان کے انتقال کے بعد بھی اقبال اکادمی نے ان کے مضامین کو اہمیت دی ہے۔

اقبال اکیڈمی کے ایماء پر قاضی احمد جان اختر جوناگڑھی نے یہ مضمون تحریر کرنا شروع کیا تو مضمون کی طوالت بڑھتی ہی چلی گئی اور یوں ایک پوری کتاب کا مواد ہوگیا۔ چوں کہ اس موضوع پر پہلے کوئی کتاب دستیاب نہ تھی لہٰذا "اقبالیات کا تنقیدی جائزہ" کو اس حوالے سے اولیت بھی حاصل ہے۔ قاضی احمد میاں اختر نے کمال ہنرمندی سے اس کتاب کو مکمل کر کے اقبالیاتی ادب میں ایک خوب صورت اضافہ کیا ہے۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ۶ راگست ۱۹۵۵ء کو حیدر آباد میں انتقال کر گئے۔ انھیں میوہ شاہ کراچی میں دفن کیا گیا۔ ان کی اقبالیات کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبالیات کا تنقیدی جائزہ

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت طبع اول ۱۹۵۵ء طبع دوم ۱۹۷۷ء، صفحات: ۱۸۸

ooo

قمر رئیس، ڈاکٹر

(۱۹۳۲ء۔۲۰۰۹ء)

قمر رئیس ۱۹۳۲ء کو شاہ جہاں پور، یوپی انڈیا میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام مصاحب علی خاں تھا۔ آگرہ یونی ورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے ایل ایل بی پاس کیا۔ ناگ پور یونی ورسٹی سے قمر رئیس نے ۱۹۵۶ء میں ایم اے اردو اور ۱۹۵۸ء میں علی گڑھ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اعلیٰ ڈگری بھی حاصل کر لی۔ ۱۹۵۹ء میں دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرر تعینات ہوئے۔ ۳۹ سال کی ملازمت کے بعد ۱۹۹۷ء میں بحیثیت پروفیسر ریٹائرمنٹ لی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ جامعہ اسلامیہ ملیہ دہلی میں بطور مہمان پروفیسر پڑھاتے رہے۔

ان کی معروف کتب میں ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ''، ''پریم چند، فکر و فن''، ''تلاش و توازن''، ترجمہ کا فن روایت''، ''اردو میں لوک ادب''، ''نیا افسانہ، مسائل اور رجحانات''، اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت''، ''پریم چند: شخصیت اور کارنامے''، ''مضامین پریم چند''، ''تعبیر و تحلیل''، ''رتن ناتھ سرشار''، ''اُردو کے نمائندہ افسانے''، ''ازبکستان اور علی شیر نوائی'' اور ''اقبال کا شعور و فن'' شامل ہیں۔

''اقبال کا شعور و فن (عصری تناظر میں) ان مقالات کا مجموعہ ہے جو صد سالہ جشن اقبال کے موقع پر دہلی یونی ورسٹی کے شعبہ اردو کی طرف سے منعقدہ ایک مذاکرہ میں پڑھے گئے۔ اس مذاکرے میں حاضرین نے بھی بحث کر کے بہت سے نئے گوشوں متعارف کروائے ہیں۔

کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا چھ مقالات اور دوسرا حصہ پانچ مقالات کا مجموعہ ہے۔ جن میں اقبال کے فکر و فن پر علمی اور معروضی انداز میں نظر ڈالی گئی ہے۔ ان مقالات میں اس بات کا

خیال رکھا گیا ہے کہ علامہ کے فکر وفن کا جائزہ ان کے عہد کے تناظر میں لیا جائے۔

ڈاکٹر قمر رئیس صدر شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی انڈیا تحقیق کے میدان میں غیر معمولی شہرت کے حاصل ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کے فروغ کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا ذہن اقبال کے شاہین کی طرح محو پرواز رہتا ہے۔ وہ بھی اپنے مفکرانہ، عالمانہ اور محققانہ خیالات سے نت نئے موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں۔ دہلی میں شاعر مشرق علامہ محمد اقبال کو ہدیہ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک عظیم تقریب ان کے اقبالیات سے گہرے شوق اور لگن کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے نہ صرف اس تقریب کا اہتمام کیا بل کہ ان مقالات کو ضابطہ کتاب میں لاکر اقبالیاتی ادب کو سیراب کیا ہے۔ اقبالیات پر اب تک بہت سا کام ہو چکا ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر علامہ اقبال کے فکر وفن کے مخفی گوشے اجاگر ہو رہے ہیں۔ اس اعتبار سے ''اقبال کا شعور وفن'' ایسی کتاب ہے جس کا مطالعہ اقبال کے شائقین کو اقبال کے فکر وفن اور ان کے نظریۂ فن سے آگاہ کرتا ہے۔ فروغ فکرِ اقبال کے لیے دہلی یونی ورسٹی شعبہ اردو کی یہ کاوش قابلِ تحسین ہے۔

انھیں علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ اور ہندی اردو ادب ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروفیسر ڈاکٹر قمر رئیس ۲۰۰۹ء میں انتقال کر گئے۔ ان کی اقبال کے حوالے سے کتاب کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

اقبال کا شعور و فن (عصری تناظر میں)

پبلشرز: شعبہء اردو دہلی یونی ورسٹی دہلی، اشاعت: مئی ۱۹۷۹ء، صفحات ۱۹۲، قیمت: ۵۰ روپے

ooo

گوہر ملسیانی

(۱۵جولائی ۱۹۳۴ء۔۲۵/اپریل ۲۰۱۷ء)

بزرگ شاعر و ادیب، تحریکِ پاکستان کے کارکن گوہر ملسیانی (میاں محمد طفیل) ولد چودھری صدر الدین جالندھر کے قصبے ملسیان میں ۱۵جولائی ۱۹۳۴ءکو پیدا ہوئے اور ملسیان کو اپنے نام کا حصہ بنالیا۔ وہ اپنے قصبہ سے محبت اور والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تعلیم کا آغاز اپنی والدہ کی سرپرستی میں کیا۔ چار سال کی عمر میں گورنمنٹ پرائمری سکول ملسیان میں داخلہ لیا۔ جماعت چہارم کے بعد گورنمنٹ ماڈل مڈل ورنیکلر سکول میں داخلہ لیا۔ مڈل کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول نکودر میں انگریزی تعلیم حاصل کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد اپنی خالہ عائشہ بیگم کے ہمراہ احمد پور شرقیہ آگئے۔ گورنمنٹ صادق ایجرٹن ہائی سکول احمد پور شرقیہ میں داخلہ لیا۔ میٹرک کے بعد وہ EB۱۴۲ ساہیوال گاؤں میں اپنے والدین کے پاس آگئے۔ ۱۹۵۶ء میں ادیب فاضل مکمل کیا تو ۲۲ ستمبر ۱۹۶۰ء کو شریفہ بیگم کے ساتھ نکاح شریف بھی ہوگیا۔ شادی کی مصروفیت کے باوجود اُنھوں نے ۱۹۶۱ء میں ایف اے اور ۱۹۶۳ء میں بی اے کرنے کے بعد گورنمنٹ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ اُنھوں نے یکم اکتوبر ۱۹۶۴ء کو گورنمنٹ مڈل سکول چک نمبر ۲۰۶ پی صادق آباد میں بطور ہیڈ ماسٹر خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ حصولِ علم کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۶۶ء میں ایم اے اُردو اور ۱۹۷۱ء میں ایم اے انگریزی کر ڈالا۔ ۱۹۸۵ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے ایم ایڈ کی ڈگری سمیٹ لی۔ ۱۹۹۳ء میں راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) کے ساتھ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے اقبالیات میں ایم فل بھی کرلیا۔ یاد رہے! گوہر ملسیانی ۱۹۸۲ء میں اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر تحصیل احمد پور شرقیہ

ضلع بہاولپور مقرر ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی سکول چک نمبر ۱۵۸ اپی میں بطور ہیڈ ماسٹر تعینات ہوئے۔ ۱۵ جولائی ۱۹۹۳ء کو ملازمت مکمل کر لی۔

گوہر ملسیانی قلیل علالت کے بعد ۲۵ را پریل ۲۰۱۷ء کو انتقال کر گئے۔ اُنھیں ۲۶ر اپریل کو خانیوال میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ایک بیوہ، چار بیٹیاں اور دو بیٹے سوگوار ہیں۔ بڑے بیٹے شاہد محمود ایم اے سیاسیات، اور بی ایڈ مکمل کرنے کے بعد شعبۂ تدریس سے وابستہ ہیں۔ ساجد محمود گوہرا یم اے اُردو کرنے کے باوجود تجارت سے وابستہ ہیں۔

راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) کا علامہ رشک ترابی کی وساطت سے ان سے رابطے کا ذریعہ ان کا ادبی جریدہ ''عکس صادق'' ثابت ہوا۔ صادق آباد کی وجہ شہرت کچھ اور ہو نہ ہو گوہر ملسیانی کی گوہر نایاب شخصیت ضرور ہے۔ درس و تدریس کے علاوہ انھوں نے شعر وسخن میں بہت کمال حاصل کیا۔ انھیں علامہ اقبال سے والہانہ عقیدت ہے۔ اسی لیے انھوں نے ان محرکات کا تجزیہ کیا ہے جن سے گزر کر شیخ محمد اقبال، علامہ اقبال کے روپ میں سامنے آئے۔ گوہر ملسیانی کا فرسِ قلم حمد نگاری، نعت گوئی، غزل، قطعہ نگاری، نظم گوئی کی اقلیم میں خوب دوڑتا ہے۔ گوہر ملسیانی نے بچوں کے لیے بھی تقریباً آٹھ نایاب کتابیں تصنیف کی ہیں۔ بچوں کے لیے لکھنا بہت مشکل کام ہے مگر اس مشکل کام کو گوہر ملسیانی نے کمال ہنر مندی سے آسان انجام دیا ہے۔ اطفال ادب کے حوالے سے ان کی کتابوں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ قارئین کی دل چسپی کے لیے گوہر ملسیانی کی چند کتب کا تذکرہ ضروری ہے۔ '' آفتاب آگہی کا سلسلہ''، '' ارمغانِ شوق''، ''اقبال کی نظمیں''، '' اقبال، علامہ اقبال کیسے بنے؟''، ''انتخاب کلامِ شکیل بدایونی''، ''پھول اور کانٹے''، ''جذباتِ شوق''، ''جلتی رُتوں کی یاد''، ''حرمین شریفین کی فضاؤں میں''، ''حضرت خالدؓ بن ولید''، ''روشن کرنیں''، ''سخن کا چراغ، رفیع الدین رازؔ''، ''سلطان صلاح الدین ایوبی''، ''سیرتِ ہادی برحق ﷺ''، ''شوقِ شہادت زندہ ہے''، ''شیر شاہ سوری''، '' طارق بن زیاد''، ''عصرِ حاضر کے نعت گو''، ''غم اعلیٰ''، '' کاروانِ خیال''، '' متاعِ شوق''، '' مظہرِ نور''، '' یادوں کے گلاب''۔ تصنیف و تالیف کا سلسلہ تادمِ آخر جاری رہا۔ ۱۹ جون ۲۰۱۷ء کو فون پر گوہر ملسیانی کی بیوہ اور بیٹے سے فون پر بات ہوئی تو اُنھوں نے بتایا کہ مرحوم آخری سانس تک قرطاس وقلم سے جڑے رہے۔ گوہر ملسیانی سے راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) کی جب بھی فون پر بات ہوئی تو اُنھیں تازہ دم پایا۔ پاکستان اور اکابر سے اُنھیں عشق تھا۔ پاکستانیت اُن میں کوٹ کوٹ

بھری تھی۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں لیکن اُن کی تحریریں اُنھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ سے اُن کی محبت فطری تھی۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال سے گوہر ملسیانی کا رشتہ ادیب اور قاری کا رشتہ ہی نہیں بل کہ ان کے درمیان ایک ایسی محبت بھی موجود ہے جو نہ صرف روز افزوں ترقی رہی بل کہ یہ محبّت نئے رنگوں اور نئے زاویوں سے ظاہر بھی ہوئی۔ گوہر ملسیانی کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ پرانی اور گھسی پٹی باتوں کو دُہرانے کے بجائے نہ صرف اپنا زاویۂ نظر پیش کرتے ہیں بل کہ کچھ نئے پہلو بھی سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

گوہر ملسیانی وادیِ ادب کا ایک ایسے شہ سوار تھے جو مختلف محاذوں پر صف آرا رہے۔ اُنھوں نے ہر محاذ پر کامیابی کے پرچم لہرائے۔ تاہم ان کا توانا حوالہ اقبال ہے۔ انھوں نے اقبال پر لکھتے ہوئے ہمیشہ دلی وابستگی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ وہ اقبالیات پر کام کرتے ہوئے نہ صرف فخر محسوس کرتے بل کہ اقبال ایسے پارس سے مس ہو کر کندن بننے کی خواہش بھی اُن کے اندر جنم لیتی رہتی۔

اقبال پر لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا لوگ سمجھتے ہیں۔ اقبال پر وہی شخص لکھ سکتا ہے جو من کا سچا اور کھرا ہو۔ گوہر ملسیانی بڑے خوش قسمت ہیں جو اقبال کو اپنی ذات کا حوالہ بنانے کا عزم رکھتے ہیں۔ ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال: علامہ اقبال کیسے بنے؟

پبلشر: گوہر ادب پبلی کیشنز صادق آباد، اشاعت: اول ۱۹۹۸ء، صفحات: ۱۷۶، قیمت: ۱۰۰ روپے

اقبال اور معارفِ اسلام

ناشر: راحیل پبلی کیشنز، کراچی، اشاعت: ۲۰۱۶ء، صفحات: ۴۱۶، قیمت: ۶۰۰ روپے

ooo

گیان چند جین

(۱۹۲۳ء۔۲۰۰۷ء)

معروف ہندوستانی ماہر لسانیات، محقق اور بلند پایہ نقاد گیان چند جین ضلع بجنور کے ایک قصبے میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے آخر عمر میں ایک متنازعہ کتاب لکھ کر پاک و ہند کے ادبی حلقوں میں زبردست ہلچل پیدا کی۔ وہ غالباً پہلے شخص تھے جنھوں نے جدید لسانیاتی اصولوں کے مطابق اردو زبان کا تجزیہ کیا۔ چودہ برس کی عمر میں غافل کے تخلّص کے ساتھ شاعری کا آغاز کردیا۔ شروع میں غزل کی طرف رغبت رہی۔ کالج اور یونی ورسٹی سے فارغ ہوکر انھوں نے حمیدیہ کالج بھوپال میں درس وتدریس کا کام شروع کیا اور کچھ عرصے میں شعبۂ اُردو کے صدر بن گئے۔ ۱۹۵۶ میں جب اس کالج میں بی کلاسیں شروع ہوئیں تو نصاب میں ایک پرچہ لسانیات کا بھی تھا۔ اس وقت اردو میں توضیحی لسانیات پر کوئی مبسوط اور جامع تحریر موجود نہیں تھی جب کہ انگلش میں بلوم فیلڈ کی کلاسیکی کتاب کے علاوہ گلیزن جونیئر کی معرکتہ الآرا کتاب بھی تین سال قبل منظر عام پر آچکی تھی۔ گیان چند نے یہ خلا پر کرنے کا عزم کیا۔ ۱۹۶۲ء میں ان کا تبادلہ جموں ہوا، تو نئے سرے سے تحقیق شروع کی۔ تاہم اردو لسانیات کے موضوع پر کتاب مرتب کرنے کا خواب ۱۹۷۵ء میں ''عام لسانیات'' کی شکل میں پورا ہوا۔

اس کتاب میں انسانی زبان کی عمومی خصوصیات اور زبان کے تاریخی ارتقاء کے ساتھ ساتھ لسانیات کی مختلف شاخوں مثلاً لسانی فردیات، لسانی، عتیقیات، نسلی لسانیات، علاقائی لسانیات، سماجی لسانیات وغیرہ، جسے ادق تکنیکی موضوعات پر لکھا گیا۔ گیان چند کی دوسری اور نہایت متنازعہ کتاب ''ایک بھاشا دو لکھاوٹ'' ۲۰۰۵ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ

ہی دھواں دھار بحث مباحثوں کا سلسلہ چل پڑا۔ ہندی اردو تنازعے کے تناظر میں یہ ہندوستانی ادبی اور علمی حلقوں میں ایک بہت بڑا دھماکہ تھی۔

گیان چند نے ہر اس شخص کو تنقید کا نشانہ بنایا جس نے رائے دی کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور اردو و ہندی دو الگ الگ زبانیں ہیں۔ حتیٰ کہ سر سید احمد خان کو بھی نشانہ بنایا۔ ان کی نظر میں اردو کی تحریک کا مقصد پاکستان بنانا تھا۔

انگلش میں گیان چند کی کتاب "My experiments with untruth" (۲۰۰۱ء) میں شائع ہوئی۔ گیان چند ۲۰۰۷ء کو دنیا سے کوچ کر گئے۔

گیان چند جین کا مقام و مرتبہ اردو تحقیق و تنقید میں بہت بلند ہے۔ تحقیق و تنقید سے تعلق رکھنے والے گیان چند کے نام سے بخوبی واقف ہیں۔ اردو تحقیق اور تنقید میں ایک عرصہ تک ریاضت کی ہے۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نغز گو تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اقبال پیدائشی شاعر تھے تو غلط نہ ہوگا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اقبال اپنے کلام کے خود نقاد بھی تھے۔ وہ خوب سے خوب تر کے متلاشی رہتے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی کلام کا بہت سا حصہ متروک کیا۔ کلامِ اقبال کے بہت سے محافظین نے منسوخ شدہ کلام کی جمع و تدوین کے لیے بہت محنت کی۔ ڈاکٹر گیان چند، اردو زبان کے مبلغ تھے۔ ان کا تحقیقی سرمایہ پاکستان اور ہندوستان میں محفوظ ہے۔ انھوں نے اردو یونی ورسٹی آف حیدر آباد دکن میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ اقبالیاتی ادب میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ انھوں نے اقبال شناسی کے باب میں کئی اہم کتب مرتب کیں۔

اقبال کا متروک شدہ کلام وقتاً فوقتاً جرائد و رسائل میں شائع ہوتا رہا۔ مختلف مقامات پر اس منتشر کلام کو یکجا کرنے کے لیے کئی محققین نے اپنی خدمات انجام دیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صابر کلوروی اور ڈاکٹر عبدالواحد معینی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ معروف نقاد ڈاکٹر گیان چند نے علامہ کے ابتدائی کلام کو مہ و سال کی ترتیب سے پیش کیا ہے۔ منسوخ و متروک کلام کی تلاش اہم کام تھا جس کے لیے ڈاکٹر گیان چند نے سخت محنت کی۔ انھوں نے یہ منسوخ کلام یکجا کر کے نہایت قابل قدر ادبی خدمت انجام دی ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے تنقید کی تعریف میں یہ بات بھی شامل کی ہے کہ تنقید کا منصب شعرا کرام کو زندہ رکھنا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند یہ فریضہ بڑی محبت سے انجام دیا ہے۔ کتاب میں

علامہ کی یورپ سے واپسی تک یعنی ۱۹۰۸ء تک کا کلام درج ہے جو کہ علامہ کی شاعری کا پہلا دور کہلاتا ہے۔ اگرچہ گیان چند ۱۹۲۴ء تک کا کلام مرتب کرنا چاہتے تھے لیکن بعض وجوہات کی بنا پر وہ صرف ۱۹۰۸ء تک کا کلام ہی شائع کر سکے۔ اس کتاب میں ایک باب ''اختلافِ نسخ'' کے عنوان سے موجود ہے جس میں علامہ کے نسخ شدہ کلام کی پہلی بار اشاعت کے بارے میں تفصیلات درج ہیں۔

کتاب میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں انگریزی کی وہ منظومات بھی شامل کی گئی ہیں، جن سے علامہ نے اپنی بعض نظمیں اخذ کی ہیں۔ ''ابتدائی کلام اقبال'' (بہ ترتیب مہ و سال) اقبال کے ابتدائی کلام پر مبنی ایک مستند کتاب ہے۔ ''ابتدائی کلام اقبال'' ایک نادر نسخہ ہائے اقبال ہے، جس کی مدد سے ہم اقبال کے ذہنی ارتقا کو سمجھ سکتے ہیں۔ ان کی اقبال کے حوالے سے کتاب کا تذکرہ درج ہے۔

ابتدائی کلامِ اقبال (بہ ترتیب مہ و سال)

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت ۲۰۰۴ء، صفحات: ۴۵۹، قیمت: ۲۷۰ روپے

ooo

محمد احمد خاں

(۱۹۲۰ء۔۱۹۹۲ء)

محمد احمد خان مارچ ۱۹۲۰ء کو حیدر آباد دکن میں حسن خاں کے ہاں پیدا ہوئے۔محمد احمد خان معروف اردو ادیب اور محقق تھے۔انھوں نے دیگر کتابوں کے ساتھ ساتھ اقبالیاتی ادب میں بھی اپنا حصہ ڈالا ہے۔۔۔محمد احمد خاں قیام پاکستان سے قبل جامعہ عثمانیہ سے وابستہ رہے۔قیامِ پاکستان کے بعد وہ یہاں آکر علمی و تعلیمی سرگرمیوں سے وابستہ ہو گئے۔انھوں نے اقبالیات پر کئی اور کتابیں بھی تحریر کیں۔انھوں نے اقبال کے اس پہلو پر اپنے خیالات سپردِ قلم کیے ہیں،جن پر ابھی تک بہت کم لکھا گیا ہے۔اقبال کی شخصیت کے اِس پہلو کو اُجاگر کرنے کے لیے محمد احمد خان کی کتاب ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' بہت اہمیت کی حامل ہے۔کتاب کی ورق گردانی سے تاریخ،سیاسیات اور قانون کے طالبِ علم اقبال کی سیاسی بصیرت کا بخوبی ادارک کر سکتے ہیں۔

ان کی معروف کتب میں ''میرا قائد'' (نواب بہادر یار جنگ)،''اقبال کا سیاسی کارنامہ''، ''اقبال اور مسئلہ تعلیم'' اور ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' شامل ہیں۔ان کو سب سے شہرت ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' نے دی۔کتاب کے گیارہ ابواب علامہ اقبال کی سیاسی زندگی اور سیاسی شعور کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔کتاب کا مفصل مطالعہ ہمیں بااصول سیاست اور جمہوریت کے فروغ میں سیاسی بصیرت کی اہمیت سے روشناس کرواتا ہے۔کتاب کا ساتواں باب ''چند اعتراضات اور ان کے جوابات'' نہایت اہمیت کا حامل ہے،جس میں مصنف نے اقبال پر ایک سیاست دان کی حیثیت سے ہونے والے اعتراضات کا جائزہ لے کر ان کے جوابات دیے ہیں۔

محمد احمد خان ۹ مارچ ۱۹۹۲ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ انھیں پاپوس نگر کراچی میں دفن کیا گیا۔ ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال اور مسئلۂ تعلیم

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان لاہور، اشاعت: اول ۱۹۷۸ء، صفحات: ۶۲۵

اقبال کا سیاسی کارنامہ

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان۔ لاہور، اشاعت ۱۹۷۷ء، صفحات ۹۹۳، قیمت ۹۵ روپے

○○○

محمد باقر، ڈاکٹر

(۱۹۱۰ء۔۱۹۹۳ء)

ڈاکٹر محمد باقر شعروسخن کے حوالے سے محتاج تعارف نہیں ہیں۔تنقید ان کا خاص موضوع ہے۔اقبال شناسی میں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ڈاکٹر محمد باقر ۱۹۱۰ء کو بنگلہ، فیصل آباد کے قریب پیدا ہوئے۔ڈاکٹر محمد باقر اردو، فارسی اور پنجابی زبان وادب کے محقق، ادیب، اور نقاد تھے۔۱۹۳۹ء میں لندن یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی ڈگری حاصل کی۔درس و تدریس کے مقدس پیشہ اختیار کیا۔۷۰۔۱۹۵۰ء کے دوران مختلف جامعات میں صدر شعبہ فارسی تعینات رہے۔۱۹۶۵ء اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی تعینات رہے۔

ان کی معروف کتب میں ''تہذیبِ عمل''، ''شعرائے پنجاب''، ''لندن سے خطوط''، ''لندن سے لاہور تک''، ''احوال و آثار اقبال''، ''احوال وتعلیمات شیخ ابوالحسن ہجویری'' اور انگریزی زبان میں Lahore past and Present شامل ہیں۔

''احوال و آثار اقبال'' اردو اور انگریزی حصوں پر مشتمل ہے۔۹۹ صفحات اردو جب کہ ۵۵ صفحات انگریزی حصہ پر مشتمل ہیں۔اقبال کے احوال پر یہ کتاب مختصر لیکن معنوی اعتبار سے بہت زرخیز ہے۔فکر اقبال کے اہم ترین موضوعات کو مختصر الفاظ میں جامعیت کا پیرہن پہنایا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد باقر ۱۹۹۳ء میں رحلت فرما گئے۔ان کی اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

احوال وآثار اقبال (چند پہلو)

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان میکلوڈ روڈ لاہور، اشاعت ۱۹۸۱ء، صفحات: ۱۵۴، قیمت ۱۷ روپے

محمد الدین فوق، منشی

(۲۵ فروری ۱۸۸۷ء۔۵ اگست ۱۹۶۰ء)

منشی محمد الدین فوق ۲۵ فروری ۱۸۸۷ء میں پیدا ہوئے۔ منشی محمد الدین فوق نے بھی اقبال کی طرح استاد داغ سے اصلاح لی۔ لاہور میں ''اتحاد'' کے زیر اہتمام بازار حکیماں میں ہونے والے مشاعروں میں شریک ہوئے تو ان کی شہرت کے چرچے لاہور کے علمی و ادبی حلقوں میں ہونے لگے۔ لاہور سے لالہ پرکھ رائے نے جب ایک ہفت روزہ ''کوہ نور'' کے نام سے رسالہ جاری کیا تو منشی محمد الدین فوق کو اس کا مدیر بنایا گیا۔ منشی محمد الدین فوق بہت مدت تک یہ پرچہ نکالتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا مجلّہ ''پنجہ فولاد'' کے نام سے جاری کیا۔ منشی مختلف اوقات میں ''آفتاب پنجاب'' گلزار ہند کشمیری گزٹ''، بہاول گزٹ اور کشمیری میگزین کا اجراء کیا۔

معروف کالم نگار، محقق، دانش ور، کمپیئر اور شاعر ڈاکٹر محمد اجمل خان نیازی نے ۱۹۸۶ء میں منشی محمد دین منشی کی علمی و ادبی خدمات پر پنجاب یونی ورسٹی سے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ فوق کی تصانیف کی تعداد ۹۵ کے قریب ہے۔ ان کی کتب میں ''تاریخِ اقوامِ کشمیر'' اور ''تذکار اقبال'' شامل ہیں۔

منشی محمد الدین فوق بھی اقبال کے ایسے ہی بے لوث دوست تھے، جو علامہ کی زندگی کے تمام گوشوں سے پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے ہر لحہ اقبال کے افکار و خیالات کو سراہا اور اقبال کی زندگی کے ایک ایک واقعے، ایک ایک عمل کو اپنے اخباروں، اپنے رسالوں، اپنی کتابوں اور اپنی یادداشتوں میں تحریر کیا۔

منشی محمد الدین فوق کا شمار علامہ اقبال کے ہم نفس، ہمدرد اور ہم خیال ساتھیوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تمام زندگی اقبال کے گرد اس طرح گزری جس طرح شمع کے گرد پروانہ منڈلاتا ہے ''تذکارِ اقبال'' ان کی انھیں تحریروں کا مجموعہ ہے، جو انھوں نے یادگار کے طور پر چھوڑیں۔ اِسے محمد عبداللہ قریشی نے مرتب کیا ہے۔

محمد عبداللہ قریشی نے منشی محمد الدین فوق کے تصور کو اس انداز سے عملی شکل دی ہے، جس طرح قائداعظمؒ نے ڈاکٹر علامہ اقبال کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے دن رات کام کیا۔ ۵/اگست ۱۹۶۰ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کے جسدِ خاکی کو میانی صاحب باغ گل بیگم فتح شیر روڈ سڑک کے کنارے ایک احاطہ میں سپردخاک کیا گیا۔

ان کی اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

تذکارِ اقبال

ناشر: بزم اقبال کلب روڈ لاہور، اشاعت: طبع اول جنوری ۱۹۸۸ء، صفحات: ۲۷۵، قیمت ۴۵ روپے

OOO

عبدالمقیت، شاکر علیمی، ڈاکٹر

(۷ دسمبر ۱۹۴۵ء۔۱۱ر فروری ۲۰۱۳ء)

ماہرِ تعلیم، شاعر اور ماہرِ اقبالیات ڈاکٹر محمد عبدالمقیت آج ادبی دنیا میں شاکر علیمی کے نام سے معروف ہیں۔ وہ ہم سے بچھڑے ضرور ہیں لیکن ان کی علمیت اور شاکرانہ قدر و منزلت آج بھی زندہ ہے علم و ادب کے حوالے سے وہ اپنے عہد میں بھی عہد ساز تھے اور آج مرنے کے بعد بھی عہد ساز ہیں۔

شاکر علیمی ۷ر دسمبر ۱۹۴۵ء کو جے پور (راجھستان) کے ایک علمی و ادبی خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدِ گرامی مولانا محمد علیم ندوی اپنے زمانہ کے معروف عالم دین تھے، جنھوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ سے اکتسابِ فیض کیا اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔ مولانا محمد علیم ندوی نے علامہ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کی کئی عربی کتب کو اردو قالب میں ڈھالا۔ شاکر علیمی کے چچا محمد عبدالحلیم چشتی نے دیوبند سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ڈاکٹر محمد عبدالمقیت نے ابتدائی تعلیم گھر سے ہی حاصل کی۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ہجرت کی الم ناک صعوبتوں سے گزر کے ریاست جے پور سے کراچی آئے مگر کچھ ہی عرصہ کے بعد حیدر آباد منتقل ہو گئے۔ حیدر آباد آ کر تعلیمی سلسلہ شروع کیا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول حیدر آباد سے میٹرک پاس کیا۔ میٹرک کرنے کے بعد ہی درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ اس ملازمت کے دوران انھوں نے اپنی تعلیمی سفر جاری رکھا اور یوں ۱۹۶۷ء میں بی اے اور ۱۹۶۹ء میں سندھ یونی ورسٹی سے ایم اے اردو کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا۔ انھیں انجمن ترقی اردو کی طرف سے بابائے اردو گولڈ میڈل نوازا گیا۔ ۱۹۷۴ء میں پی ایچ ڈی کا مقالہ

بعنوان ''اردو شاعری پر قرآن وحدیث کے اثرات'' لکھ کر ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ انھوں نے ڈاکٹر غلام مصطفی خان کی زیرِ نگرانی قلم بند کیا۔

ایم اے اردو کرنے کے بعد وہ مقامی کالج میں اردو کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں گورنمنٹ کالج لاڑکانہ تبادلہ ہوا اس کے بعد ۱۹۸۰ء میں ان کی تعیناتی مسلم گورنمنٹ سائنس کالج کراچی میں ہوئی۔ گورنمنٹ کالج حیدر آباد میں بھی فرائض کی ادائیگی کے لیے مقیم رہے۔ ایک طویل عرصہ مختلف کالجوں میں فرائض کی ادائیگی کرتے رہے ۲۰۰۵ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔ وہ ۱۱ فروری ۲۰۱۳ء کو ہم سے بچھڑ گئے۔ گلشن اقبال کراچی میں انھیں سپردِ خاک کیا گیا۔

ڈاکٹر عبدالمقیت اردو کے ساتھ ساتھ فارسی او عربی میں بھی خاصی مہارت رکھتے تھے۔ علم حدیث انھوں نے اپنے والدِ گرامی سے حاصل کیا۔ ڈاکٹر عبدالمقیت نے قرآن مجید کا ادبی حوالے سے عمیق مطالعہ کیا اور قرآن میں استعمال ہونے والی تلمیحات، تشبیہات، محاورات وضرب الامثال، اصطلاحات، صنائع بدائع اور قرآن کے مضامین کو نہایت محنت سے تلاش کر کے دوسروں کے لیے بہت سی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ان کا مضمون ''قرآنی محاورات'' رسالہ ''بینات'' کراچی میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ انھوں نے علامہ مخدوم محمد معین ٹھٹوی کے ''رسالہ اویسیہ'' کو جو انھوں نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے استفسار پر فارسی میں لکھا تھا اس کا اردو ترجمہ کیا اور اس کے تعلیقات وحواشی بھی لکھے۔

ڈاکٹر عبدالمقیت ابتداء میں شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ پھر تحقیق اور تنقید کی طرف ایسے مائل ہوئے کہ شاعری کا موقع نہ مل سکا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

متاعِ ہوش وخرد کے رہے نہ ہم قابل
جنوں شعار ہماری نظر سے گزرے ہیں

تجلّیات کا محرم بنا دیا ایسا
شرابِ حسن ملی ہم جدھر سے گزرے ہیں

ان کی اقبال کے حوالے سے کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال اور حدیث

پبلشرز: مکتبہ علیمی، کراچی، اشاعت: جنوری ۲۰۱۳ء، صفحات: ۹۲۰، قیمت: ۶۵۰ روپے

محمد حنیف شاہد ایم اے

(یکم جنوری ۱۹۳۹ء۔ ۱۱ فروری ۲۰۱۸ء)

پاکستان کی علمی وادبی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ محمد حنیف شاہد شریف النفس دانش ور
تھے۔ زندگی بھر اُن کا دوسرا نام ''محبت'' رہا۔ شفقت، پیار اور خلوص کی دولت ہر جگہ نچھاور کرتے
تھے۔ عظیم فن کار کی سب سے بڑی خوبی علم وفضل تقسیم کرنا ہے۔ محمد حنیف شاہد تحقیق کے میدان میں
منکسر المزاج شخصیت کے حامل تھے۔ اُن کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا تھا جن سے قومیں زندہ رہتی ہیں۔
اُن کی تدریس اور تحقیق کا دائرہ پھیلتا رہا۔ زندگی کے آخری ایام میں ناسازیٔ طبع کے باوجود اُن کی
محبت کے الاؤ میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ محمد حنیف شاہد یکم جنوری ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئے۔
میٹرک (فرسٹ ڈویژن ۱۹۵۲ء)، بی اے (سیکنڈ ڈویژن ۱۹۶۲ء)، ڈپلوما ان لائبریری
سائنس (سیکنڈ ڈویژن ۱۹۶۳ء)، سرٹیفکیٹ ان فرنچ (سیکنڈ ڈویژن ۱۹۶۵ء)، ایم اے (اُردو، سیکنڈ
ڈویژن ۱۹۷۰ء) پنجاب یونی ورسٹی نے جون ۱۹۷۵ء میں پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان ''شیخ
عبدالقادر، احوال وآثار'' لکھنے کی منظوری دی۔ محمد حنیف شاہد کے والد میاں عزیز الدین علاقے کی
معروف شخصیت تھے۔ اُن کے کہنے پر حنیف شاہد نے ایم اے اُردو کے علاوہ لائبریری سائنس میں
ڈپلومہ اور فرانسیسی زبان میں سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ پنجاب پبلک لائبریری میں ملازمت کرتے رہے۔
پھر سعودی عرب تشریف لے گئے۔ وہاں ریاض کی ایک سرکاری لائبریری میں ملازمت کرتے رہے۔

ملازمت

اُردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام پنجاب یونی ورسٹی (۹ جنوری ۱۹۵۷ء تا ۱۵ ستمبر ۱۹۶۲ء)

پنجاب یونی ورسٹی لائبریری (۱۸ جولائی ۱۹۶۲ء تا ۳۱ جنوری ۱۹۶۶ء) پنجاب پبلک لائبریری کے علاوہ بزمِ اقبال میں اُن کی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ اقبال شناسوں میں اُنھیں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کے صد سالہ جشنِ ولادت کے موقع پر ۲ تا ۹ دسمبر ۱۹۷۷ء کو حکومت پاکستان کے زیرِ اہتمام منائی جانے والی ''انٹرنیشنل کانگرس'' کے لیے ''ڈیلی گیسٹ'' منتخب کیا گیا ہے۔ وہ دھیمے لہجے کے مقرر تھے، نغز گو اور روانی سے لکھنے والے محقق بھی ہیں۔ اُن کا ادبی سرمایہ پاکستانی ادب کا وقار ہے۔ ۳۰۰ کے لگ بھگ اُن کے علمی، ادبی، تحقیقی اور فنی مضامین ملک کے مؤقر رسائل و جرائد میں ۱۹۵۷ء سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ میری خوش بختی ہے کہ پروفیسر حنیف شاہد کے ساتھ دو تین بار ٹیلی ویژن پروگرام میں گفت گو کرنے اور کئی تقریبات میں اُن کے ساتھ شرکت کا موقع ملا۔

افواجِ پاکستان: ۱۔ میجر طفیل شہید نشان حیدر، (شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۶۹ء، ۴۰۰ صفحات)، ۲۔ کیپٹن سرور شہید نشان حیدر، (سن رائز پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۲ء، ۲۴۰ صفحات)، ۳۔ نشان حیدر، (ٹیکنیکل پبلشر لاہور، ۱۹۷۲ء، ۳۹۲ صفحات)

۴۔ نذرِ اقبال، (بزم اقبال لاہور، ۱۹۷۲ء، ۲۱۴ صفحات)

۵۔ اقبال چودھری محمد حسین کی نظر میں، (سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۵ء، ۲۳۲ صفحات)

۶۔ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے سیاسی نظریات، (شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۷۶ء، ۱۶۴ص)

۷۔ اقبالؒ اور انجمن حمایت اسلام لاہور، (انجمن حمایت اسلام لاہور، ۱۹۷۶ء، ۲۰۰ صفحات)

۸۔ اقبالؒ، دی گریٹ پوئٹ آف اسلام (انگریزی)، (سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء، ۱۶۰ص)

۹۔ اقبالؒ اور پنجاب کونسل۔ (مکتبۂ زریں لاہور، ۱۹۷۷ء، ۱۶۰ص)

۱۰۔ ٹری بیوٹس ٹو اقبال (انگریزی)، (سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۷ء، ۳۲۰ صفحات)

۱۱۔ اقبالؒ کی کہانی اقبال کی زبانی (مکتبۂ حفیظ، لاہور، ۱۹۷۷ء، ۱۲۰ صفحات)

۱۲۔ اقبالؒ کی بارگاہ میں، (یونی ورسل بکس لاہور، ۱۹۷۷ء، ۲۶۰ صفحات)

اقبالیات کے علاوہ اُن کی بانیٔ پاکستان محمد علی جناحؒ کے بارے میں کئی کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اُن کا قلم پیرانہ سالی کے باوجود نہیں رکا۔ اقبال اور عبدالقادر، قائداعظمؒ اور اسلامیہ کالج، انتخاب مضامین و مکاتیب عبدالقادر، حیات اقبالؒ کے مختلف گوشے، شمس العلماء، سید راس مسعود کی علمی و ادبی خدمات، پر بھی اُن کی نگارشات مطالعہ کے قابل ہیں۔ محمد حنیف شاہد بیماری کا مقابلہ

کرتے ہوئے بھی تحریر وتقریر میں مشغول رہے۔ ۱۱ فروری ۲۰۱۸ء کو اقبالیات کا یہ خزینہ ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔ اُنھیں رات نو بجے سیکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ پروفیسر حنیف شاہد کے علاوہ ۱۱ فروری ۲۰۱۸ء اتوار کو معروف قانون دان محترمہ عاصمہ جہانگیر اور ممتاز فن کار قاضی واجد بھی ہم سے بچھڑ گئے۔ ایک ہی دن ۳ بڑی شخصیات کا جدا ہونا نا قابلِ تلافی نقصان ہے۔ پروفیسر حنیف شاہد نے تفہیم اقبالیات اور اقبال شناسی کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ ہمیشہ یاد رہیں گی۔

ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال چودھری محمد حسین کی نظر میں

پبلشر: سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، اشاعت: ۱۹۷۵ء، صفحات: ۲۳۲

اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام

ناشر: کتب خانہ، انجمن حمایت اسلام، لاہور، اشاعت: جولائی ۱۹۷۶ء، صفحات: ۱۹۶، قیمت ۴۰ روپے

مفکرِ پاکستان

ناشر: سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، بار اوّل ۱۹۸۲ء، صفحات: ۷۲۰ قیمت ۱۵۰ روپے

○○○

محمد حیات خان سیال

(اکتوبر۱۹۳۱ء۔۱۱ستمبر۱۹۸۲ء)

جھنگ اپنی علمی وادبی سرگرمیوں اور روایات کے اعتبار سے بہت مقبول ہے۔یہاں ۔ سے علم وادب کی دنیا کے بہت سے شاہکار پاکستانی ادب کی پہچان بنے ہیں۔نوبل پرائز سے لے کر تحلیقی کارناموں تک جھنگ کی ادبی شناخت ہے۔ پروفیسر حیات سیال کا شمار بھی ایسے تخلیق کاروں میں ہے،جنھیں دبستان جھنگ کا نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔وہ بیک وقت بہت سی خوبیوں کے حامل تھے۔ ممتاز اردو ادیب،شاعر،محقق،نقاد،مترجم اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے معروف ہوئے۔۔محمد حیات خان سیال ۱۴؍۱۱اکتوبر ۱۹۳۱ء کوٹ عینی شاہ ضلع جھنگ میں میر کبیر خان سیال کے ہاں پیدا ہوئے۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے درس وتدریس کا شعبہ اپنایا۔وہ ایک طویل عرصہ گورنمنٹ کالج جھنگ کے شعبہ اردو سے منسلک رہے۔متعدد امدادی اور نصابی کتب کے مؤلف تھے۔ان کی معروف کتب میں ''تجلّیاتِ اقبال''،اقبال غیر مسلموں کی نظر میں''،''احوال ونقد غالب''،''احوال ونقد حالی''، ''احوال ونقد وجہی''،''ہمارے شاعر''،''گلاب کے پھول''(مجید امجد:شخصیت فن اور منتخب کلام۱۹۷۸ء)، ''یادگار ساغر صدیقی''،''فردوس بریں پر ایک نظر'' شامل ہیں۔

حیات سیال مرنجاں مرنج شخصیت کے حامل تھے۔دوستی نبھانا اور دوستوں کی حوصلہ افزائی کرنا ان کی شخصیت کا خاصا رہا۔ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں اکثر آتے جاتے تھے۔ان سے جب بھی ملاقات ہوئی انھیں نہایت شفیق اور حلیم پایا۔ان کی گفت گو قہقہوں سے لبریز اور ان کا اندازِ تکلم پُر اثر تھا۔وہ دوستوں کو مشورے دینے میں فراخ دل،حوصلہ افزائی کرنے میں وسیع الظرف تھے۔ان کی

شخصیت کی گھنی چھاؤں دوستوں کے لیے ایک سائبان کی صورت تھی۔ ماضی کی مشرقی روایات ان کی شخصیت کا طرۂ امتیاز رہی۔ وہ دوستوں کو ملنے کی آرزو رکھتے تھے اور قدرت انھیں یہ موقع بھی فراہم کرتی رہی۔ جھنگ میں ممتاز عارف، انجم ترازی اور راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) کے اعزاز میں انجم نیازی صاحب نے ایک تقریب کا اہتمام کیا تو حیات سیال اس تقریب میں پیش پیش تھے۔ ہم اللہ کی رضا کے سامنے اُف تک نہیں کہہ سکتے۔ حیات سیال ایک ٹریفک حادثہ میں ۱۱ ستمبر ۱۹۸۲ء کو ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ ان کا اتنی جلدی بچھڑنا ادب اور دوستوں کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اقبال شناسوں کی دنیا میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ان کی کتاب ''اقبال غیر مسلموں کی نظر میں'' کا حوالہ پیش خدمت ہے۔

اقبال غیر مسلموں کی نظر میں

پبلشرز: مکتبہ شاہکار اردو بازار، لاہور، اشاعت ۵؍اکتوبر ۱۹۷۷ء، صفحات ۱۷۰، قیمت ۴ روپے

○○○

محمد رفیع الدین، ڈاکٹر

(۱۹۰۴ـ۱۹۶۹ء)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ہمہ صفت انسان تھے۔ ماہر تعلیمات، ماہر لسانیات، ماہر اخلاقیات، اور ماہر اسلامیات کی حیثیت میں انھوں نے ایک مدت قرطاس وقلم سے رابطہ رکھا۔ ان کی شخصیت اور تحریر میں کشمیر کا حسن نمایاں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ۱۹۰۴ میں جموں شہر میں پیدا ہوئے۔ سری پرتاپ سنگھ کالج سری نگر اور پرنس آف ویلز کالج جموں میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک سری کرن سنگھ کالج میرپور میں پرنسپل رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد پہلے محکمہ اسلامک کنسٹریکشن میں ریسرچ آفیسر کے طور پر کام کیا۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور میں خدمات آج بھی قابلِ ستائش ہیں۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۶۵ء تک انھوں نے اقبال اکیڈمی (کراچی) میں بحیثیت ڈائریکٹر خدمات انجام دیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ وہ اقبال اکیڈمی کے بانی ڈائریکٹر رہے۔ انھوں نے بہ حیثیت اقبال شناس اکیڈمی کے تحقیقی عمل کو تیز سے تیز تر کیا۔ اقبال شناسوں کو ایک مرکز پر لانے کا فریضہ انجام دیا۔ حالات کی ستم ظریفی کہ وہ ۲۹ نومبر ۱۹۶۹ء کو ایک ٹریفک حادثے کراچی میں راہیٔ ملک عدم ہوگئے۔ ان کا جسدِ خاکی شہر اقبال سیال کوٹ لایا گیا اور وہیں آسودہ خاک ہیں۔ ان کی علمی و ادبی قدر و منزلت کے گواہ خطۂ کشمیر کے تمام اہلِ قلم ہیں۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے۔ انگریزی اور اردو پر انھیں بہت عبور حاصل تھا۔ انھوں نے یوں تو بہت کچھ لکھا لیکن انگریزی اردو کی ایک درجن کتب ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہیں۔

اُردو کتب

''حکمتِ اقبال''، ''قرآن اور علمِ جدید''، ''پاکستان کا مستقبل''، ''روحِ اسلام''،

انگریزی کتب

Ideology of the -Future

Manifesto of Islam

First Principles of Education

Fallacy of Marxism

The Meaning and purposes of Islamic Reserach

Potential Contribution of Islam toward peace

معروف فلسفی اور سکالر مولانا عبدالماجد دریابادی کے مطابق ڈاکٹر محمد رفیع الدین پاکستان میں علامہ اقبال کے بعد سب سے بڑے فلسفی ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میر پور کے گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے محمد رفیع الدین کی خدمات آج بھی زندہ ہیں۔ کالج کے پہلے پرنسپل کشمیری نژاد پنڈت پروفیسر جیالال کول تھے۔ پروقار شخصیت، کئی کتابوں کے مصنف اور انگریزی کے بہترین معلّم تھے۔ انگریزی زبان پر انھیں بھرپور قدرت اور ملکہ حاصل تھا۔ جس خوش نصیب نے ان سے انگریزی کی نظمیں پڑھی ہیں، آج بھی کول کے نام سے چونک جائے گا اور عمرِ رفتہ کو آواز دینے کی کوشش کرے گا۔ دوسرے پرنسپل نہایت ہی زیرک اور محنتی مسلم سکالر پروفیسر غلام احمد مختار تھے۔ اگرچہ میر پور میں ان کا قیام نہایت مختصر رہا مگر ان کی سوشل اور مجلسی زندگی نے انھیں میر پور کے لوگوں کے بہت قریب کر دیا۔ موصوف کی علمی، ادبی، تعلیمی اور انتظامی صلاحیتوں کا یہ اعتراف تھا کہ سری نگر میں کشمیر یونی ورسٹی کے قیام پر انھیں اس کا بانی وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ تیسرے پرنسپل ڈاکٹر محمد رفیع الدین تھے۔ جن سے ڈاکٹر محمد عارف خان (سابق پرنسپل) روحانی اور اکتسابی تلمذ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی دو ڈگریوں کے حامل تھے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ریسرچ سنٹر کا قیام

ڈاکٹر محمد عارف خان نے جنوری ۲۰۱۳ء میں، گورنمنٹ کالج میر پور کی پرنسپل شپ کا چارج سنبھالا تو علمی و ادبی اور فکری حوالے سے کالج کی عظمتِ رفتہ بحال ہوئی۔ کالج کے نظم و ضبط، تدریسی اور علمی و ادبی سرگرمیوں کو جلا ملی۔ ایجوکیٹر کلب کو زندہ کیا گیا۔ اس کالج کے تیسرے پرنسپل اور

اقبال اکیڈمی پاکستان کے بانی ڈائریکٹر ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی انقلابی اور فلسفیانہ فکر سے متاثر ہو کر ڈاکٹر عارف خان نے انھیں اپنی تحقیق کا مرکز و محور بنا لیا۔ ان کے ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے فکر و فلسفہ کے حوالے سے ہیں۔ پرنسپل بننے کے بعد انھوں نے کالج میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین ریسرچ سنٹر کا سنگِ بنیاد رکھا جس کی محکمہ تعلیم نے باقاعدہ منظوری دی۔ اس ریسرچ سنٹر کے زیر اہتمام کالج سے وابستہ ماضی اور حال کے محققین اور سکالرز کی اہم ترین علمی و ادبی اور فکری کتابوں کو از سرِ نو زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ آج کل ممتاز دانش ور، ماہرِ لسانیات پروفیسر غازی علم الدین مذکورہ ریسرچ سنٹر کو مزید فعال بنانے کے لیے سرگرداں ہیں۔ ان سے جب بھی رابطہ ہوا تو انھوں نے ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی خدمات کا خوب صورت الفاظ میں تذکرہ کیا۔

ان کی مشہور زمانہ کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

حکمتِ اقبال

پبلشر: آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس، لاہور، بہ اشتراک ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد۔ پاکستان، اشاعت اول ۱۹۷۲ء دوم ۱۹۹۶ء، صفحات ۵۲۴

○○○

محمد ریاض، پروفیسر، ڈاکٹر

(۱۹۹۴ء۔۱۹۳۵ء)

ممتاز دانش ور، ماہرِ تعلیم، ماہرِ اقبالیات اُستادِ گرامی پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض نے فارسی کے استاد اور مترجم کی حیثیت سے خوب شہرت پائی۔ موضع گہل، نیومری میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد تدریس کا پیشہ اپنایا اور ۱۹۷۸ء۔۱۹۷۳ء کے دوران فیڈرل گورنمنٹ کالج اسلام آباد کے پرنسپل اور پھر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی اسلام آباد میں شعبۂ اقبالیات کے صدر رہے۔ اُن کی تقریباً تمام تصانیف کا موضوع اقبالیات ہے۔ ''اقبال اور فارسی شعرا'' (۱۹۷۷ء)، ''اقبال اور ابن حلاج'' (۱۹۷۷ء)، ''اقبال اور برعظیم پاک و ہند کی آزادی'' (۱۹۷۸ء) ''برکات اقبال'' (۱۹۸۲ء)، ''افاداتِ اقبال'' (۱۹۸۳ء)، ''تقدیرِ اُمم اور اقبال'' (۱۹۸۳ء)، ''شاہ ہمدان اور اقبال'' (۱۹۸۵ء)، '' آفاق اقبال'' (۱۹۸۷ء)، ''تفسیرِ اقبال'' (۱۹۸۸ء)، ''جاوید نامہ: تحقیق و توضیح'' (۱۹۸۸ء)، ''اقبال اور احترامِ انسانیت'' (۱۹۸۹ء)، '' اقبال کے تعلیمی نظریات'' (۱۹۸۹ء)، ''رومی کا تصور فقر اور دوسرے مضامین'' (۱۹۹۰ء) اور ''اقبال اور ابنِ خلدون''۔ محمد ریاض نے این میری شمل کے "Gabriel's Wing" کا اُردو ترجمہ بعنوان ''شہپرِ جبریل'' کیا۔

استادگرامی ڈاکٹر محمد ریاض، یوں تو فارسی ادب کے استاد رہے لیکن ماہرینِ اقبالیات کی حیثیت میں بھی ان کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ اقبال شناسی میں وہ ایک معتبر حوالہ ہیں۔ ان کی تنقیدی بصیرت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ اقبالیات کی کئی دیگر کتب کے علاوہ زیرِ نظر کتاب ''اقبال اور برصغیر کی تحریک آزادی'' ان کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ وہ ایک تجربہ کار استاد تھے۔ انھوں نے

۴مارچ ۱۹۳۵ تا ۲۸ نومبر ۱۹۹۴ء فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں پر کام کیا۔ مختلف کالجوں میں خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ شعبہ اقبالیات علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی میں گراں قدر تحقیقی خدمات انجام دیں چیئر مین شعبہ اقبالیات کی حیثیت میں ان کی زیرِ سرپرستی میں مجھ ایسے سیکڑوں احباب نے اقبالیاتی موضوعات پر کام کیا ہے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال مصور پاکستان تھے۔ انھوں نے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کی۔ علامہ اقبال کے اشعار نے خوابیدہ قوم کو نوید زندگی عطا کی علامہ اقبال اور تحریکِ آزادی کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر محمد ریاض کی یہ کتاب ان کاوشوں کو خراجِ تحسین ہے، جو علامہ اقبال نے انجام دیں۔ ان کی عالمی شہرت یافتہ اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال اور برصغیر کی تحریکِ آزادی

پبلشرز: آئینہ ادب چوک مینار انارکلی لاہور، سن اشاعت ۱۹۷۸ء، صفحات: ۱۰۴، قیمت ۱۲ روپے

افکارِ اقبال

پبلشرز: مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار لاہور، اشاعت ۱۹۹۰ء، صفحات ۱۸۹، قیمت ۵۴ روپے

اقبال اور فارسی شعراء

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، اشاعت ۱۹۷۷ء، صفحات ۳۷۶، قیمت: ۳۴ روپے

جاوید نامہ (تحقیق و توضیح)

ناشر: اقبال اکادمی پاکستان لاہور، اشاعت ۱۹۸۸ء، صفحات ۲۵۶، قیمت ۸۰ روپے

اقبال اور احترامِ انسانیت

پبلشرز: نذیر سنز پبلشرز، لاہور، اشاعت ۱۹۸۹ء، صفحات ۲۱۶، قیمت ۵۰ روپے

تفسیرِ اقبال

پبلشرز: مقبول اکیڈمی لاہور، اشاعت ۱۹۸۸ء، صفحات ۴۲۰، قیمت: ۱۵۰ روپے

افاداتِ اقبال

ناشر: مقبول اکیڈمی لاہور، صفحات ۳۷۵، قیمت ۱۲۰ روپے

آفاقِ اقبالؒ

پبلشرز: گلوب پبلشرز، لاہور، اشاعت ۱۹۸۷ء، صفحات ۲۳۹، قیمت ۷۵روپے

برکاتِ اقبال

پبلشرز: مقبول اکیڈمی لاہور، اشاعت دوم ۱۹۸۸ء، صفحات ۲۹۶، قیمت ۱۵۰روپے

اقبال اور سیرت انبیاء کرامؑ

مقبول اکیڈمی لاہور،، صفحات ۲۸۸، قیمت ۷۵۰روپے

ooo

محمد شریف طوسی

(۵ جولائی ۱۹۰۰ء۔ ۲۸/اپریل ۱۹۸۳ء)

خواجہ محمد شریف طوسی ۵ جولائی ۱۹۰۰ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ محمد شریف طوسی ممتاز صحافی، ماہر تعلیم، کارکن تحریکِ پاکستان تھے۔ انھیں تحریک پاکستان میں خدمات کے اعتراف میں گولڈ میڈل ۱۹۸۸ء میں دیا گیا۔ خواجہ محمد شریف طوسی ''ڈان'' اور ''ایسٹرن ٹائمز'' میں کالم اور مضامین بھی لکھتے رہے ہیں اور ''ایسٹرن ٹائمز'' کی ادارت بھی کی۔ وہ قلمی نام ایم آرٹی استعمال کرتے تھے۔ محمد شریف طوسی ایم بی ہائی سکول وزیر آباد میں ہیڈ ماسٹر بھی رہے۔ محمد شریف طوسی کو ایک اعزاز یہ بھی حاصل ہے کہ وہ قائداعظم محمد علی جناح کے پولیٹیکل سیکرٹری (۴۳۔۱۹۳۳ء) رہے۔ ان کی کتابوں کو قائداعظم محمد علی جناح بہت پسند کرتے۔

ان کی کتب میں ''پاکستان کی تحریک آزادی''

☆Pakistan and Muslim India

☆Nationalism in Contict in India

☆ India's Problems of her Future Consititution

اور ایک بہت اہم ترین کتاب ''اقبالؒ کے خطوط جناحؒ کے نام'' شائع ہوئی۔ یہ خطوط انگریزی زبان میں تھے، جنھیں محمد شریف طوسی نے کمال محنت سے نہ صرف اکٹھے کیا بل کہ زیورِ طباعت سے آراستہ بھی کیا۔ پہلی مرتبہ یہ خطوط قائداعظم محمد جناح کے پیش لفظ سے شائع ہوئے۔ ان کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر محمد جہانگیر عالم نے اِن خطوط کو اردو کے سانچے میں ڈھالا۔ ان خطوط کے کتابی شکل میں منظر عام پر آنے سے یہ بات اظہر من الشّمس ہوگئی کہ مصور پاکستان ڈاکٹر علامہ اقبال نے

کس طرح محمد علی جناح کی شخصی عظمت اوران کی صلاحیتوں کا ادراک کرلیا تھا۔اس کتاب میں انھوں نے تاریخی اہمیت کے حامل خطوط کو شامل کیا ہے۔تاریخی اہمیت اس لیے کہ یہ خطوط ایک عظیم مفکر، دانش ور،شاعر،حکیم الامت اورامت مسلمہ کے مفکّر کے تحریر کردہ ہیں۔

اِن خطوط میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے اُسلوب کا بھی پتہ چلتا ہے۔لفظوں میں روانی، لفظوں کا حسنِ انتخاب،اور حالات حاضرہ کی خصوصی زبان ان خطوط کا طرۂ امتیاز ہے۔ذاتی زندگی سے لے کر برِعظیم پاک و ہند کے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات واحساسات اِن خطوط میں نمایاں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی بصیرت کا پتا چلتا ہے کہ اُنھوں نے برِعظیم کے مسلمانوں کے لیے محمد علی جناح کا انتخاب کیا۔ڈاکٹر علامہ اقبال نے برعظیم پاک و ہند کی صورتِ حال کو جس انداز سے قائداعظم محمد علی جناح کو آگاہ کیا وہ واقعی تاریخی ہے۔

محمد شریف طوسی ایک ٹریفک حادثہ میں ۲۸ر اپریل ۱۹۸۳ء کو انتقال کر گئے۔انھیں میانی صاحب لاہور میں سپرد خاک کیا گیا۔ان کی اقبال کے حوالے سے مرتبہ کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبالؒ کے خطوط جناحؒ کے نام

Letters of iqbal to Jinnah کا اُردو ترجمہ

پبلشرز: یونیورسل بکس،لاہور،اقبال اکادمی پاکستان،لاہور ۲۰۰۲ء صفحات ۷۷، قیمت ۲۴ روپے

ooo

محمد طاہر فاروقی، پروفیسر

(۱۴ستمبر ۱۹۰۵ء۔ ۱۹ر ستمبر ۱۹۷۸ء)

پروفیسر محمد طاہر فاروقی ممتاز ادیب، شاعر، محقق، ماہرِ اقبالیات، عالم دین، سابق صدر شعبہ اُردو اسلامیہ کالج پشاور وانقرہ یونی ورسٹی تعینات رہے۔ محمد طاہر فاروقی ۱۴ستمبر ۱۹۰۵ء کو رام پور (بھارت) میں مولانا محمد محسن فاروقی کے ہاں پیدا ہوئے۔

محمد طاہر فاروقی جہاں علمی وادبی حلقوں میں معروف تھے۔ وہاں دینی حلقوں میں بھی ان کا شہرہ خوب تھا۔ وہ ممتاز عالم دین پیر جماعت علی شاہ کے مرید تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ''سرکارِ دو عالم ﷺ'' ایسی خوب صورت کتاب بھی لکھی۔ ان کی دیگر کتابوں میں ''سیرتِ اقبال''، ''بزمِ اقبال''، ''نگارِ عجم''، ''پاکستان میں اردو''، ''گرد کارواں''، ''خیابانِ اقبال''، ''سیرت امیر ملت''، ''ادبیات ایرانِ نو''، ''تاریخ فارسی ادب'' شامل ہیں۔

پروفیسر محمد طاہر فاروقی ماہر تعلیم اور ممتاز اقبال شناس ہیں۔ انھوں نے ''سیرتِ اقبال'' ایسی کتاب قارئین کے لیے پیش کی ہے جس کی فہرست پڑھ کر ہی کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے علامہ محمد اقبال کی سوانح عمری کو اتنے عمدہ اور سلیس انداز میں پیش کیا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ ان کا اسلوب اتنا سادہ اور رواں ہے کہ قارئین ان کی انگلی پکڑ کر ان کے پیچھے پیچھے چلتا جاتا ہے اور کسی جگہ بھی اسے بوریت یا تھکن کا احساس تک نہیں ہوتا۔ انھوں نے ایک اک جزئیات کا مشاہدہ کیا ہے بل کہ اسے کمال ہنر مندی سے بیان بھی کیا ہے۔ پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے جہاں جہاں علامہ محمد اقبال کی سراپا نگاری بیان کی ہے تو قاری پڑھتے ہوئے

ششدر رہ جاتا ہے۔

۱۹ر ستمبر ۱۹۷۸ء کو پشاور میں انتقال کر گئے اور نشتر آباد پشاور میں تدفین ہوئی۔ ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

سیرتِ اقبالؒ

پبلشر: گوہر پبلی کیشنز اردو بازار۔ لاہور، صفحات ۵۸۴، قیمت ۴۰۰ روپے

اقبال اور محبت رسولﷺ

ناشر: قبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت ۲۰۱۱ء (طبع نہم)، صفحات ۲۴۷، قیمت ۲۵۰ روپے

ooo

محمد عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر

(۲۳ نومبر ۱۸۹۶ء۔۱۹/دسمبر ۱۹۸۴ء)

ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ۲۳ نومبر ۱۸۹۶ء محلہ چابک سواراں، لاہور میں میاں کریم بخش کے ہاں پیدا ہوئے۔ نامور ماہر اسلامی تعمیرات، مؤرخ، ادیب اور ماہر اقبالیات کے حوالے سے شہرت پائی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد درس وتدریس کا شعبہ اپنایا اور فرگوسن کالج کوئٹہ میں تاریخ کے استاد کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کو ایک یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ علامہ محمد اقبال کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ ان کی معروف کتب میں ''تاریخ نقش و نگار''، ''تاج محل آگرہ''، ''بادشاہی مسجد''، ''مسجدِ نبوی ﷺ''، ''بابا فرید گنج شکر''، ''سیرتِ حضرت بلالؓ''، ''اقبال کی صحبت میں'' اور ''روایات اقبال'' شامل ہیں۔

ڈاکٹر علامہ اقبال کے چاہنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ ڈاکٹر اقبال محفل ساز انسان تھے۔ ان کی بزم دوستاں میں ہر قسم کے لوگ شریک ہوا کرتے تھے۔ اس لیے اقبال کی فکری کاوشوں کو عام کرنے کے لیے روایات کو یکجا کرنا ایک بہت بڑی ادبی خدمت ہے۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے ''روایات اقبال'' میں علامہ محمد اقبال کے دوستوں اور اہل بزم سے انٹرویو کر کے اقبال کی ذاتی زندگی اور ان کے شب و روز کے بارے میں مفید معلومات اکٹھی کی ہیں۔ کچھ روایات مولانا عبدالمجید سالک کی کتاب ''ذکرِ اقبال'' میں بھی موجود ہیں۔ علامہ اقبال کی کئی روایات تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں یک جا کرنے کا فریضہ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے انجام دیا۔

جو لوگ علامہ اقبال کی صحبت سے فیض یاب ہوئے، یقیناً نہایت خوش نصیب ہیں۔ ڈاکٹر

محمد عبداللہ چغتائی بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ہیں، جنھوں نے علامہ اقبال کے قرب میں زندگی کے کچھ ایام گزارے۔ کتاب ''اقبال کی صحبت میں'' لکھ کر ڈاکٹر صاحب نے اقبالیاتی ادب کو ایک خوب صورت تحفہ دیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے ہم علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے آشنا ہو سکتے ہیں۔

کتاب کے کل ۱۰۰ اشذرات و مضامین ہیں۔ یہ صد رنگ مضامین ایک گل دستے کی مانند ہیں جن میں ہر رنگ کے پھول ہیں لیکن اجتماعی خوش بُو فکرِ اقبال کی صورت میں نمایاں ہے۔ ''انجمن حمایتِ اسلام اور علامہ اقبال''، ''علامہ اقبال کا گھرانہ''، ''ایک واقعہ''، ''اکبرالہ آبادی اور اقبال''، ''قیام لندن کی یادداشت''، ''علامہ اقبال اندلس میں''، ''خطبات مدراس کا پس منظر'' خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔

ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان نے انھیں تمغۂ امتیاز سے بھی سرفراز کیا۔ ۱۹؍دسمبر ۱۹۸۴ء، لاہور میں انتقال کر گئے اور انھیں میانی صاحب، لاہور میں دفن کیا گیا۔

حضرت علامہ اقبال پر ان کی دونوں کتب کا حوالہ درج ہے۔

روایاتِ اقبال

پبلشرز: ناظم مجلس ترقی ادب لاہور، اشاعت نومبر ۱۹۷۷ء، صفحات: ۲۲۴، قیمت ۳۲ روپے

اقبال کی صحبت میں

پبلشرز: ناظم مجلس ترقی ادب، لاہور، اشاعت: طبع اول نومبر ۱۹۷۷ء، صفحات ۵۷۸، قیمت ۵۴ روپے

○○○

محمد عبداللہ قریشی

(۱۹۰۵ء۔۱۲/اگست ۱۹۹۴ء)

محمد عبداللہ قریشی ۱۹۰۵ء میں رحیم بخش کے ہاں لاہور میں پیدا ہوئے۔ محمد عبداللہ قریشی ممتاز اردو ادیب، محقق، ماہرِ اقبالیات کی حیثیت خوب شہرت پائی۔ محمد عبداللہ قریشی سابق مدیر ماہنامہ ''ادبی دنیا'' لاہور بھی رہے ہیں۔

''تاریخ اقوام کشمیر'' (جلد سوم) ''آئینۂ کشمیر''، ''آئینۂ اقبال''، ''اقبال بنام شاد''، ''غلامانِ رسول ﷺ''، ''حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں''، ''تذکار اقبال''، ''روح مکاتیب اقبال''، ''حیاتِ جاوداں''، ''معاصرین اقبال کی نظر میں''، ''باقیاتِ اقبال'' ایسی نایاب کتب تصنیف کیں۔ محمد عبداللہ قریشی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اقبال کے قرب سے فیض یاب ہوتے رہے۔ علامہ اقبال اپنے دوست احباب کا تذکرہ ان سے کرتے رہتے تھے۔ عبداللہ قریشی نے ان تمام مداحوں کے حالات نہایت عرق ریزی اور جستجو کے بعد اکٹھے کر کے ''معاصرین، اقبال کی نظر میں'' ترتیب دے کر قابلِ تحسین کام کیا ہے۔

محمد عبداللہ قریشی نے ''حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں'' میں مختلف مضامین تحریر کیے ہیں۔ ایک مضمون ''لاہور کے مشاعرے'' کو خوب صورت انداز میں قارئین کے لیے پیش کیا گیا۔ حیاتِ اقبال کی کڑیاں سلجھاتے ہوئے لاہور کی ادبی تاریخ کے چند روشن گوشے بھی ہمارے سامنے آئے ہیں، جو ہنوز ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مرزا ارشد گورگانی، میر ناظم حسین ناظم لکھنوی، شیخ الٰہی بخش رفیق، مولانا عبدالحکیم کلانوری، مفتی عبداللہ ٹونکی، چودھری شہاب الدین، مولوی احمد دین،

شیخ گلاب دین، مولوی محمد حسن جالندھری، مولوی محمد حسین، میاں محمد شفیع اور میاں محمد شاہ دین ہمایوں کے نہ صرف تذکرے موجود ہیں بل کہ ان کا نمونہ کلام بھی شامل کر کے ادبی دیانت داری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ مختلف انجمنوں اور سوسائٹیوں کے مشاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ گویا یہ مضمون تاریخ ادب کا ایک روشن پہلو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

''حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں'' انتہائی اہم اور پڑھنے سے تعلق رکھنے والی کتاب ہے۔ یہ کتاب اقبال کی شخصیت حتیٰ کہ اندرون خانہ حالات کا جائزہ ہے۔ تحقیق کرنے والوں کے لیے اقبال سے وابستہ کئی اسرار و رموز جاننے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

محمد عبداللہ قریشی نے اقبالیات میں خوب نام کمایا ہے۔ انھوں نے اقبالیاتی ادب میں اقبال کی فکر کے نئے گوشوں کو متعارف کروایا ہے۔

محمد عبداللہ قریشی ۱۲راگست ۱۹۹۴ء کو لاہور میں انتقال کر گئے اور انھیں میانی صاحب کے بڑے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

معاصرین، اقبال کی نظر میں

پبلشرز: مجلس ترقی ادب لاہور، اشاعت ۱۹۷۷ء، صفحات ۶۵۶، قیمت ۴۵ روپے

حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں

پبلشرز: بزم اقبال۔ کلب روڈ لاہور، اشاعت اپریل ۲۰۰۱ء، صفحات ۲۴۰، قیمت ۱۳۰ روپے

مکاتیبِ اقبال بنام گرامی

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان۔ کراچی، اشاعت ۱۹۷۹ء، صفحات ۲۴۹، قیمت ۱۲ روپے

ooo

محمد عثمان، پروفیسر

(اپریل۱۹۳۲ء۔۲۰جون ۱۹۸۷ء)

پروفیسر محمد عثمان اپریل ۱۹۳۲ء انبیر سنگھ پورہ (نواں شہر) جموں میں پیدا ہوئے۔ پروفیسر محمد عثمان ممتاز ادیب، ماہرِ تعلیم، دانش ور، ماہرِ اقبالیات کی حیثیت عالمی شہرت کے حامل ہوئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد پروفیسر محمد عثمان نے درس وتدریس کا پیغمبرانہ پیشہ اپنایا۔ وہ دورانِ ملازمت مختلف کالجوں میں علم کے موتی بکھیرتے رہے۔ وہ گورنمنٹ کالج اٹک (۶۳۔۱۹۴۹ء)، گورنمنٹ کالج لاہور (۷۰۔۱۹۶۴ء) تعینات رہے، پھر انھیں ترقی دے کر پرنسپل بنا دیا گیا اور ڈگری کالج باغبانپورہ لاہور میں فرائض کی ادائیگی کے لیے بھیجا گیا۔ وہاں وہ ۷۴۔۱۹۷۰ء تک تعینات رہے۔

پروفیسر محمد عثمان کو ڈائریکٹر ادارہ تعلیم وتحقیق لاہور تعینات کر دیا گیا۔ وہاں وہ ۸۰۔۱۹۷۴ء اپنی فرائض کی ادائیگی کے لیے کام کرتے رہے۔ انھیں ایک بار پھر پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں ایک سال کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہاں وہ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۱ء تک تعینات رہے۔

پروفیسر محمد عثمان کی معروف کتب میں ''اقبال کا فلسفہ خودی'' (۱۹۶۲ء)، ''حیاتِ اقبال کا ایک جذباتی دور'' (۱۹۶۴ء)، ''اسلام پاکستان میں'' (۱۹۶۹ء)، ''اسلامی سوشلزم''، ''نئے تعلیمی تقاضے'' (۱۹۷۶ء)، ''فکر اسلامی کی تشکیل نو'' پروفیسر محمد عثمان نے کمال محنت سے افکار اقبال کو پہلے سمجھا اور پھر دوسروں تک منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ پروفیسر محمد عثمان نے اقبال کے افکار کی صحیح روح کو سمجھا ہے اور پوری دیانت داری سے نسل نو تک پہنچانے

میں بھی کامیاب وکامران ٹھہرے۔

پروفیسر محمد عثمان ۲۰ جون ۱۹۸۷ء لاہور کو انتقال کر گئے اور انھیں گلبرگ، لاہور میں تدفین کی گئی۔

اقبال کا فلسفۂ خودی (بنیادی تصورات)

پبلشرز: مکتبہ جدید پریس۔ لاہور، اشاعت ۱۹۷۱ء صفحات ۱۹۹، قیمت ۶ روپے

ooo

محمد علی صدیقی، ڈاکٹر

(۱۹۳۸ء۔۲۰۱۳ء)

ڈاکٹر محمد علی صدیقی ۸ مارچ ۱۹۳۸ء میں امروہہ میں پیدا ہوائے۔ مڈل تک تعلیم امام المدارس ہائی سکول امروہہ میں حاصل کی۔ تقسیم کے بعد وہ خاندان کے ہمراہ کراچی تشریف لے آئے۔ کراچی سے ۱۹۵۳ء میں میٹرک، ۱۹۶۰ء میں اسلامیہ کالج سے بی اے، ۱۹۶۵ء میں ایم اے انگلش اور ۱۹۹۲ء میں پی ایچ ڈی میں مکمل کی۔ ڈی لٹ (مطالعہ پاکستان) کی ڈگری بھی حاصل کی۔ وہ برٹش ریویو میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر تعینات ہوئے۔ ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۴ء تک کراچی یونی ورسٹی میں اسسنٹ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد انھیں قائداعظم اکادمی کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا۔ محمد علی صدیقی مینجمنٹ اینڈ سوشل سائنسز انسٹی ٹیوٹ آف بزنس اینڈ ٹیکنالوجی کراچی کے ڈین آف فیکلٹی بھی رہے۔ وہ ایجوکیشن اینڈ سوشل سائنسز ہمدرد یونی ورسٹی کراچی کے بھی ڈین آف فیکلٹی چھ سال تک رہے۔

وہ اردو، فارسی، انگلش، فرانسیسی، سندھی، پنجابی، اور سرائیکی زبانوں سے واقف تھے لیکن انگریزی اور اردو میں خوب دسترس رکھتے تھے۔ وہ ۱۹۶۴ء سے مختلف علمی و ادبی رسائل اور اخبارات میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھتے رہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی ذاتی طور پر بھی اپنی وضع کے انسان تھے، تنقید نگاری میں بھی انھوں نے اپنی ایک علیحدہ پہچان قائم کروائی۔ وہ ترقی پسند روایت کا حصہ ہونے کے باوجود دیگر ترقی پسند نقادوں سے بآسانی ممیز بھی کیے جا سکتے تھے۔ ڈاکٹر صدیقی نے بے انتہا پڑھا اور بے تکان لکھا۔ سترہ کتابیں، سیکڑوں مضامین، کئی ہزار کتابوں پر انگریزی اور اردو میں تبصرے اور روز نامہ ''ڈان'' اور ''بزنس ریکارڈ میں ''ایریل'' کے قلمی نام سے چالیس بیالیس سال تک ادبی کالم،

لٹریری راؤنڈ اپ، ان کی زود نویسی، نیز ان کے خیالات و افکار کے ایک بحرِ بے کنار ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تمام مضامین اور کالموں کو اکٹھا کیا جائے اور انھیں کتابی صورت میں محفوظ کر لیا جائے۔ صدیقی صاحب نے علم و ادب کی دنیا میں جو مقام حاصل کیا۔ اس کے پیچھے ایک طویل جدو جہد، ایک زندہ تڑپ، اضطراب کے کئی رنگ اور مشکلات سے عہدہ برا ہونے کا ایک فقید المثال عزم کارفرما تھا تقسیم ہند کے بعد کراچی آنے پر انھوں نے بہت نیچے جہد للبقا کا آغاز کیا۔ ان کا سلسلہ تقسیم بھی ٹوٹ ٹوٹ کر چلتا اور چل چل کر ٹوٹتا رہا لیکن انھوں لقے ہمت کبھی نہیں ہاری۔ ملازمتوں کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی۔

۹ جنوری ۲۰۱۳ء کو محمد علی صدیقی اس بزم ہست و بود سے روانہ ہو چکے ہیں لیکن جو کچھ وہ اپنی تحریروں کی شکل میں چھوڑ گئے ہیں، ان کا وزن ہمیشہ محسوس کیا جاتا رہے گا۔ خاص طور سے اردو تنقید میں ان کی خدمات اجلے حروف میں لکھی جائیں گی۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی ادبی معرکوں میں بھی پوری توانائی کے ساتھ اترتے تھے۔ ادبی موضوعات پر وہ اپنے مؤقف کے اثبات میں بڑی محنت سے دلائل اکٹھا کرتے تھے اور ایسا کرتے وقت وہ مختلف سماجی علوم اور دوسری زبانوں کے ادبیات سے ہر ممکن استفادے کی کوشش بھی کیا کرتے تھے۔ وہ ادبی دنیا میں جاری بحثوں اور مباحثوں اور کسی حد تک معاصرانہ چشمکوں میں بھی اپنے وجود کا پورا پورا ثبوت دیتے تھے۔ ہمارے ادب کی درخشندہ روایتوں میں ایک اہم اور دل چسپ روایت ادبی معرکوں سے عبارت ہے۔ معرکۂ انیس و دبیر سے بھی اس روایت کا مطالعہ شروع کریں تو بیسویں صدی کے دوسرے نصف تک بڑے تاریخ ساز معرکے ہمارے ادب کو زرخیز بناتے نظر آتے ہیں۔ صدی کے اواخر بل کہ اکیسویں صدی کے پہلے عشرے تک کے معرکہ آراؤں میں محمد علی صدیقی صاحب پیش پیش نظر آتے تھے۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں جدیدیت کے خلاف ترقی پسندی کے نقطہ نظر سے جو محاذ کھلا، اس کے شاید سب سے مستعد وکیل وہی تھے۔ پھر ۱۹۷۰ء کے عشرے میں نثری نظم کا موضوع نکلا تو صدیقی صاحب کی بیسیوں تحریریں نثری نظم کے حوالے سے ان کے تحفظات پر مشتمل منظر عام پر آئیں۔

ان کی معروف تصانیف میں ''توازن'' (۱۹۷۶ء)، ''کروچے کی سرگزشت'' (ترجمہ ۱۹۷۹ء)، ''نشانات'' (۱۹۸۱ء)، ''پاکستانیات''، ''مضامین'' (۱۹۹۱ء) ''اشارے'' (۱۹۹۴ء) ''قائداعظم کے شب و روز''، اور ''قائداعظم کی گول میز کانفرنس کی تقاریر''، ''فیض احمد فیض درد اور درماں کا شاعر'' وغیرہ

شامل ہیں۔ وہ نقادوں کی بین الاقوامی انجمن A.I.C.L کے رکن تھے۔ بزنیک یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے حوالے سے بہت کچھ لکھتے رہے۔ مابعد جدیدیت کے تازہ ترین نظریے کا تقاضا ڈھونڈتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس ضمن میں حقائق مکمل طور پر موجود نہیں ہیں۔ عالمی ادب میں مابعد جدیدیت ایک بین الاقوامی میڈیا یا سوسائٹی کے گلوبل ویلج کا قیام ضروری ہے۔ ترقی پسند بھی اس بات کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ ادب برائے زندگی کے ساتھ ساتھ کسی بھی پیغام میں ادبیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مابعد جدیدیت کے نظریہ کے تحت ترقی پسند ادب اور ثقافت کے لیے وسیع النظری کا فروغ جاری ہے اسے نظر انداز کرنا بہتر نہیں ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بھی ترقی پسند فکر کے حامی تھے لیکن ساتھ ساتھ وہ بھی عالمی سطح پر ادبی سوچ جدیدیت کے تناظر میں دیکھنے کے حامل تھے۔ ترقی پسند شاعروں ادیبوں کے لیے سیاست اور ادب کے مابین گہرا تعلق بھی آہستہ آہستہ فروغ پا رہا ہے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر وزیر آغا نے امتزاجی تنقید کو متعارف کروانے میں اپنا زاویۂ نظر رکھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے بقول برعظیم پاک و ہند کی اردو تنقید نے اس مشینی کل کو ایک عفریت کے روپ میں تو نہ دیکھا کیوں کہ وہ ابھی ہمارے معاشرے سے خاصی دوری پر تھا مگر اس نے ایک ایسے بڑے سٹرکچر کے لمس کو یقیناً محسوس کیا جو چھوٹے چھوٹے سٹرکچروں سے مل کر مرتب ہو رہا تھا۔ ایک طرف حلقہ اربابِ ذوق کی تنقید تھی، جو فن کو میزان گردانتی تھی، ادب پارے میں مضمر معنی کو اساسی حیثیت دیتی تھی اور دوسری طرف ترقی پسند تنقید تھی جو ادب پارے میں سماجی، معاشی اور طبقاتی شعور کی کمی یا بیشی کی بنیاد پر اس کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کا فیصلہ سناتی تھی۔ عمودی پہلوؤں کی حامل تنقید نے ادبی تخلیق کو ایک خود کفیل اور بااختیار اکائی جانا اور اس کی بنت میں موجود اس ثقافتی مواد کی نشاندہی کی جو انسان کا لاشعوری ورثہ ہے۔ افقی پہلوؤں کی حامل تنقید نے طبقات کی باہمی آویزش سے نمو پانے والی رُوحِ عصر کا ذکر کیا اور ادب پارے کو روحِ عصر کے تناظر میں دیکھنے کی عادت ڈال دی۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی چوں کہ ایک وسیع المطالعہ شخص تھے اس لیے وہ اپنی تحریر میں جامعیت اور وسعت نظری کا مظاہرہ کرتے۔ ٹھوس دلائل کے ساتھ اپنی بات مکمل کرتے۔ ہوا میں تیر چلانے کے بجائے وہ مدلل گفت گو اور حوالہ جات دے کر اپنے مؤقف کی دلالت کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان

کی تحریر میں ایک ٹھہراؤ بھی تھا اور ایک بہاؤ بھی۔۔۔ان کی تنقید کو بھی دل چسپی سے پڑھا جاتا اس لیے کہ وہ آسان لفظوں میں بات کرنے کے عادی تھے۔وہ گھما پھیرا کر بات نہ کرتے بل کہ سیدھی اور آسان زبان استعمال کرتے تھے۔یہی طرزِ تحریر شاید اخبار میں کالم لکھنے اور مضامین لکھنے کی وجہ سے ان کے ہاں در آیا تھا۔تحریر ہر کسی نے پڑھنا ہوتی ہے اس میں کم تعلیم یافتہ طبقہ بھی موجود ہوتا ہے اور پڑھا لکھا طبقہ بھی اس لیے ان کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ وہ آسان اور سادہ زبان برتیں۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی سچے کھرے پاکستانی تھے۔قائداعظم اور علامہ اقبال سے گہری محبت رکھتے تھے۔اُن کا تفہیمِ اقبال کے حوالہ سے ایک بڑا نام ہے۔شاید اقبال کی تلاش میں نکلتے ہوئے اُنھوں نے اپنی کتاب ''تلاشِ اقبال'' مرتب کر ڈالی۔اس کتاب کے مطالعہ سے ہم اقبال شناسی کے قریب ہو سکتے ہیں۔کتاب کا حوالہ پیشِ خدمت ہے۔

تلاشِ اقبال

ناشر: پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، صفحات: ۲۱۰، اشاعت: دسمبر ۲۰۰۲ء، قیمت: ۲۰۰ روپے

OOO

محمد فرمان، پروفیسر

(۱۷ر اکتوبر ۱۹۲۴ء۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۷۸ء)

پروفیسر محمد فرمان ۱۷ر اکتوبر ۱۹۲۴ء غازی، ہزارہ میں پیدا ہوئے۔ پروفیسر محمد فرمان ماہرِ تعلیم اردو ادیب، ماہرِ اقبالیات، محقق اور دانش ور تھے۔ درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ رہے۔ زمیندار کالج گجرات میں پرنسپل کے عہدہ جلیلہ پر بھی فائز رہے۔

ان کی معروف کتب میں ''اقبال اور تصوف''، ''فتنۂ انکار حدیث''، ''اقبال اور منکرین حدیث''، ''حیات مجدد'' شامل ہیں۔ اقبالیاتی ادب میں ان کی کتاب ''اقبال اور تصوف'' خاصی مقبول ہے۔

''اقبال اور تصوف'' ایک ایسی اہم کتاب ہے جو اقبال کے تصوف کے بارے میں خیالات کی توضیح کرتی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۸ء میں پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی اور اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ کتاب کے مصنف پروفیسر محمد فرمان نے پہلے باب میں تصوف کی حقیقت اور قرآن پاک اور سنتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں اس کی وضاحت کی، جس سے ایک عام آدمی تصوف کے متعلق آگاہ ہوتا ہے۔ باقی ابواب میں اقبال اور تصوف کے مسلک پر بحث کرتے ہوئے تصوف کے بارے میں اقبال کے عقائد کی وضاحت کی ہے۔ کتاب کے آٹھ (۸) ابواب ہیں۔ تمام ابواب اقبال اور تصوف کے بارے میں خزینۂ علم کا درجہ رکھتے ہیں۔

پروفیسر محمد فرمان ۳۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو گجرات میں انتقال کر گئے۔ انھیں غازی، ہزارہ میں دفن کیا گیا۔ ان کا تذکرہ ''اقبال اور گجرات'' میں بھی ملتا ہے۔ اقبال پر ان کی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال اور تصوف

پبلشرز: بزمِ اقبال، لاہور، اشاعت: طبع سوم مارچ ۱۹۸۴ء، صفحات ۱۶۴، قیمت ۲۰ روپے

محمد یوسف گورایہ، ڈاکٹر

(۲رفروری ۱۹۳۳ء۔۱۴راپریل ۱۹۹۵ء)

محمد یوسف گورایہ ۲رفروری ۱۹۳۳ء موضع پڑہ کلاں ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔محمد یوسف گورایہ ممتاز عالم علوم اسلامیہ، محقق، اقبال شناس، اور مترجم تھے۔انھوں نے ان اصناف میں خوب شہرت پائی۔ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ ڈائریکٹر علماء اکیڈمی لاہور بھی رہے۔ان کی اس ادارہ کے لیے خدمات ہمیشہ یادرکھی جائیں گی۔انھوں نے ہمیشہ اتحاد اور امن کی فضا کو فروغ دیا ہے۔ان کی کتب میں ''علامہ اقبال اور اصولِ اجتہاد''، ''اسلامی تصورات، اقبال اور عصر حاضر''
Allama Iqbal and the Authority to Interpret Shariat in a Modern Islamic State
شامل ہیں۔فیصل ہال سرگودھا میں منعقدہ ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ نے کہا کہ اجتہاد کے بغیر ہماری قومی زندگی ارتقائی منازل طے نہیں کرسکتی۔دورہ حاضر میں اجتہاد ہی ہماری ترقی کا ضامن ہے۔ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں جو مرکزی نقطہ پیش کیا ہے، وہ اجتہاد ہے۔زمانہ کبھی ایک نقطے پر مرکوز نہیں ہوتا۔ہر آنے والا کل اپنے ساتھ نئی بہاریں لے کر آتا ہے۔ایک وقت تھا تمام علماء کرام تصویر کشی کے خلاف تھے لیکن ابھی وہ وقت ہے ہر مکتبِ فکر اخبارات کی زینت بن رہا ہے۔ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ نے یہ کتاب لکھ کر گویا اقبال کے اجتہادی مشن کو آگے بڑھانے کی بھرپور انداز میں کوشش کی ہے۔ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ ۱۴راپریل ۱۹۹۵ء کو دارفانی سے کوچ کر گئے۔

اقبال اور اجتہاد

پبلشرز: فیروزسنز لاہور، اشاعت ۱۹۸۹ء باراول صفحات ۷۹، قیمت ۳۰ روپے

محمد یونس حسرت

(۱۳/ اپریل ۱۹۳۳ء۔ ۱۳/ ستمبر ۱۹۹۹ء)

محمد یونس حسرت ۱۳/ اپریل ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ یاسر جواد نے ''انسائیکلوپیڈیا ادبیات عالم'' میں ان کی پیدائش ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ درج کی ہے جب کہ ڈاکٹر محمد منیر سلیچ ''وفیاتِ اہلِ قلم'' میں محمد یونس حسرت کی پیدائش چوہٹہ خورد پٹیالہ درج کی ہے۔ ہاں البتہ دونوں نے تاریخ پیدائش ۱۹۳۳ء درج کر رکھی ہے۔

محمد یونس حسرت ممتاز اردو شاعر، ادیب، ناول نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، بچوں کے ادیب، مترجم اور ماہر تعلیم تھے۔

ناول: ''نینا''، ''تارے میری پلکوں کے''، ''پیاسے پھول''

شعری مجموعہ ''نشاط البیان''

ترجمہ: ''کلام سلطان باہوؒ (بعنوان ''چنبے دی بوٹی'')

ترتیب: کلیاتِ اکبر الٰہ آبادی (تین جلدیں)

اقبالیات: ''کلیدِ اقبال''

علامہ محمد اقبال کے اردو اور فارسی کلام کا مصرعہ وار اشاریہ تو کئی لوگوں نے مرتب کیا ہے لیکن اقبال کی لفظیات (ڈکشن) کا اشاریہ پہلی مرتبہ سامنے آیا ہے۔ محمد یونس حسرت نے کمال عرق ریزی اور محنت سے ایک ایسی کتاب مرتب کی ہے، جس میں اقبال کے اردو و فارسی کلام میں استعمال ہونے والے الفاظ کا حروف تہجی کے اعتبار سے ایسا مربوط اشاریہ دیا ہے کہ جس کی مدد سے

انتہائی آسانی کے ساتھ اقبال کے کلام میں شامل مطلوبہ الفاظ تلاش کیے جاسکتے ہیں۔محمد یونس حسرت نے قبل ازیں منظر عام پر آنے والے اشاریوں کا نہ صرف ذکر کیا ہے بل کہ ان میں موجود اغلاط اور تشنگی کی طرف بھی توجہ مبذول کروائی ہے۔

''کلیدِ اقبال'' دراصل اقبال کے شعروں میں استعمال ہونے والے ان لفظوں کا اشاریہ ہے، جس کی ایک عرصہ سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔محمد یونس حسرت نے اس ضرورت کو بڑی محنت سے پورا کر دیا ہے۔انھوں نے کلامِ اقبال میں استعمال ہونے والی تراکیب اور اضافتوں کو بھی اس کتاب کا حصہ بنایا ہے اور بتایا ہے کہ ایک لفظ ''پیکر خاکی'' کلیات اقبال میں کہاں کہاں اور کتنی بار استعمال ہوا ہے۔ یہ بہت ہی مشکل اور دقیق کام تھا، جسے محمد یونس حسرت نے کمال محنت سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔محمد یونس حسرت ۱۳ر ستمبر ۱۹۹۹ء میں انتقال کر گئے۔اقبال پر ان کی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

کلید اقبال

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: ۱۹۸۶ء، صفحات: ۳۶۸، قیمت ۸۰روپے

ooo

محمود نظامی

(۱۹۱۱ء۔۱۹۶۰ء)

مرزا محمود علی اصل نام تھا، جب کہ محمود نظامی کے نام سے ادب میں معروف ہوئے۔ محمود نظامی ۱۹۱۱ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ اپنے نانا نظام الدین بیگ سے بہت کچھ سیکھا۔ اسی حوالے سے اپنے نام کے ساتھ نظامی کا تخلص لگایا۔ میٹرک کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور آ گئے۔ یہاں پہنچ کر انھیں ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر ایسے قابل استاد کی صحبت میسر آئی۔ محمود نظامی کے علمی ذوق کو مہمیز لگانے میں ڈاکٹر تاثیر کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کر لی۔ تقسیم کے بعد پاکستان آ گئے اور ریڈیو پاکستان کے ساتھ وابستہ ہوئے۔ ترقی کرتے ہوئے محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر تعینات رہے۔ یونیسکو کی طرف سے محمود نظامی کو مختلف ممالک کی سیر کرنے کا موقع بھی میسر آیا۔ ۲۲/اکتوبر ۱۹۵۲ء کو شروع ہونے والے سفر میں انھوں نے مصر، لبنان، اٹلی، فرانس، برطانیہ، امریکہ وغیرہ کی سیاحت کی اور واپسی پر سفر نامہ بھی لکھا جسے ''نظر نامہ'' کے نام سے ۱۹۵۸ء میں شائع کروایا۔ اس سفر نامے کو اردو ادب میں بہت مقام و مرتبہ ملا۔ ان کے اسلوب و بیان کی تعریف کی گئی ان کی منظر نگاری، تصویر کشی اور ان اسلوب میں شگفتگی کو خوب سراہا گیا۔

محمود نظامی انگریزی اور اردو ادب سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے ریڈیو پاکستان کے لیے کئی ڈرامے بھی تحریر کیے جن میں ''کلرک''، ''دختر بابلی''، ''سیفی اور نیلوفر'' شامل ہیں۔ محمود نظامی نے اقبال کے حوالے سے بھی ایک نہایت عمدہ کتاب ''اقبال۔۔۔قریب سے'' مرتب کی۔

ممتاز دانش ور، محقق اور نثر نگار محمود نظامی نے اقبال کے قریبی دوستوں کے مضامین کو

''علامہ اقبال ......قریب سے'' کتابی شکل میں پیش کر کے ایک بہت بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔ یہ کاوش آنے والے نوجوانوں کے لیے ایک مشعلِ آفاق بن گئی ہے۔ علامہ محمد اقبال کے فکر و فن پر لکھے گئے یہ مضامین اقبال کے قریبی شناساؤں نے لکھے ہیں جن میں بے تکلفی کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔

کتاب میں کل ۱۶ مضامین کے علاوہ نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ ان تصاویر کی وجہ سے کتاب کی انفرادیت میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ شخصیات جو ہمارے شعور میں ناموں کی صورت منعکس رہتی ہیں، وہ تصویری شکل میں اس کتاب کی زینت ہیں۔ اہم شخصیات کی نہ صرف تصاویر موجود ہیں بل کہ ان کا مختصراً تعارف بھی تصویر کی اہمیت کو اجاگر کر رہا ہے۔ کسی شخصیت کے جو جتنا قریب ہوتا ہے وہ اسے اتنا ہی بہتر جانتا اور سمجھتا ہے۔ درون خانہ اور بیرونِ خانہ اس شخصیت کی عکاسی اس کے بے تکلف دوست ہی کر سکتے ہیں۔ ''علامہ اقبال ......قریب سے'' ایک ایسا آئینہ ہے جس میں حیات اقبال کی لفظی حقیقی تصاویر جلوہ نما ہیں۔ ان مضامین میں بناوٹ نہیں، بل کہ خلوص کی گھلاوٹ ہے۔ تصنع نہیں، حقیقت ہے۔ یہ تحریریں جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری نہیں بل کہ ایک شخصیت کی حقیقی شکل اور اس کی فکری کاوشوں کا آئینہ ہے۔

بقول صلاح الدین احمد: ''جہاں تک مشاہدے کا تعلق ہے نظامی صاحب کی نظر سنگ وخشت سے ٹکرا کر واپس نہیں لوٹتی بل کہ انھیں چیر کر ان خاموش ہنگامہ زاروں میں اتر جاتی ہے جہاں زندگی چیختی ہے اور مسکراتی ہے۔''

ایک ادبی کانفرنس کراچی میں تھے کہ دل کا شدید دورہ پڑنے سے ۱۹۶۰ء میں انتقال کر گئے۔ اس وقت وہ ریڈیو پاکستان کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل تھے۔ ان کی علامہ اقبال پر کتاب کا حوالہ درج ہے۔

علامہ اقبال......قریب سے

پبلشر: ماہنامہ آتش فشاں، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور، اشاعت: ۲۰۱۳ء، صفحات ۲۳۲، قیمت ۳۰۰ روپے

OOO

محی الدین قادری زورؔ، ڈاکٹر، سیّد

(۶ دسمبر ۱۹۰۴ء۔ ۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء)

سید محی الدین قادری ۶ دسمبر ۱۹۰۴ء بمطابق ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ شاہ گنج، حیدر آباد میں حضرت زعم کے ہاں پیدا ہوئے۔ سید محی الدین قادری کا سلسلۂ نسب قطب الاقطاب سید احمد کبیر رفاعی تک پہنچتا ہے۔ ان کے بزرگوں کے مزارات قندھار دکن میں موجود ہیں۔ سید محی الدین قادری، سید ابراہیم، نظام الدین اولیاء کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے تھے۔ صاحب عالم حاجی سید شاہ عنایت اللہ حسینی شہیدان کے حقیقی دادا تھے جن کی سوانح عمری ''روضۃ الشہدا'' کے نام سے منصۂ شہود پر آ چکی ہے ان کے دادا نے یکم رمضان ۱۳۲۶ھ کو رحلت فرمائی۔

ان کی والدہ بشیر النساء بیگم کا تعلق فضیلت جنگ سے تھا۔ فضیلت جنگ، حیدر آباد کے چھٹے حکمران میر محبوب علی خان آصف سادس کے دور میں سررشتہ امور مذہبی کے وزیر اعلیٰ تھے۔ سید محی الدین قادری کے ددھیال اور ننھیال دونوں مشائخین کے گھرانے تھے، جن کا خوب عزت و احترام اور مقام و مرتبہ تھا۔ ان کے نانا محمد وقار الدین بھی اپنے وقت کے جید عالم اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ محمد وقار الدین کے والد محمد محسن بھی شاعر اور ادیب تھے۔ سید محی الدین قادری زور نے پیری مریدی کی روایات کو برقرار رکھا۔ مختلف مقامات پر جا کر تبلیغی اجتماعات بھی کرتے رہے۔ جس میں سیکڑوں معتقدین اور حلقہ ارادت کے افراد شریک ہوتے رہتے۔

سید محی الدین قادری نے ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد گرامی سے حاصل کی۔ پھر انھیں مدرسہ دار العلوم میں داخل کرایا گیا اس کے بعد سٹی ہائی سکول اور پھر عثمانیہ کالج میں تعلیم حاصل کرتے

رہے۔ ۱۹۲۵ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ اسی سال حکومت حیدر آباد کے سرکاری وظیفے پر اگست انگلستان چلے گئے۔ ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر محی الدین نے لندن یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا تحقیقی مقالہ اردو کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں تھا۔ ان کے مقالے کو بہت سراہا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں صوتیات پر تحقیقی مقالہ ''ہندوستانی فونٹکس''، ''لے انسٹی ٹیوٹ دی فونٹیک'' میں مکمل کیا۔ ۲۱ دسمبر ۱۹۳۰ء کو جینوا سے روم روانہ ہوئے۔ اور ۲۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو کولمبو پہنچے۔ کولمبو سے مدراس کا سفر کیا اور وہاں سے حیدر آباد پہنچے۔

حیدر آباد آکر عثمانیہ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیت ریڈر تعینات ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں چادر گھاٹ کالج میں بحیثیت پرنسپل تعینات ہوئے اور ۱۹۶۰ء میں ریٹائرمنٹ لی۔ حکومت ہند کی طرف سے ساہتیہ اکیڈمی کے ممبر نامزد ہوئے۔ اس کے علاوہ سرکاری میگزین ''آج کل'' دہلی سے بھی وابستہ ہوئے۔ کشمیر یونی ورسٹی کے صدر شعبہ اردو اور ڈین بھی رہے۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۶۲ء کو دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور ۲۴ دسمبر ۱۹۶۲ء کی رات رحلت فرما گئے۔

ان کی تحقیقی تصانیف میں ''اردو شہ پارے''، ''حب رنگ''، ''تذکرہ گلزار ابراہیم''، ''تذکرہ گلشن ہند''، ''عہد عثمانی میں اردو کی ترقی''، ''دکنی ادب کی تاریخ''، ''کیف سخن''، ''رمزِ سخن''، ''فیض سخن''، ''بادۂ سخن''، ''متاعِ سخن''، ''مرقع سخن''، ''کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ''، ''حیاتِ میر محمد مومن''، ''تذکرہ اردو مخطوطات''، ''سرگزشت حاتم''، ''داستان ادب حیدر آباد''، ''تذکرہ مخطوطات'' (پانچ جلدوں)، ''فرخندہ بنیاد حیدر آباد''، ''مثنوی طالب وموہنی'' اور ''معانی سخن'' شامل ہیں۔

تنقیدی کتب میں ''روح تنقید''، ''روح غالب''، ''تین شاعر''، ''جواہر سخن''، ''ادبی تاثرات''، ''ادبی تحریریں''، ''صوتیات ولسانیات: ''ہندوستانی صوتیات''، ''ہندوستانی فونٹکس''، ''ہندوستانی لسانیات'' افسانہ نگاری: ''طلسم تقدیر''، ''سیر گولکنڈہ'' شامل ہیں۔ شاعری کرتے تھے لیکن کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔

شاداقبال

پبلشرز: اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد، اشاعت باراول ۱۹۴۲ء، صفحات ۱۷۵، قیمت دو روپے آٹھ آنے

ooo

مشرف احمد

(جون ۱۹۴۲ء۔ ۱۳ مئی ۲۰۰۳ء)

پاکستان کے وہ نقاد جنھوں نے غیر ملکی شاعروں ادیبوں کے فکر وفن پر تنقیدی انداز میں روشنی ڈالی اور اسے پاکستانی ادیبوں سے موازنہ کرنے کی کوشش کی ان میں مشرف احمد سرفہرست ہیں ۴۔۵ جنوری ۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر مشرف احمد سے میری دو دن متواتر ملاقات رہی۔ پی ایچ ڈی کے سلسلہ میں مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا تو ڈاکٹر مشرف احمد نے مشفق خواجہ کی شفقت کے ساتھ مجھے رہنمائی فراہم کی۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو پاکستان کے مرکزی دفتر تک میری رسائی کو آسان بنایا۔ ڈاکٹر مشرف احمد تحقیق وتنقید میں اپنی پہچان رکھتے تھے۔ انھیں خود ساختہ شہرت سے نفرت تھی۔ ڈاکٹر مشرف احمد جون ۱۹۴۲ء کو علی محمد قاضی کے ہاں کھرڑ ضلع انبالہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ''اردو افسانے کی روایت اور میر ناصر علی'' پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر مشرف احمد ماہنامہ ''دائرے'' اور سہ ماہی ''ارمغان'' کراچی کے مدیر بھی رہے۔

انھوں نے افسانہ نگار، نقاد، محقق، کالم نگار اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے شہرت پائی۔ مشرف احمد مہتمم غالب لائبریری کراچی بھی رہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ '' جب شہر نہیں بولتے'' ۱۹۸۴ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ ان کی تنقیدی کتب میں ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ''، ''اقبال شناسی''، ''کرشن چندر کا تنقیدی مطالعہ''، ''راجندر سنگھ بیدی کا تنقیدی مطالعہ''، ''حسین شاہ حقیقت اور ان کا خاندان'' اور ''انجم اعظمی: حیات وخدمات'' شامل ہیں۔ ۱۳ مئی ۲۰۰۳ء کو کراچی میں انتقال کر گئے اور یخی حسن کراچی میں تدفین ہوئی۔ اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال شناسی

پبلشرز: نفیس اکیڈمی، کراچی، اشاعت: اکتوبر ۱۹۸۶ء، صفحات ۳۲۰، قیمت ۶۰ روپے

مشکور حسین یاد

(۱۹۲۵ء۔۱۲ نومبر ۲۰۱۷ء)

اللہ کریم بعض شخصیات کو گوناگوں صفات سے مالا مال کر دیتا ہے۔ایسی شخصیات دوسروں کے لیے مختلف نوعیت کے کاموں میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔علم وادب کی شاہراہ پر مشکور حسین یاد ایک عرصہ سے گامزن تھے۔بحیثیت شاعر، ادیب، کالم نویس، انشائیہ نگار، مزح نگار اور نقاد انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا تھا۔دو مرتبہ ان سے رُوبرو ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔طنز و مزاح سے مزین گفت گو ان کی شخصیت کا طرۂ امتیاز تھا۔مشکور حسین یاد سے جو بھی ملتا تھا ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر انھیں ''یاد'' کرتا۔مشکور اور یاد کا حسین سنگم ان کی شخصیت کے گرد گھومتا تھا۔

سید مشکور حسین یاد، ستمبر ۱۹۲۵ء کو مشرقی پنجاب، ہندوستان کے ضلع حصار کے گاؤں بڈولی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم و تربیت ضلع حصار مشرقی پنجاب میں حاصل کی۔ایف اے کا امتحان لدھیانہ سے پاس کیا۔بی اے کا امتحان جالندھر سے پاس کیا۔انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی سے ۱۹۵۵ء میں ایم اے اردو، اور ۱۹۶۰ء میں ایم اے فارسی کیا۔۱۹۸۶ء تک گورنمنٹ کالج لاہور میں اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔مشکور حسین یاد تحریک پاکستان کی خونچکاں داستانوں کے چشم دید گواہ ہیں۔انھوں نے تحریک پاکستان کے دل خراش واقعات سے جرأت و استقامت سیکھی۔

برعظیم پاک و ہند کی تقسیم کا اعلان ہوتے ہی مختلف مقامات پر ہندوؤں، سکھوں اور دیگر بلوائیوں نے کشت و خون سے سڑکوں کو لالہ زار بنا دیا۔۱۹۴۷ء کے فسادات میں تمام قریبی رشتہ دار والدہ، بیوی، بچی، بھائی، بہنیں، خالہ زاد بھائی اور بہنیں، ماموں، نانا، نانی سب ان کی آنکھوں کے

سامنے شہید ہو گئے۔ مشکور حسین یاد نے ۱۹۴۸ء میں لاہور سے ماہنامہ ''انیس'' اور پھر ۱۹۸۹ء میں طنزیہ مزاحیہ جریدہ ''چشمک'' بھی جاری کیا جب کہ بعض روایات میں مزاحیہ ادبی رسالے کا نام ''زعفران'' بھی ملتا ہے۔ تنقید و تحقیق کے شعبے میں بھی مشکور حسین یاد نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انھوں نے تحقیق و تنقید کے دائرے کو مرزا اسد اللہ خان غالب اور ڈاکٹر علامہ اقبال کے گرد حصار کی صورت رکھا۔ مختلف کتابوں میں ان کی پاکستان آمد کے بارے میں تواریخ مختلف ہیں۔ مجموعی طور پر جو بات اظہر من الشمس ہے وہ یہی ہے کہ ہشت نومبر ۱۹۴۷ء میں مشکور حسین یاد آزادی کی سرزمین پاکستان میں داخل ہوئے۔ یہاں کچھ عرصہ ڈائریکٹر تعلیم لاہور کے دفتر میں کلرک کی حیثیت سے کام کیا۔ بعدازاں محکمہ انہار میں ضلع دار ہو گئے۔ یہ محکمہ طبیعت کو راس نہ آیا۔ اسے چھوڑ کر محکمہ تعلیم کی طرف رجوع کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ اردو سے منسلک ہو گئے۔ انھوں نے درس و تدریس کا پیشہ اپنایا اور گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی لاہور سے ریٹائرمنٹ لی۔

مشکور حسین یاد کے انشائیوں کے متعدد مجموعے قابلِ ذکر ہیں جیسے ''دشنام کے آئینے میں'' (۱۹۷۵ء)، ''اپنی صورت آپ''، (۱۹۷۷ء)، ''ستم ظریف'' (۱۹۸۸ء)، ''بات کی اونچی ذات'' (۱۹۸۹ء)، ''وقت کا استعارہ''، (۱۹۹۹ء)، اور ''جوہر اندیشہ'' (۲۰۰۸ء)۔ اس کے علاوہ شاعری کے مندرجہ ذیل مجموعہ ہائے کلام اہمیت کے حامل ہیں ''انقلاب ایران پر نظمیں ''ایران صبح دم'' (۱۹۸۵ء)، حمدیں ''اللہ ھو'' (۲۰۰۴ء)۔ غزلوں کے مجموعے ''برداشت (۲۰۰۴ء)، ''پرداخت'' (۲۰۰۶ء)، ''نگہداشت'' (۲۰۰۷ء)، ''عرض داشت'' (۲۰۰۸ء)، ''پرسش'' (۲۰۱۰ء)۔ انھوں نے ملا صدرا کے فلسفے، انیس و دبیر کی شاعری اور غالب کے جمالیاتی شعور پر کتب لکھنے کے علاوہ آپ بیتی ''آزادی کے چراغ'' (۱۹۹۷ء) بھی قلم بند کی۔ مشکور حسین یاد کو حکومت پاکستان کی طرف سے تمغۂ حسن کارکردگی کے علاوہ امریکی، یورپی، اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کی ادبی انجمنوں کی جانب سے لاتعداد اعزازات حاصل ہوئے۔

مشکور حسین یاد بیک وقت تین محاذوں پر صف آرا رہے وہ شاعر، انشائیہ نگار اور طنز نگار بھی تھے ان کا مجموعہ کلام ''مفہوم زمانہ'' شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد مشکور حسین یاد نے زیادہ توجہ نظم کے بجائے نثر کو دی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے طنزیہ مضامین اور انشائیے معروف ادبی جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اردو میں انشائیہ کی صنف خوب باغ و بہار دکھائی ہے۔ اس صنف میں ڈاکٹر وزیر آغا،

غلام جیلانی اصغر، بشیر سیفی، انور سدید، نظیر صدیقی، سلیم آغا قزلباش، مشتاق قمر، داؤد طاہر وغیرہ نے انشائیے کی بیش بہا خدمات انجام دیں ہیں۔ انشائیے کو فروغ دینے میں مشکور حسین یاد کا نام بھی فراموش کرنے والا نہیں ہے۔ مشکور حسین یاد کے انشائیوں میں سنجیدگی اس درجہ مسلّط ہے کہ انشائیہ کی شگفتگی اور تازگی تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ ان کے انشائیوں میں اصلاحی پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح انھوں نے انشائیہ کو اصلاح معاشرہ کے لیے کارگر بنانے کی کوشش کی ہے۔ دونوں باتیں انشائیہ نگار کی ذات کے بے جا اظہار میں مزاحم ہیں ویسے مشکور حسین یاد انشائیے کو پہنچانتے ضرور ہیں مگر اس ڈھب میں انشائیے نہیں لکھے جس انداز میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید اور دوسرے احباب نے انشائیے تحریر کیے ہیں۔ مشکور حسین یاد قدرے مختلف انشائیہ نگار تھے۔

ان کی کتاب ''آزادی کے چراغ'' ۱۹۴۷ء کے کشت وخون اور تبادلہ آبادی کے موضوع پر مبنی ہے۔ اس کتاب کو آپ بیتی بھی قرار دیا جاسکتا ہے کیوں کہ مشکور حسین یاد خاک وخون کا دریا عبور کرکے پاکستان آئے تھے۔ انھوں نے اپنا پورا خاندان شہید ہوتے دیکھا۔ انھوں نے اجڑتے ہوئے قافلے دیکھے۔ انھوں نے مسلمانوں کا قتل عام دیکھا۔ ٹرینوں کی بوگیاں خون سے لت پت دیکھی۔ معصوم بچوں کو قتل ہوتے دیکھا۔ یہ سب مناظر ان کی کتاب ''آزادی کے چراغ'' میں موجود ہیں۔ یہ ایک نوحہ ہے جو انھوں نے فسادات پر لکھا ہے۔ دوسری طرف آزادی کا نغمہ بھی ہے جو انھوں نے لٹتے قافلوں کو دیکھ کر لکھا ہے۔ تمام مضامین پڑھ کر دل وطن کی محبت اور آزادی کی محبت سے معمور ہو جاتا ہے۔ اقبال کو عوامی سطح تک متعارف کروانے کے لیے اُن کے مضامین قابلِ تعریف ہیں۔ اُن کے کئی افسانوں میں فکرِ اقبال کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

انھوں نے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین بھی لکھے اور نہایت شگفتہ زبان میں سماجی اور معاشرتی پہلو پر طنز کی ہے۔ یاد صاحب کی زبان نہایت صاف اور رواں ہے۔ وہ صحت لفظی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ مشکور حسین یاد ۱۲ نومبر ۲۰۱۷ء کو ۹۰ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

کلام اقبال کے عوامی اُفق

ناشر: آغا امیر حسین، کلاسیک، لاہور، اشاعت: ۲۰۰۱ء، صفحات: ۱۹۲، قیمت: ۱۵۰ روپے

ooo

مظفرؒ حسین چودھری

(۱۹؍ستمبر ۱۹۲۹ء۔۲۲ جولائی ۲۰۰۳ء)

مظفرؒ حسین چودھری ۱۹؍ستمبر ۱۹۲۹ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ان کے والدِ گرامی ڈاکٹر نواب الدین اپنے علاقہ کی ممتاز شخصیت تھے۔مظفرؒ حسین چودھری ہمہ جہت علمی و ادبی صلاحیتوں کے مالک تھے۔اردو انگریزی زبانوں میں ان کی نثر قابل ستائش رہی۔وہ منجھے ہوئے صحافی اور ممتاز کالم نگار کے طور پر بھی اپنی شناخت رکھتے تھے۔ڈاکٹر علامہ اقبال کے افکار کی تفہیم و ترویج کے لیے وہ ہمہ وقت مصروفِ عمل رہے۔قیامِ پاکستان کے بعد لاہور ہجرت کر آئے۔اسلامی ایجوکیشن کانگریس کے رُوحِ رواں رہے اور زراعت کے حوالے سے دھرتی کو سونا اُگلنے پر مجبور کرنے کے لیے نت نئے طریقے تلاش کرتے رہے۔مظفرؒ حسین چودھری چوں کہ خود محکمہ زراعت میں ملازم رہے ہیں اور اس کے علاوہ بھی انھوں نے زراعت پر بہت کچھ لکھا ہے،اس لیے افکارِ اقبال سے زرعی نکات تلاش کرنا ان کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ان کی زراعت پر لکھی ہوئی انگریزی کتب دوسرے ممالک کی یونی ورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

ان کی معروف کتب میں ''مغربی جمہوریت اور علامہ اقبال''،''فکرِ اقبال کے دو بنیادی تصورات''،''احیائے اسلام کے دو اسلوب''،''خودی اور آخرت''،''مکاشفاتِ اقبال''،''اقبال کے زرعی افکار''اور''پاکستان کی منزل مراد''شامل ہیں۔

''اقبال کے زرعی افکار'' کی تلاش میں چودھری مظفرؒ حسین نے اقبال کی کشتِ خیال سے زرعی لفظ اگائے ہیں۔جس میں انھوں نے زرعی نظام کے بارے میں علامہ اقبال کے افکار کا احاطہ

کیا ہے۔موضوع کے لحاظ سے کتاب ندرت و جدت کا خوب صورت شاہکار ہے۔کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔جن میں زرعی نظام کے حوالے سے علامہ کے زاویۂ نگاہ کے ساتھ ساتھ موجودہ زرعی مسائل کا حل بھی موجود ہے۔

چودھری مظفر حسین ۲۲ جولائی ۲۰۰۳ء کو لاہور میں انتقال کر گئے اور انھیں لاہور میں ہی دفن کیا گیا۔اقبال کے زرعی افکار کے حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال کے زرعی افکار

پبلشرز: اقبال اکادمی، لاہور۔پاکستان، اشاعت: نومبر ۱۹۸۴ء، صفحات ۱۲۳، قیمت: ۳۰ روپے

ooo

معین الرحمٰن، ڈاکٹر، سیّد

(۵نومبر۱۹۴۲ء۔۱۹اگست۱۹۹۹ء)

ممتاز ماہرِ تعلیم، ماہرِ غالبیات، ماہرِ اقبالیات، ماہرِ اسلامیات اور ماہر مدنیات کے حوالے سے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن محتاج تعارف نہیں ہیں۔ وہ ۵ نومبر ۱۹۴۲ء کو بٹھنڈہ پٹیالہ میں حافظ سید امین الرحمٰن کے ہاں پیدا ہوئے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے خاندان کے ہمراہ پاکستان آ گئے تھے۔ حافظ سید امین الرحمٰن ۱۹ اگست ۱۹۹۹ء کو کراچی میں انتقال کر گئے اور کراچی یونی ورسٹی کیمپس کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے ابتدائی تعلیم بہاول نگر کے پرائمری سکول سے حاصل کی۔ میٹرک ۱۹۵۷ء انٹر ۱۹۵۹ء بہاول نگر سے پاس کیا۔ اردو کالج کراچی سے بی اے اور ایل ایل بی اور کراچی یونی ورسٹی شعبہ اردو سے ایکسٹرنل امیدوار کے طور پر ایم اے کیا۔ وہ ابھی ایم اے میں ہی تھے کہ انھیں ترقی اردو بورڈ کراچی میں ملازمت مل گئی۔ وہ ایڈہاک لیکچرر گورنمنٹ کالج بہاول نگر میں تعینات ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں وہ عارضی طور پر شعبہ اردو پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور چلے گئے۔ ڈاکٹر عبارت بریلوی کی لندن سے واپسی پر یہ ملازمت ختم ہوئی اور وہ ایف سی کالج لاہور میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ اس دوران پنجاب پبلک سروس کمیشن سے بطور لیکچرر تعیناتی عمل میں آئی لیکن انھوں نے ایف سی کالج لاہور میں ہی رہنا پسند کیا اور اس دوران انھوں نے پی ایچ ڈی

(اُردو) کی ان کا موضوع ''غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ'' تھا۔ ان کے نگران پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان تھے جبکہ پروفیسر وقار عظیم اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی بھرپور معاونت بھی حاصل

رہی۔۱۹۷۳ء کے اواخر میں پنجاب پبلک سروس کمیشن سے براہ راست بطور پروفیسران کا انتخاب عمل میں آیا اور ان کا صدر شعبہ گورنمنٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) میں تقرر ہوا۔ سات برس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور چیئرمین شعبہ اردو تعینات ہوئے۔ جی سی (یو) میں فروری ۱۹۸۱ء سے اپنی ریٹائرمنٹ نومبر ۲۰۰۲ء تک مسلسل بائیس سال تک پروفیسر اور شعبہ اردو اور پنجابی کے صدر کے طور پر کام کرتے رہے۔ شعبے سے ''تحقیق نامہ'' کے نام ایک ریسرچ جرنل بھی جاری کیا۔ اس ریسرچ جرنل کی بیرون ملک کی جامعات میں بڑی قدر افزائی بھی ہوئی۔ کالج کی ایک سو پچیس ویں (۱۲۵) سالگرہ کے موقع پر شعبہ اردو کے اساتذہ اور متعلمین کی سترہ (۱۷) کتابیں شائع ہوئیں۔ بی اے کی کلاسز ہو رہی تھیں۔ انھوں نے ایم۔اے اردو، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی کلاسز کا اجراء کیا اور انھیں بڑی کامیابی کے ساتھ چلایا۔ گریڈ ۲۱ میں ترقی دے کر انھیں صوبہ پنجاب کے سیکرٹری تعلیم کا منصب سنبھالنے کی دعوت دی گئی تو انھوں نے درس وتدریس میں ہی رہنا اپنے لیے زیادہ مناسب سمجھا۔ بحیثیت پروفیسر ۲۱ویں گریڈ میں ریٹائرمنٹ لی۔ ان کا پہلا قابل ذکر مضمون ۱۹۵۹ء میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق پر تھا اور ان کی پہلی کتب تالیف بھی بابائے اردو کے بارے میں ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی۔ قیام فیصل آباد کے وقت ڈاکٹر ریاض احمد ریاض، ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر انور محمود خالد سے گہری دوستی ہوئی۔ ان کو ہائر ریسرچ ڈگریوں کا کبھی خیال نہ آتا اور نہ اس کا موقع ملتا۔

لاہور کے علمی وادبی حلقوں میں اہم مقام حاصل رہا۔ ریڈیو ٹیلی ویژن کے متعدد پروگراموں میں ان کی شرکت لازمی تصور کی جاتی۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے در و دیوار ان کی خدمات کے گواہ ہیں۔ مرزا اسداللہ خان غالب فکروفن پر ان کا تحقیقی کام محققین کے لیے مینار نور ہے۔ انھوں نے نصابی کتب کی ترتیب وتدوین میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا۔ بنیادی طور پر ان کا تعلق فیصل آباد سے تھا۔ فیصل آباد کی علمی وادبی سرگرمیوں کو سپردقلم کرنے کے لیے انھوں نے کئی چھوٹی بڑی کتب ترتیب دیں۔

پاکستان ٹیلی ویژن کے مایہ ناز پروڈیوسر شوکت زین العابدین کی وساطت سے ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام ''جہاں نما'' میں میری مسلسل چھ بار کامیابیوں پر انھوں نے مجھے خصوصی مبارک باد دی۔ ان دنوں ان کی اردو اعلیٰ کی کتاب بی اے کے طالب علموں میں بہت مقبول تھی۔ ان کی شخصیت میں بلا کا ٹھہراؤ، متانت اور دھیما پن موجود تھا۔ ان کے حسن اخلاق کی وجہ سے دوستوں میں ان کا تذکرہ ہمیشہ جاری وساری رہتا۔

کتب بابائے اُردو: احوال وافکار (۱۹۶۴ء)

نقدِ عبدالحق (۱۹۶۸ء)۔ اشاریۂ غالب (۱۹۶۹ء)

قائداعظم اور لائل پور (۱۹۷۲ء)

غالب اور انقلابِ ستاون (۱۹۷۴ء)

جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ (۱۹۷۷ء)

غالب کا علمی سرمایہ (۱۹۸۹ء)

یونی ورسٹیوں میں اُردو تحقیق (۱۹۸۹ء) نقوشِ غالب (۱۹۹۵ء)

بابائے اُردو: خدمات اور فرمودات (۱۹۹۶ء) دیوانِ غالب نسخۂ خواجہ (۱۹۹۸ء)

تحقیق نامۂ غالب (۱۹۹۸ء) یادگارِ عبدالحق (۲۰۰۲ء)

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے غالب پر بہت زیادہ کام کیا ہے۔ ان کا مخصوص موضوع اور میدان غالب ہی رہا انھوں نے اور موضوعات پر بھی لکھا لیکن غالب پر کوئی چالیس برس تک کام کرتے ہوئے زندگی گزاری۔ وہ ۱۵ اگست ۲۰۰۵ء لاہور میں انتقال کر گئے اور میانی صاحب میں تدفین ہوئی۔ ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

جامعات میں اقبال کا تحقیقی اور تنقید ی مطالعہ۔ایک جائزہ

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت ۱۹۷۷ء، صفحات: ۴۶۸، قیمت: ۴۶ روپے

اقبالیات کا مطالعہ

ناشر: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: ۱۹۷۷ء، قیمت: ۴۹ روپے، صفحات ۳۶۴

OOO

مقبول انور داؤدی

(جنوری ۱۹۰۷ء۔۱۹/اکتوبر ۱۹۹۱ء)

''مطالبِ اقبال'' ایک ایسے عاشق اقبال کی تصنیف ہے جس نے اقبال کے ہزاروں قارئین کی مشکلات کو شبانہ روز محنت سے آسان بنا دیا ہے۔ اس عاشق اقبال کا نام مقبول انور داؤدی ہے۔ مقبول انور داؤدی شہر اقبال (بڈیانہ) میں جنوری ۱۹۰۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد الدین تھا۔ بچپن ہی میں والدین کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ پھر نامساعد حالات میں مزید آگے نہ پڑھ سکے مگر لائبریری سے بہت استفادہ کرتے رہے۔ وہ امرتسر چلے گئے جہاں منشی مولا بخش کشتہ کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیے۔ ان سے بہت کچھ سیکھا۔ امرتسر سے ہی ایک ادبی پرچہ ''چمن'' بھی جاری کیا۔ مختلف اخبارات میں بھی کام کرتے رہے۔ ایک فلمی ہفت روزہ ''اداکار'' بھی جاری کیا جو قیام پاکستان تک جاری رہا۔ امرتسر میں ''شمس المشائخ'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ فیروز سنز کے ڈاکٹر اے وحید کی دعوت پر مقبول انور داؤدی فیروز سنز سے وابستہ ہو گئے۔ بچوں کے لیے میگزین ''تعلیم و تربیت'' کا آغاز کیا۔ وہ اس کے پہلے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے قیام سے پہلے ان کی مرتب کردہ کتب کئی تعلیمی اداروں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ حضرت علامہ اقبال سے انھیں عقیدت کی حد تک عشق تھا۔ اسی عشق کا نتیجہ ہے کہ مقبول انور داؤدی نے ''مطالب اقبال'' ایسی فرہنگ تیار کی جس میں اقبال کی اردو اور فارسی کتابوں کے الفاظ کے معانی اور ان لفظوں کی تشریح و تفہیم لکھ کر ہزاروں قارئین اقبال پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

معروف کتب میں ''قائداعظم''، ''اقبال''، ''مطالبِ اقبال'' اور بچوں کے لیے بہت سی

کتب تصنیف کیں۔ مقبول انور داؤدی ۱۹؍اکتوبر ۱۹۹۱ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

کلامِ اقبال میں بعض ایسی تلمیحات ہیں کہ قاری ان کو سمجھنے کے لیے مختلف لغات کا سہارا لیتا مگر اس کی تشفی نہ ہو پاتی۔ مقبول انور داؤدی کی اس کتاب "مطالب اقبال" نے قاری کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ "مطالبِ اقبال" میں بعض قرآنی تلمیحات کو بھی بڑے سلیقے سے کتاب میں شامل کر کے ان کی تشریح و تفہیم بھی کر دی۔ کلامِ اقبال ایک بحرِ بے کراں ہے جس کے معنی بھی اپنے کنارے نہیں رکھتے۔ حروفِ تہجی کے اعتبار سے کلامِ اقبال کے مشکل الفاظ، تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور اہم شخصیات کا تعارف ایک ہی کتاب میں جمع کرنا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ ایسی کتابیں کلامِ اقبال سمجھنے میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ان کی نہایت عمدہ کتاب "مطالب اقبال" کا حوالہ درج ہے۔

مطالبِ اقبال

پبلشرز: فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور، اشاعت ۱۹۸۴ء، صفحات: ۲۶۸ (بڑا سائز)، قیمت ۱۵۰ روپے

○○○

ملک حسن اختر، ڈاکٹر

(یکم جولائی ۱۹۳۸ء۔۲۳ جنوری ۱۹۹۳ء)

اُردو کے ممتاز محقق، نقاد، استاد، ماہر اقبالیات تھے۔ڈاکٹر ملک حسن اختر یکم جولائی ۱۹۳۸ء نوشہرہ خواجگان، گجرات ملک کرم حسین کے ہاں پیدا ہوئے۔جامعہ پنجاب لاہور سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ۱۹۷۹ء میں حاصل کی۔ڈاکٹر ملک حسن اختر مرے کالج سیالکوٹ اور گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں اردو کے استاد رہے ہیں۔معروف کتب میں ''دائرۂ معارفِ اقبال''،''اطرافِ اقبال''،''اقبال اور نئی نسل''،''اقبال ایک تحقیقی مطالعہ''،''اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک'' شامل ہیں۔میری ان سے تین ملاقاتیں یادگار ہیں۔میرے ایم فل کے ٹیوٹر رہے۔نہایت نفیس انسان تھے۔ان کے سمجھانے کا انداز نہایت مشفقانہ ہوتا۔اقبال کی تفہیم میں ان کی کوششوں کو بہت سراہا گیا۔

ملک حسن اختر کی علمی قدر و منزلت کا اندازہ ان مضامین سے لگایا جا سکتا ہے، جن میں انھوں نے فکر اقبال کے وہ حوالے شامل کیے ہیں، جو نوجوانوں کے لیے پیغام انقلاب ہیں۔عصرِ حاضر کے نوجوان ان کی کتاب ''اقبال اور نئی نسل'' سے نہ صرف فکر اقبال کے ہیرے جوہرات تلاش کر سکتے ہیں بل کہ اپنی زندگی کو بامقصد بنانے کے تجربات بھی کشید کر سکتے ہیں۔یہ کتاب صرف نئی نسل کے جذبات کی آئینہ دار ہی نہیں ہے بل کہ فکر اقبال کے کئی گہرے نقوش رکھتی ہے۔

ڈاکٹر ملک حسن اختر نے اپنی کتاب ''اقبال اور مسلم مفکّرین'' میں تمام مسلم مفکّرین کی صوفیانہ زندگی اور افکار کا گہرا مطالعہ کر کے عام مسلمانوں تک منتقل کرنے کی بھرپور جدوجہد کی۔انھوں نے اپنے افکار میں فکر اسلامی سے بہت استفادہ کیا ہے۔ان کی تعلیمات پر صوفیانہ رنگ اقبال کے صوفی ہونے کا آئینہ دار ہے۔انھوں نے صوفیائے کرام کی تعلیمات کو اپنے لیے رہبر تصور کیا اور مسلمانوں کو

ان کے راستے پر چلنے کی تلقین کی۔

ماہر تعلیم اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر ملک حسن اختر نے علامہ اقبال کے افکار کے اس رنگ کو اپنی کتاب ''اقبال اور مسلم مفکّرین'' میں نمایاں کیا ہے۔ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں علامہ اقبال پر ایک مسلم مفکّر کے اثرات کا جائزہ موجود ہے۔ کتاب کا آغاز ''اقبال اور امام ابوحنیفہؒ'' سے ہوتا ہے جب کہ اختتامی باب کا عنوان ''اقبال اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ'' ہے۔

کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر باب کے آخر میں مصنّف نے حوالہ جات درج کیے ہیں۔ اول ماخذ، ثانوی ماخذ، رسائل و جرائد اور تعلیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب پی ایچ ڈی سطح کا تحقیقی مقالہ ہے۔ اقبالیاتی اور اسلامی تحقیق کرنے والے سکالرز کے لیے بہت اہم ہے۔ اقبال کو مغرب زدہ فلسفیوں اور مفکّرین کے افکار سے منسوب کرنے والے کم فہم حضرات کے لیے یہ کتاب آئینہ ہے، جس میں وہ اقبال کو بحیثیت عملی مسلمان کے طور پر دیکھ اور پرکھ سکتے ہیں۔ فارسی اور اُردو اشعار کے حوالہ جات سند کے طور پر شامل کتاب ہیں۔ ''اطراف اقبال'' علامہ اقبال کے فکر اور شخصیت کے مختلف اطراف کا احاطہ کرتی ہے۔ ملک حسن اختر کا انداز بیان اتنا سادہ اور جاذب ہے کہ کتاب پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اسے تفصیل سے پڑھنے کو دل مچل اٹھتا ہے ''اطراف اقبال'' یقیناً ایسا ہی عطر ہے جس کی خوش بو ہی اس کی پہچان ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر ملک حسن اختر ۲۳ جنوری ۱۹۹۳ء کو لاہور سے دائی ملک عدم ہوئے اور انھیں کریم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال ایک تحقیقی مطالعہ

ناشر: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت ۱۹۹۶ء صفحات ۲۱۰، قیمت: ۱۰۰ روپے

اقبال اور نئی نسل

پبشرز: نذیر سنز پبشرز، لاہور، اشاعت ۱۹۸۸ء، صفحات ۱۱۲، قیمت ۲۵ روپے

اقبال اور مسلم مفکرین

پبشرز: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور، اشاعت: ۱۹۹۲ء، صفحات ۲۵۹، قیمت ۱۳۰ روپے

اطرافِ اقبال

ناشر: بزمِ اقبال، لاہور، اشاعت: طبع ثانی ۱۹۹۲ء، صفحات ۳۹۲، قیمت: ۱۲۵ روپے

منظور حسین، خواجہ

(۲۱ مئی ۱۹۰۴ء۔۲۰ راگست ۱۹۸۶ء)

خواجہ منظور حسین ۲۱ مئی ۱۹۰۴ء کو دہلی میں خواجہ سید محمود حسین کے ہاں پیدا ہوئے۔ خواجہ منظور حسین نے ماہرِ تعلیم، ادیب، محقق، نقاد کی حیثیت شہرت پائی۔ خواجہ منظور حسین انگریزی زبان و ادب کے استاد تھے۔ خواجہ منظور حسین مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ شعبہ انگریزی کے صدر تعینات رہے۔ انھوں نے ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۸ء تک خدمات انجام دیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں اردو اور انگریزی شعبہ کے صدر مقرر ہوئے اور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۴ء تک خدمات دیں۔ پھر اسی کالج میں انھیں ترقی دے کر پرنسپل مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۵۹ء پھر ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۵ء تک خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد انھیں سیکرٹری پاکستان انٹر یونی ورسٹی بورڈ مقرر کیا گیا۔ یہاں انھوں نے دس سال ۱۹۵۹ء سے لے کر ۱۹۶۹ء تک خدمات انجام دیں۔ ان کی معروف کتب میں ''اردو شاعری میں جدوجہدِ آزادی بطور موضوعِ سخن''، ''اقبال اور بعض دوسرے شاعر''، ''اردو غزل کا خارجی روپ بہروپ'' شامل ہیں۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی انفرادیت کو پرکھنے کے لیے دیگر شعراء کرام، مفکرین اور دانش وروں کا تقابلی مطالعہ بھی بہت ضروری ہے۔ منظور احمد نے اس ضمن میں بہت محنت کی ہے۔ خصوصی طور پر فارسی شعراء کرام کا اقبال سے موازنہ وسعت مطالعہ کا آئینہ دار ہے۔ کتاب کی زبان سلیس نہیں ہے۔ فارسیت کی وجہ سے قاری کو یقیناً دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ٹائپ رائٹنگ نے بھی تحریر کے بوجھل پن میں اضافہ کیا ہے۔ تعلیقات کی باریکی بھی مشکل مرحلہ ہے۔ کتاب کی ایک انفرادیت اقبال کے لفظوں کا دوسرے کئی شعراء کے لفظوں وتراکیب سے موازنہ ہے۔ خواجہ منظور حسین ۲۰ راگست ۱۹۸۶ء کو لاہور میں داعی ملک عدم ہوئے۔

اقبال اور بعض دوسرے شاعر

پبلشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، اشاعت دسمبر ۱۹۷۷ء، صفحات ۵۶۳، قیمت ۳۰۰ روپے

منور مرزا، پروفیسر

(۲۷ مارچ ۱۹۲۳ء۔ ۷ فروری ۲۰۰۰ء)

سرگودھا کی مردم خیز مٹی کو یہ شرف حاصل ہے کہ پروفیسر منور مرزا یہاں پروان چڑھے۔ وہ ۲۷ مارچ ۱۹۲۳ء کو بھیرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرزا ہاشم الدین (پیدائش مئی ۱۸۹۶ اوفات ۲۵ / اپریل ۱۹۷۵ء جمعتہ المبارک) ایک استاد تھے اور علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے۔ وہ ''نثار'' تخلص لکھا کرتے تھے۔ پروفیسر منور مرزا کی والدہ محترمہ کرم بی بی (وفات ۱۱۔ مارچ ۱۹۸۵ء بروز پیر) نہایت نیک سیرت خاتون تھیں۔ پرائمری تعلیم بھیرہ میں ہی حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا سے میٹرک پاس کیا۔۔۔ زلف روزگار سنوارنے کے لیے پنجاب اسمبلی، محکمہ انہار، محکمہ ریلوے میں خدمات انجام دیتے رہے۔ انھوں نے تین مضامین میں ایم اے کیا۔ ۱۹۵۲ء میں اُردو ۱۹۵۳ء میں عربی اور ۱۹۶۷ء میں فلسفہ میں ایم اے کر کے ایم اے کی ہٹرک مکمل کی۔ ۱۹۵۸ سے ۱۹۶۱ء تک گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں بطور لیکچرار اردو پڑھاتے رہے۔ ۱۹۶۱ء سے ۱۹۸۰ء تک گورنمنٹ کالج لاہور اور اورینٹل کالج میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۵ء تک اورینٹل کالج میں اقبال چیئر کے چیئرمین اور بعد ازاں اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر رہے۔ ۱۹۸۳ء۔ ۱۹۸۵ء پارٹ ٹائم۔ ۱۹۸۵ء۔ ۱۹۸۸ء فل ٹائم اور پھر ۱۹۹۱ء۔ ۱۹۹۳ء اقبال اکیڈمی میں تصنیف و تالیف کے لیے پروفیسر منور مرزا نے تاریخ ساز کام کیا۔ کلام اقبال تحت اللفظ کے ساتھ ریکارڈ کروانے کا سہرا مرزا صاحب کے سر ہے۔۔۔ اقبال اکیڈمی میں سیاسی اتار چڑھاؤ کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں لیکن مرزا صاحب کا حصہ کسی نہ کسی طور ضرور شامل رہا۔ فکرِ اقبال کے حوالہ سے وہ ایک سند مانے جاتے

تھے۔ عربی، اردو، فارسی، انگریزی، پنجابی اور ہندی زبان پر دسترس رکھتے تھے۔ وہ ایک ہی وقت میں اردو، انگریزی، عربی، پنجابی اور فارسی میں مقالات لکھتے رہے اور فنی خطابت سے سامعین کے دل جیتے رہے۔ انھوں نے ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن کے بہت سے مذاکروں میں حصہ لیا۔

شاہین صفت پروفیسر محمد منور مرزا ۷ار فروری ۲۰۰۰ءکو ہم سے بچھڑے اور اقبالیاتی ادب کو ویران کر گئے۔ موسم بہار میں شعبۂ تعلیم اور علم وادب کے سدابہار اور منور ماہر اقبالیات خزاں کی گود میں چلے گئے۔ پروفیسر محمد منور مرزا ہمہ صفت شخصیت تھے۔ وہ تروتازہ بہار کی طرح ہر ایک کے شفیق، مربی اور محبّ تھے۔ پروفیسر صاحب تن تنہا ذات نہیں، ایک مسلسل اور سیل رواں کی طرح علمی وادبی تحریک تھے۔

ان کی کتب کے نام یہ ہیں۔ تراجم (عربی) ادیب' ۱۹۵۹ء۔ الفتنہ الکبریٰ ۱۹۵۹ء، الاخبار الطوال، (فارسی ۱۹۶۴ء) سیاست نامہ نظام الملک طوسی ۱۹۶۰ء، (انگریزی) تین مسلمان فیلسوف' ۱۹۶۹ء میزان اقبال ۱۹۷۳ء، ایقان اقبال ۱۹۷۷ء، علامہ اقبال کی فارسی غزل ۱۹۷۷ء، انتخاب دیوان آتش ۱۹۷۷ء، اولاد آدم ۱۹۷۳ء (مزاحیہ مضامین)، ہندو ذہنیت ۱۹۹۷ء، برہان اقبال ۱۹۸۲ء، قرطاس اقبال ۱۹۹۸ء، تحریکِ پاکستان ۱۹۹۲ء (انگریزی)، اقبال اور قرآن (انگریزی) اقبال اور روحانی ارتقاء، (انگریزی) اور غبارِ تمنا ۱۹۷۳ء (شعری مجموعہ) دیوار برہمن (تحریکِ پاکستان) ۱۹۹۲ء، مشاہدۂ حق کی گفت گو ۱۹۹۲ء (دوسیاسی ادوار کا تجزیہ)۔ یہ کتب علم وادب کا گراں بہا سرمایہ ہیں۔۔۔۔ ان کتابوں کے علاوہ کئی کتابچے بھی شائع ہوئے جن میں ''اقبال بحضور آدم، علامہ اقبال اصول حرکت، دیوار برلن، اور دیوار برہمن، بابری مسجد، اگر پاکستان نہ بنتا' دفاع پاکستان اور ہندو مسلم مفاہمت، تحریکِ پاکستان اور خالصہ سیاست، بندے ماترم کا شاخسانہ، ہندو معاشرے میں اچھوتوں کا حال زار، نظریۂ پاکستان کا ارتقاء'' وہ جن کتابوں پر کام کرنے کے خواہش مند تھے ان کے نام یہ ہیں۔ ''تجزیے اور جائزے، (تنقیدی اور ادبی مضامین) کرم فرما (احباب کی شخصیات) حفیظ جالندھری فن اور شخصیت، حمید نظامی، انتخاب کلام بے دل، تاریخ اسلام اور معاشرتی احوال پر مبنی مضامین' غالب کی فارسی غزل۔ علاوہ ازیں کئی ایک انگریزی کتب پر کام شروع کر چکے تھے۔ اُن کی چھ انگریزی کتب مغربی دنیا میں بڑی دل چسپی سے پڑھی جاتی ہیں۔ پاکستان اور پاکستان سے باہر انھوں نے بہت سے موضوعات پر تاریخ ساز لیکچر دیے۔ قومی اور عالمی سطح کے کئی بڑے سیمیناروں میں انھوں نے اپنی علمی قابلیت کے

جھنڈے گاڑے۔ انھیں قائدِ اعظمؒ اور علامہ اقبال سے سچا عشق تھا۔ پاکستان اور پاکستان سے باہر وہ مفسرِ اقبال کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے تھے۔ پاکستان کے کونے کونے میں فکرِ اقبال کی روشنی ان کی وجہ سے پہنچی۔

برعظیم پاک و ہند کی متعدد یونی ورسٹیوں میں منور مرزا کی اقبال شناسی کے بارے میں ایم اے اور ایم فل کی سطح کے کئی ایک مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ ایک رسمی گفت گو میں انھوں نے مجھے بتایا کہ سرگودھا میں پہلا یومِ اقبال ۱۹۴۰ء میں منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر منور مرزا نے بھی تقریر کی۔ گویا انھیں زمانۂ طالبِ علمی سے ہی اقبالیات سے گہرا لگاؤ تھا۔ پاکستان بھر کے اقبال شناس ان سے استفادہ کرتے تھے۔ اقبالیاتی طالبِ علموں کی رہنمائی کے لیے ان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے۔ راقم الحروف نے ایم فل اقبالیات کے سلسلہ میں ان سے جب بھی رابطہ کیا۔ انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے میری رہنمائی فرمائی۔ میری دو تین کتب پر تبصرہ فرما کر انھوں نے میری عزیز پروری کی۔ اقبالیاتی خدمات کے اعتراف میں انھیں حسن کارکردگی کے کئی ایک اعزازات سے نوازا گیا۔ وہ ستارۂ امتیاز، اور قومی صدارتی اقبال ایوارڈ کے حامل تھے۔

وہ پاکستانی دانش ور تھے۔ نظریۂ پاکستان، تحریکِ پاکستان، استحکامِ پاکستان، اور تعمیرِ پاکستان ایسے موضوعات پر اُن کا خطاب سننے کے لیے لوگ بے چین رہتے۔ وہ مختصر سے مختصر، اور طویل سے طویل خطاب کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج سرگودھا میں تین چار مرتبہ انھیں مدعو کیا گیا۔ اپنے صدارتی خطبات میں انھوں نے علم و آگہی کے دریا بہا دیے۔ لوگ ان کا خطاب محفوظ رکھنے کے لیے ٹیپ ریکارڈر اپنے ہمراہ لاتے، جو آج مرزا منور کی یاد تازہ کرنے کے لیے نہایت اہم ہیں۔

منور مرزا بہترین مضمون نگار تھے۔ متذکرہ عنوانات پر ان کے سیر حاصل مضامین ہر پاکستانی کے لیے رہنمائی کا باعث ہیں۔ ملکی و غیر ملکی جرائد میں ان کے فکر انگیز مضامین بہت پسند کیے گئے۔ ان کے عالمانہ فاضلانہ اور مفکرانہ مضامین سے ایوانوں اور مکانوں میں وطن سے محبت کے جذبات خوب ابھرے۔ وہ پکے مسلمان اور سچے پاکستانی تھے۔ وہ طبیعت کے بہت کھرے، تحریر و تقریر میں ان کی حق گوئی اور بے باکی کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے ہمیشہ کلمۂ حق بلند کیا۔ ان کا قلم مسلسل جہاد میں رہا۔۔۔ ہندو ذہنیت کو بے نقاب کرنے کے لیے ان کے سیکڑوں مضامین اور

سیکڑوں ہی لیکچر محفوظ ہیں۔ وہ اہل وطن کو ایک قوم بنانے کے لیے برسرِ عمل رہے۔ موضوع خواہ کوئی بھی ہوتا، قرآن وسنت اور پاکستانیت ہر موضوع کا حل نکالنے کا سلیقہ کوئی پروفیسر صاحب سے ہی سیکھ سکتا ہے۔ حق گوئی اور بے باکی کے سلسلے میں پروفیسر منور مرزا، جسٹس ایم آر کیانی، مولانا ظفر علی خان اور حمید نظامی کے ہراول دستہ میں شامل تھے۔ وہ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے اور لکھنے کی جرات رکھتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں منعقدہ ایک اجلاس میں کئی ترقی پسندوں نے اقبال کو اشتراکی شاعر ثابت کرنے کے لیے ایک اجلاس کا اہتمام کیا جس میں ذوالفقار علی بھٹو خود بھی شریک تھے۔ اجلاس کے آغاز پر منور مرزا نے مائیک اٹھالیا اور کہا کہ پہلے یہ فیصلہ کرلیں کہ اقبال اسلامی فکرو فلسفہ کے شاعر تھے اور کسی مالی مفاد کی خاطر انھیں اشتراکی شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ ملک کے وزیر اعظم کے سامنے اس قسم کی جرأت اقبال کا شاہین ہی کر سکتا ہے۔

راقم الحروف نے سرگودھا کے بزرگ شاعر و ادیب مولانا اخگر سرحدی کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں احمد ندیم قاسمی، قمر اجنالوی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر منور مرزا، اخگر سرحدی، میر عبدالرشید اشک، اور علامہ رشک ترابی ایسے شعراء وادباء موجود تھے۔ اس بزم میں سید عبداللہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ۔۔ ''پروفیسر منور مرزا سرگودھوی ہوتے ہوئے مرکز اقبال لاہور پر اپنے علم وفضل سے حکمرانی کر رہا ہے۔'' ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی طرح اعلیٰ پایہ کے دانش وروں نے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ وہ نظریۂ پاکستان کی تکمیل کے خواہاں تھے۔ سرکاری ملازمت کے باوجود وہ نظریۂ پاکستان سے متصادم قوتوں کے لیے شعلہ نوا رہتے۔

پروفیسر منور مرزا ظاہر کی بجائے باطن کے انسان تھے۔ وہ روحانیت کے علم بردار تھے۔ مادیت سے ساری عمر بالاتر رہے ان کے دل کے کمپیوٹر میں باطنی پاکیزگی تھی۔ سیرت النبی ﷺ کے سلسلہ کی متعدد کانفرنسوں میں آپ نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ ضیاء الحق کے دور میں انھوں نے اسلامی فکر و فلسفہ کی ترویج کے لیے دن رات کام کیا۔ اختلاف رائے میں وہ ضیاء الحق کو بھی معاف نہیں کیا کرتے تھے۔ سردار عبدالقیوم (اس وقت کے صدر آزاد کشمیر) کی گردن زنی لفظوں میں اس انداز سے کرتے ہیں کہ صدر آزاد کشمیر کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا اور وہ اقتدار کے غرور سے واپس اصلی حالت میں آ جاتے۔ انھیں تحریک پاکستان کے صف اول کے کارکنوں سے ملنے، کام کرنے اور ان کے بارے میں خطاب کا بھرپور موقع ملا۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ انھوں نے اپنی ۷۷ سالہ زندگی میں جہدِ مسلسل کی

اَن مول مثالیں ہمارے لیے مشعل راہ چھوڑی ہیں۔

ادب سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر احباب ان کی نثر سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن نثر کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری بھی کم نہیں ہے۔ ''غبارِ تمنا'' ان کا شعری مجموعہ ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ حفیظ جالندھری نے ''غبارِ تمنا'' کے بارے میں لکھا ہے۔

''یہ مجموعہ کلام غزلوں، نظموں اور قطعوں میں سجے ہوئے اشعار، انتہائی جانچ پڑتال کے بعد بھی ان کو انمول جواہرات مان لینے کے سوا چارہ نہیں۔ ہر غزل خونِ جگر کی رنگا رنگی کا انوکھا مرقع، ہر نظم تاثرات دردوکرب کی دلاویز تصویر، ہر قطعہ فرش خاک سے انوار لولاک تک آئینہ ادارک''۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے یوں تبصرہ کیا:

> ''ان کے اشعار تجربے کی خوشبو سے معطر اور دل کی کیفیات سے مالا مال ہیں اور ان کے مطالعہ سے روح کے تاروں میں ارتعاش سا پیدا ہونے لگتا ہے''

سید عابد علی عابد نے ''غبارِ تمنا'' کے مقدمہ میں لکھا ہے:

> ''منور پر محبت میں حرماں کا شعور طاری نہیں ہوتا، اس کو عشق کے کوائف میں جو میسر آیا اسی کو حرزِ جاں بنایا اور اپنی بات ظاہر کرنے کے لیے الفاظ کے انتخاب میں نہایت احتیاط برتی۔''

پروفیسر مرزا منور کے چند اشعار نذر قارئین ہیں:

تمثال جلوہ عرض کرے حسن کب تلک
آئینہ خیال میں جھانکا کرے کوئی

ہم وہ تھے جن کو خندۂ گل نے جگا دیا
ہم وہ ہیں جو خروش سلاسل میں سو گئے

ویراں تھی ابھی اور ابھی آباد ہے خلوت
دیکھوں تو یہاں کوئی نہ آیا نہ گیا ہے

غم منزل سے ذرا تم بھی گزر کر دیکھو
سنگ رہ کچھ بھی نہیں بستر و بالیں کے سوا

نعمت اک اک ہے بے بہا لیکن
سب سے برتر خدا شناس نظر

رشک آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو
کہ ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو

ہم بھی آذر ہیں تراشے ہیں وہ پیکر ہم نے
جن کو ارباب نظر رقص کناں دیکھیں گے

اس طرح کے سیکڑوں اشعار منور مرزا کے پختہ شاعر ہونے کی دلیل ہیں۔غزل، نظم اور قطعات میں مقصدیت کا رنگ غالب ہے۔ان کی شاعری لب و رخسار، لالہ و گل، عشق و عاشقی کے بجائے عمل سے عبارت ہے۔۔۔وہ باعمل دانش ور تھے۔ان کے نزدیک مسلمان کا احترام اور انسان کی تکریم لازمی ہے۔وہ موجودہ دور کے مسلمانوں میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی خصوصیات دیکھنے کے متمنی رہے۔ان کی کئی تقاریر میں علماء کرام کا تذکرہ موجود ہے۔وہ علماء کرام اور اساتذہ کرام کو امت مسلمہ کی بے داری کا فریضہ سونپنے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔طویل علالت کے باوجود وہ ہر ملاقاتی سے اسلام اور پاکستان کے بارے میں بات کرتے۔۔۔گزشتہ سال رمضان المبارک میں ان سے میری آخری ملاقات ہوئی۔صحت جواب دے چکی تھی اور اس کے باوجود ان کے لبوں پر ایک ہی بات تھی کہ اللہ پاک پاکستان اور اہل پاکستان کو اپنی امان میں رکھے۔۔۔

لفظوں، جذبوں اور سوچوں کے ایسے امین کبھی نہیں مرتے۔پروفیسر محمد منور مرزا نا قابل فراموش استاد تھے۔انھوں نے اپنا فرض، قرض سمجھ کر ادا کیا۔آج کے استاد کے لیے وہ قابل مثال ہیں کہ کیا ہم پروفیسر مرزا کی طرح اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔کمرہ جماعت کے علاوہ طالب علم کے تزکیۂ نفس کے لیے اساتذہ کیا خدمات انجام دے ہیں۔استاد قوم کی تقدیر بدل سکتا ہے۔اس کے لیے منور مرزا جیسا جذبہ درکار ہے۔۔۔پروفیسر محمد مظفر مرزا (۱۸ اپریل ۱۹۴۳ء۔۸ دسمبر ۲۰۱۲ء) بھی اقبالیات کے فروغ کے جدوجہد کرتے رہے بزم اقبال لاہور میں بطور انچارج انھوں نے سرگرمی سے حصہ لیا ریڈیو، ٹی وی کے پروگراموں میں بھی پاکستانیت اور اقبالیات پر لیکچر دیا کرتے تھے۔ان کے انتقال سے محکمہ تعلیم، بزمِ اقبال اور نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کو بہت نقصان پہنچا۔سرگودھا میں محمد منیر مرزا ایڈووکیٹ

ان کے مشن کو کس طرح آگے بڑھائیں گے؟ سوچنے کی بات ہے۔۔۔ان کے ایک بھانجے ملک محمد معظم توصیف روزنامہ ''وفاق'' سرگودھا کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر کے بعد روزنامہ ''تجارت'' میں بحیثیت ریذیڈنٹ ایڈیٹر صحافتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔اہلِ سرگودھا کو پروفیسر منور مرزا کی خدمات پر فخر ہے۔انھوں نے ماہر اقبالیات کی حیثیت سے جو خدمات انجام دیں زمانہ انھیں یاد رکھے گا۔
اللہ پاک مرحوم کے درجات بلند کرے اور اپنی رحمت کا سائبان عطا کرے۔۔۔(آمین)
ان کی مشہور زمانہ اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج کیا جا رہا ہے۔

میزانِ اقبالؒ

پبلشرز: اقبال اکادمی لاہور، اشاعت: اول ۱۹۷۲ء، دوم ۱۹۸۶ء، طبع پنجم ۲۰۱۲ء، صفحات ۲۳۱، قیمت ۲۵۰ روپے

بُرہانِ اقبال

ناشر اقبال اکادمی پاکستان لاہور، اشاعت: طبع پنجم ۲۰۰۵ء، صفحات: ۲۲۰، قیمت: ۲۵۰ روپے

ایقانِ اقبال

ناشر: اقبال اکادمی لاہور، طبع دوم مارچ ۱۹۸۴ء، طبع سوم ۱۹۸۸ء، صفحات: ۲۴۶، قیمت ۶۰ روپے

قرطاسِ اقبال

ناشر: سہیل عمر، اقبال اکادمی پاکستان، طبع اول ۱۹۹۸ء طبع دوم: ۲۰۰۳ء، صفحات ۳۲۸، قیمت ۲۰۰ روپے

ooo

میر عبدالصمد خان

(۱۹۱۶ء۔۲۶ ستمبر ۱۹۸۳ء)

میر عبدالصمد خان ۱۹۱۶ء کو گاؤں شیخاں ضلع کوہاٹ شہباز خان کے ہاں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک پختون خاندان سے تھا۔ میر عبدالصمد خان اردو اور پشتو کے ممتاز ادیب، محقق، نقاد، مترجم اور صحافی تھے۔ انھوں نے مذکورہ حیثیتوں میں بے پناہ شہرت پائی۔ محکمہ اطلاعات کے ہفت روزہ ''استقلال'' کے مدیر بھی رہے۔ اس کے علاوہ کوہاٹ سے نکلنے والے رسالہ ''کاروانِ سرحد'' کے بھی مدیر رہے۔ ان دونوں رسائل کی وجہ سے ان کو خاصی شہرت نصیب ہوئی۔

میر عبدالصمد خان ایک پڑھے لکھے صحافی تھے۔ انھوں نے پی ایچ ڈی کی اعلیٰ ڈگری حاصل کر رکھی تھی۔ انھوں نے ''خوشحال اور اقبال'' کے عنوان پر پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھا، جسے بعد میں انھوں نے کتابی صورت دی۔ خوشحال خان خٹک (1613-1689) پشتو کے عظیم شاعر تھے۔ انھوں نے شاعری کے ذریعے حکمت و دانائی اور علم و دانش کے پھول بکھیرے، جن کی مہک آج تک فضا کو معطر کیے ہوئے ہے۔ جب ہم خوشحال خان خٹک کے افکار کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ایک حیران کُن بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ علامہ اقبال اور خوشحال خان خٹک میں فکری ہم آہنگی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اگر چہ علامہ اقبال اور خوشحال خان خٹک کے درمیان دو سو سال کا طویل وقتی فاصلہ ہے، اس کے باوجود ان دونوں شعراء کے درمیان متعدد اقدار مشترک نظر آتی ہیں۔ میر عبدالصمد خان نے ان عظیم شعراء کی اس فکری مماثلت کی نشاندہی کی ہے۔

ان کی دیگر کتابوں میں ''شاعر انسانیت: رحمان بابا''، ''فلسفہ آب و گل''، ''تعلیماتِ خوشحال''،

''تعلیماتِ رحمان''، ''لوئے پختون'' شامل ہیں۔ ان کتب کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا پر اچھا خاصا تحقیقی وتنقیدی کام کر رکھا ہے۔

کتاب کا مطالعہ ہمیں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کر دیتا ہے کیوں کہ ہمیں خوشحال وا قبال کے افکار میں بہت سی خصوصیات مشترک نظر آتی ہیں جنھیں مصنف نے نہایت دلنشیں انداز میں دونوں کے اشعار ساتھ واضح کیا ہے۔ مثلاً علامہ نے نوجوانوں میں خودی کی نئی روح پیدا کرنے کے لیے عقاب اور شاہین کی علامات استعمال کی ہیں۔ خوشحال خان خٹک نے بھی اپنے کلام میں یہی علامات استعمال کی ہیں جس کی تفصیل ہمیں اس کتاب کے مضمون ''بازنامہ'' میں ملتی ہیں۔

علامہ اقبال نے اپنے افکار میں خودی کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے جب کہ خوشحال خان خٹک نے ایک مردِ مومن میں جن صفات کو لازمی قرار دیا۔ ان کا مرکزی خیال بھی خودی ہی ہے اگرچہ انھوں نے یہ لفظ استعمال نہیں کیا۔ غرض ''خوشحال واقبال'' کا مطالعہ بہت سی معلومات میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

میر عبدالصمد خان ۲۶ ستمبر ۱۹۸۳ء کوہاٹ میں انتقال کر گئے۔ انھیں ان کے آبائی گاؤں شیخاں ضلع کوہاٹ میں دفن کیا گیا۔

ان کی اقبالیاتی کتاب کا تذکرہ درج ہے۔

خوشحال و اقبال

پبلشرز: عظیم پبلشنگ ہاؤس، پشاور، طبع اول ۱۹۶۰ء طبع دوم اپریل ۱۹۸۲ء، صفحات ۳۸۲، قیمت ۸۰ روپے

ooo

میرزا ادیب

(۱۹۱۴ء۔۱۹۹۹ء)

ہمہ جہت انسان، افسانہ نویس، ڈرامہ نویس، نقاد، تجزیہ نگار، صحافی، دانش ور، میرزا ادیب اسم با مسمیٰ ''ادیب'' تھے۔ اُردو ادب میں میرزا ادیب کئی حوالوں سے معروف ہیں۔ اُن کا اصلی نام دلاور علی تھا۔ میرزا ادیب ''لالۂ صحرائی'' تھے۔ اس لیے اُنھوں نے جہاں قدم رکھا، وہاں پھول اُگتے رہے اور اَدبی زمین ذرخیز سے ذرخیز تر ہوتی چلی گئی۔ وہ ۱۴ اپریل ۱۹۱۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے اُنھوں نے ۱۹۳۴ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ اَدبی زندگی کا آغاز ''ادبِ لطیف'' سے کیا۔

ادب لطیف میں شمولیت کے بعد انھوں نے اس کا معیار بلند کیا۔ خشک مضامین کو بھی پر لطف بنایا۔ معروف مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی نے اپنی زندگی کا پہلا مضمون میرزا ادیب کو ''ادبِ لطیف'' میں چھپنے کی غرض سے ارسال کیا تو میرزا ادیب نے اپنے میگزین کے معیار کو دیکھتے ہوئے اُن کا پہلا مضمون معذرت کے ساتھ واپس بھجوا دیا۔ مشتاق احمد یوسفی بتاتے ہیں کہ وہی مضمون میں نے بعد ازاں ''سویرا'' کو بھیجا، جس کے مدیر اُس وقت حنیف رامے تھے، انھوں نے میرا پہلا مضمون چھاپ کر مجھے ادبی دنیا میں متعارف کروایا۔ میرزا ادیب نے ''ادب لطیف'' کی ۱۹۴۱ء تک ادارت کی۔ لاہور کے علاوہ اُنھوں نے بمبئی میں بھی ایک ادبی جریدے کی ادارت کی۔ آل انڈیا ریڈیو میں اپنی خدمات کا آغاز ۱۹۴۴ء میں کیا۔ سرکاری ملازمت کے باوجود مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کرتے رہے۔ مسلم صحافت میں انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۲ء تک ''ادبِ لطیف'' کے مدیر رہے۔ ۱۹۶۳ء میں اُنھوں نے ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستگی اختیار

کرلی، اور ۱۹۷۶ء تک اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ بعدازاں اُنھوں نے ایک فلمی رسالہ ''مصور'' کی بھی ادارت کی۔

اُنھوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز اپنی کتاب '' صحرانورد کے خطوط'' سے کیا۔ اِس کتاب میں اُن کی طبیعت کا رومانس جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے اِسی طرح اُنھوں نے اپنی دوسری کتاب ''صحرانورد کے رومان'' کے نام سے لکھی اور پھر اُن کی تیسری کتاب ''صحرانورد کا نیا خط'' ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ انھوں نے ۱۰۳ کتابیں لکھیں۔ ناسازیِ طبیعت اور نامساعد حالات میں بھی اُنھوں نے اَدب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، اور متعدد کتابوں کی تخلیق اور اشاعت میں مصروف رہے۔ اُنھوں نے اُردو ادب کی بہت سی اصناف میں طبع آزمائی کی زیادہ تر اُنھوں نے افسانے، سفرنامے، ڈرامے، ناول، خاکے، تراجم، خودنوشت، سوانح حیات اور بچوں کے لیے کتابیں لکھیں۔ ۱۹۸۲ء میں انھیں انجمن ترقیِ اُردو کی جانب سے ۵۰ سالہ ادبی خدمات پر اعزازی شیلڈ سے نوازا گیا۔ اِسی طرح دعوت اکیڈمی کی طرف سے بھی اُنھیں بچوں کے لیے ادبی تخلیقات پر شیلڈ عطا کی گئی۔

وہ بڑوں کے علاوہ بچوں میں اس قدر مقبول تھے کہ بچے بچے کی زبان پر اُن کا نام ہوتا۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ جب وہ بچوں کے لیے لکھتے تو اپنے مینٹل لیول کو بچوں کی سطح پر لا کر لکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تحریر میں بچوں کی انگلی پکڑ کر انھیں ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ یہی وصف انھیں دیگر ہم عصر لکھاریوں سے ممتاز کرتا ہے۔ میرزا ادیب کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ اپنی کہانیوں ڈراموں میں معاشرتی مسائل اور ثقافتی رویوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کا اسلوب اس قدر رشتہ اور شگفتہ ہے کہ پڑھنے والا ضرور متاثر ہوتا۔ کردار نگاری میں میرزا ادیب کا انداز اور تجربہ بڑا منفرد ہے۔ انھوں نے کردار نگاری کو سنجیدگی سے نبھایا ہے۔ کرداروں پر گرفت رکھنا، مکالموں اور تاریخی حوالوں سے سکرپٹ کو مضبوط اور مربوط رکھنا ان کا فنی اُسلوب تھا۔

بچوں کے لیے لکھے گئے کھیل، بڑوں کے لیے بھی نہ صرف مفید ہوتے بل کہ بڑے بڑوں کو کئی نئے موضوعات اور فکری تقاضوں سے روشناس کرواتے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ میرزا ادیب کے ڈرامے ،کرکٹ، کھیل کی طرح مقبول ہوئے جو آخری بال اور آخری وکٹ تک شائقین کو متجسس رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں بہت سے اعزازات اور انعامات اُن کی زندگی میں اُن کا مقدر بنے اور اُن کے بعد بھی اُن کی تخلیقات کو سراہا گیا۔ اُن کی اصل شہرت کا باعث اُن کے ریڈیائی ڈرامے اور یک

بابی ڈرامے بنے۔ اُنھوں نے ڈراموں کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے دن رات کام کیا۔ اُنھوں نے بہت سوچ سمجھ کر ڈراموں کے موضوعات کا انتخاب کیا۔ اِس لیے فنی لحاظ سے اُن کے ڈرامے دیگر ڈرامہ نگاروں سے زیادہ معیاری اور مقبول ہیں۔ اُنھوں نے علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کی بعض نظموں کی دلکش تمثیلیں بھی لکھیں۔ اِن تمثیلوں میں اُن کی فنی پختگی اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ مادرِقوم، نندکمار، جمیلہ، کالا آدمی، آنسو اور ستارے، لہو اور قالین، شیشہ و سنگ، پس پردہ، اور فصیلِ شب اُن کے ڈراموں کے مشہور مجموعے ہیں۔ بعض ڈراموں میں اُنھوں نے تاریخی اور سیاسی واقعات پیش کیے ہیں، اور بعض ڈراموں میں روحانی واقعات کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ آج فلسطین آگ و خون کی لپیٹ میں ہے۔ الفتح تنظیم، حماس کے علاوہ دوسری جہادی تنظیمیں آزادی کی جنگ لڑ رہی ہیں۔ میرزا ادیب نے ''فاطمہ برناوی'' ڈرامہ میں فلسطین کی تحریک آزادی کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ اُن کی کردار نگاری، مربوط و مبسوط ہے۔ ایک اُستاد اور اُس کے بیٹے کے کرداروں سے اُنھوں نے ''فصیلِ شب'' کے اِس ڈرامے کو منفرد بنا دیا ہے۔ وہ معاشرے کے نباض تھے۔ معاشرتی رویّوں پر اُن کی گہری نظر تھی۔ اُن کی تحریریں انسان دوستی اور جذبہ حُب الوطنی کی آئینہ دار ہیں۔ وہ ترقی پسند ذہن رکھتے تھے لیکن اُسے بطور لابی استعمال نہیں کرتے تھے۔ وہ سب کے دوست تھے۔ اُن کی تحریروں میں بھی دوستی اور امن کا پیغام ملتا ہے فرہاد کو شیریں سے اتنی زیادہ محبت نہیں تھی، جتنی میرزا ادیب بچوں سے محبّت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے اَدب میں اُن کا منفرد مقام ہے۔ بچوں کی سطح پر آ کر لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اِس کے لیے مشاہدے اور تجربے کی ضرورت ہے۔ ''نوائے وقت'' کے اَدبی صفحہ پر اُن کے اَدبی تبصرے محتاج تعارف نہیں، اگر انھیں اکٹھا کیا جائے تو ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ پاکستان اور پاکستان سے باہر اُن کی کتابیں بہت مقبول ہیں۔ اُن کی شخصیت اور اَدبی خدمات کے حوالے سے کئی مقالات لکھے جا چکے ہیں۔

اُن کے فرزند ڈاکٹر تحسین میرزا اور اُن کی ایک صاحبزادی بھی میرزا ادیب کی طرح مقبول ہیں۔ میرزا ادیب مردِ استقلال تھے۔ ائیر مارشل اصغر خان کو چاہیے تھا کہ ایسے مردِ استقلال کو تحریکِ استقلال میں شامل کر لیتے۔ اُن کی مستقل مزاجی اور تحمل و برداشت قابل تعریف تھی۔ زندگی کے آخری ایام میں بھی وہ بڑے پُر امید اور حوصلہ مند تھے۔ حقیقتوں کے نقیب، دلوں کے قریب، بامراد و بانصیب، منفرد ادیب، میرزا ادیب ۳۱ جولائی ۱۹۹۹ء کو ہمیں سوگوار چھوڑ گئے۔ راقم الحروف

(ہارون الرشید تبسم) کا اُن سے تقریباً ۳۰ سال مسلسل رابطہ رہا۔ میری تصنیفات پر اُن کی حوصلہ افزائی کرنا میرے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اُنھوں نے ۸۴ سال عمر پائی، اور اپنی اِس پوری زندگی اَدب کے لیے وقف رکھی، اُن کی خدمات نا قابلِ فراموش رہیں گی۔ ان کی معروف اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

مطالعۂ اقبال کے چند پہلو (مجموعۂ مقالات)

پبلشرز: احمد ندیم قاسمی، بزمِ اقبال لاہور، اشاعت: مارچ ۱۹۸۵ء صفحات ۲۳۹، قیمت ۲۵ روپے

○○○

نذیر احمد، پروفیسر

(۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۳جولائی۲۰۰۲ء)

پروفیسر نذیر احمد بیوروکریٹ، اردو نقاد، اور ادیب کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ پروفیسر نذیر احمد سیکرٹری مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد تعینات رہے (۹۱۔۱۹۹۰ء) جائنٹ سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ ڈویژن اسلام آباد بھی رہے۔اس کے علاوہ ڈپٹی سیکرٹری نگران امور مقتدرہ ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۸ء تک مقرر ہوئے۔انھوں نے اقبال کی تشبیہات پر نہایت عمدہ کام کیا۔ممتاز مفتی پر بھی ایک ضخیم کتاب لکھی جس نے خوب شہرت پائی۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کی شاعری میں گنجینۂ معنی قاری کے دل و دماغ کو اپنے طلسم میں اس طرح جکڑ لیتا ہے کہ اس سے آزاد ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔علامہ اقبال نے اپنے کلام میں تشبیہات کا استعمال نہایت سلیقے اور حسن تدبر سے کیا ہے۔وہ اپنے کلام میں تشبیہات کو اس طرح سمو لیتے کہ جیسے جگنو اپنے دامن میں روشنی مقید رکھتا ہے۔

پروفیسر نذیر احمد نے علامہ کے آسمانِ کلام پر جا بجا بکھرے ان ستاروں کو چن کر یکجا کر دیا ہے پروفیسر نذیر احمد کی کتاب ''تشبیہاتِ اقبال'' علامہ اقبال کے کلام میں اسی فنی خصوصیت کا احاطہ کرتی ہے یہ کتاب مصنف کی محنت شاقہ اور عرق ریزی کا ثبوت ہے۔

تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور تمثیلات شعری حسن کو اس طرح سجا دیتے ہیں جس طرح ستارے نیلے آسمان کو، رنگ برنگ پھول گلشن کو، اور خوب صورت زیورات دلہن کو ایک حسین روپ دے دیتے ہیں۔تمام شاعر او رادیب اپنی تخلیقات کو چار چاند لگانے کے لیے تشبیہات کا

استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کے نیم وا پردے سے جھانکتا اشعار کا مفہوم انھیں مزید دل کش بنا دیتا ہے۔

بقول غالبؔ:

گنجینۂ معنی کا طلسم اِس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ میرے اشعار میں آوے

کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر نذیر احمد رقم طراز ہیں:

''آٹھ دس سال پہلے کی بات ہے کہ مجھے کلام اقبال سے ضائع بدائع جمع کرنے کا شوق دامن گیر ہوا اور میں نے علامہ اقبال کے اردو کلام میں سے صنائع بدائع کے پھولوں کو چن چن کر جمع کرنا شروع کیا اس گل چینی کے دوران میرے لیے یہ انکشاف باعث حیرت و استعجاب ہوا کہ جن صنائع بدائع معنوی اور لفظی کا ذکر بلاغت کی کتابوں میں کیا گیا ہے وہ تمام کی تمام اقبال کے کلام میں موجود ہیں اور ان میں آمد کا اتنا زور ہے اور اشعار میں ایسی روانی ہے کہ صنائع بدائع کلام کا ایک جز و لاینفک معلوم ہوتے ہیں اور ''آورد'' کا رنگ کہیں نظر نہیں آتا۔'' (ص: ڈ۔ذ)

پروفیسر نذیر احمد نے ۳ جولائی ۲۰۰۲ء کو اسلام آباد میں وفات پائی۔ مرکزی قبرستان اسلام آباد میں دفن ہوئے۔ ان کی اقبالیاتی کتاب کا حوالہ پیش خدمت ہے۔

تشبیہاتِ اقبالؒ

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان' لاہور، اشاعت ۱۹۷۷ء، صفحات ۶۰۳، قیمت: ۷۵ روپے

ooo

نذیر نیازی، سیّد

(۱۹۰۰ء۔۱۹۸۱ء)

سید نذیر نیازی ایک معروف مسلمان عالم تھے۔ وہ پروفیسر اور صحافی تھے۔ علامہ محمد اقبال کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ سید نذیر نیازی ۱۹۰۰ء سیال کوٹ میں حافظ سید عبدالغنی کے ہاں پیدا ہوئے سید نذیر نیازی معروف ماہر اقبالیات، اردو ادیب، محقق، مترجم، کارکن تحریک پاکستان (گولڈ میڈلسٹ ۱۹۸۹ء) استاد تاریخ و اسلامیات جامعہ ملیہ دہلی رہے۔ یہاں انھوں نے ۱۹۲۲ء سے ۱۹۳۵ء تک خدمات انجام دیں۔ سید نذیر نیازی نے دہلی سے ''طلوع اسلام'' ماہنامہ میگزین کا اجراء بھی کیا۔ ان کی سب سے زیادہ شہرت علامہ اقبال کے نیاز مند و مکتوب الیہ کی وجہ سے بھی ہوئی۔

ان کی اہم کتب میں ''اقبال کے حضور''، ''دانائے راز'' (جلد اول)، ''خطباتِ اقبال'' (تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ)، ''سیاسیات ارسطو''، ''غیب و شہود'' شامل ہیں۔ سید نذیر نیازی ان خوش بخت لوگوں میں شمار ہوتے ہیں، جنھوں نے اقبال کے ساتھ شب و روز گزارے۔ ان کی حیات کے کئی گوشے نہ صرف دیکھے بل کہ اقبال سے، بہت کچھ سیکھا۔

سید نذیر نیازی نے علامہ محمد اقبال کے انگریزی خطبات کو بھی اردو قالب میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ نذیر نیازی کا کمال ہے کہ انھوں نے ان خطبات میں جن مفکّرین کے نظریات کا تذکرہ کیا ہے، ان کی الگ تشریح کر دی ہے۔ فٹ نوٹ اور تعلیقات کی وجہ سے کتاب کی اہمیت میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ تمام خطبات کے مشکل مراحل کو تصریحات میں شامل کر کے ایک الگ مقالے کی صورت پیدا کر دی ہے۔ میری ذاتی رائے میں یہ تصریحات اس ترجمے کی روح ہیں۔ ان تصریحات کا مطالعہ کتاب کے مطالعے سے پہلے کرنا چاہیے۔

سید نذیر نیازی کا شمار ان خوش نصیب لوگوں میں ہوتا ہے جن کا وجود علامہ اقبال کی قربت کی ٹھنڈی میٹھی پھوار میں بھیگتا رہا۔ انھوں نے علامہ کے قرب کے ان لمحات کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا کہ یہ لمحات ہی ان کی زندگی کا حاصل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ شائقین اقبال بھی جنھوں نے علامہ کا صرف نام سنا ہے، ان لمحات جاوداں سے لطف اندوز ہوں چنانچہ سید نذیر نیازی نے علامہ کے ساتھ ان ملاقاتوں اور نشستوں کو محبان اقبال تک پہنچانے کے لیے اسے کتابی شکل دینے کا فیصلہ کیا۔

''اقبال کے حضور میں'' ان یادداشتوں کا مجموعہ ہے جس میں مؤلف نے علامہ کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کا احوال بیان کیا ہے۔

خطوط کسی بھی عہد کی ایک زندہ تصویر ہوا کرتے ہیں۔ علامہ کے لکھے ہوئے خطوط ''مکتوباتِ اقبال'' یقیناً بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ سید نذیر نیازی نے بہت اچھا کیا ہے کہ مذکورہ خطوط قارئین کے لیے پیش کر کے ایک علمی و ادبی ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ یقیناً یہ خطوط محققین کے لیے معاون ثابت ہوں گے۔

سید نذیر نیازی ۲۴ جنوری ۱۹۸۱ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ انھیں میانی صاحب کے بڑے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

دانائے راز (سوانح حکیم الامت حضرت علامہ اقبال)

پبلشرز: پروفیسر محمد منور، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: طبع اول ۱۹۷۹ء طبع دوم ۱۹۸۸ء
صفحات ۳۹۹، قیمت ۷۵ روپے

The Reconstruction of Religious Thought in Islam

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ

(یعنی حکیم الامت حضرت علامہ اقبال کے انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ مع حواشی مقدمہ اور تصریحات)

پبلشرز: احمد ندیم قاسمی، بزمِ اقبال، لاہور، اشاعت: مئی ۱۹۸۶ء، صفحات: ۳۸۵، قیمت ۳۵ روپے

اقبال کے حضور

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع اول ۱۹۷۱ء۔ دوم ۱۹۸۱ء، صفحات ۴۸۷، قیمت ۵۱ روپے

مکتوباتِ اقبال

پبلشرز: اقبال اکیڈمی کراچی، اشاعت ۱۹۵۷ء، صفحات ۳۸۴

نذیر قیصر، ڈاکٹر

(۳۰ را کتوبر ۱۹۲۲ء۔۲۴ فروری ۲۰۱۳ء)

بعض شخصیات اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ خوبیوں سے اِس قدر مالا مال ہوتی ہیں وہ اگر لوہے کو چھولیں تو اسے کندن بنا دیتی ہیں۔ ان کا اپنا وجود دوسروں کے لیے باعثِ خیر ہوتا ہے۔ ان کے سائے تلے دوسروں کی شخصیت کی نشوونما ہوتی ہے۔ ان کی ذات کا سائبان رہنمائی ثابت ہوتا ہے۔ وہ چراغ کی مانند روشنی بکھیرتے ہیں لیکن کسی مقام پر نہیں ٹھہرتے۔ جس طرح روشنی اور خوشبو اپنا راستہ خود ہموار کر لیتے ہیں اسی طرح عظیم شخصیات خوشبو اور روشنی کی طرح لامحدود ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر نذیر قیصر کا شمار ایسے احباب میں ہوتا ہے جو نسلِ نو کی ذہنی آبیاری اس انداز سے کرتے رہے کہ آج روشن مستقبل اُن کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ ان کے زیرِ تعلیم اور زیرِ تربیت لاکھوں بچے آج دنیا بھر میں ان کی شناخت بن رہے ہیں۔ نذیر قیصر ۳۰ را کتوبر ۱۹۲۲ء کو ایمن آباد گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنی جنم بھومی میں حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی سکول ایمن آباد گوجرانوالہ سے میٹرک پاس کرنے کے بعد لاہور آ گئے۔ ایف اے اور بی اے کے امتحانات میں بطور پرائیویٹ امیدوار شریک ہوئے اور کامیابی نے ان کے قدم چومے۔ پنجاب یونی ورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایف سی کالج لاہور میں ایم اے انگریزی کے لیے داخلہ لیا لیکن وہ مونٹی سری ایجوکیشن کے سلسلہ میں لندن چلے گئے۔ نذیر قیصر نے مونٹی سری ایجوکیشن میں لندن سے ڈپلومہ حاصل کیا۔ تعلیم حاصل کرنے کا جنون کسی نقطہ پر نہ رُکا۔ انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی سے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی فتح کر لی۔ وہ زندگی اور تعلیم کے فلسفہ سے روشناس ہونے کی وجہ سے درس و

تدریس اور معاشرتی استحکام کے رموز جاننے لگے۔ تعلیمی حوالوں سے نذیر قیصر نے مختلف نظام ہائے تدریس کا جائزہ لیا۔ اس ضمن میں وہ کئی ممالک کی صحرانوردی کر آئے۔ ان کا زاویہ نظر تھا کہ بچے کو ماں کی گود سے ابتدائی تعلیم تک ایسے مواقع فراہم کیے جائیں کہ وہ مستقبل کا شاہکار ثابت ہو۔ انھوں نے زندگی کی آخری سانس تک تعلیم کے فروغ کے لیے خدمات جاری رکھیں۔ سر سید کیمرج سکول لاہور کے بانی پرنسپل کی حیثیت سے انھوں نے انگریزی میڈیم اور مخلوط تعلیمی ادارے کو ایک تربیت گاہ بنائے رکھا۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے اپنی نظم ''طفل شیر خوار'' میں بچوں کی جس نفسیات کا تذکرہ کیا ڈاکٹر نذیر قیصر اس تناظر میں نسل نو کو مردِ مومن کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے سرگرداں رہے۔ انھوں نے تدریس اقبال کی نئی راہیں ہموار کیں۔ فلسفہ، ادب اور قدرتی سائنس کے حوالے سے انھوں نے فکر اقبال سے رہنمائی کشید کر کے معصوم اذہان کو خزینہ علم سے نوازا۔ درس و تدریس پیغمبرانہ مشن ہے۔ معصوم روحوں کو زیور علم سے آراستہ کرنا رب اللعالمین کا عطا کردہ اہم فریضہ ہے۔ ڈاکٹر نذیر قیصر خوش بخت تھے کہ جنھیں اللہ تعالیٰ نے اس عظیم مقصد کے لیے منتخب کیا۔ انھوں نے سر سید کیمبرج سکول کو سر سید احمد خان، قائداعظم محمد علی جناح اور ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے خوابوں کی تعبیر عطا کی۔ اسی ادارہ سے انھیں معاشرتی زندگی میں عزت و توقیر کی نعمت میسر آئی۔

وہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے افکار سے زندگی کی حرارت حاصل کرتے رہے جس طرح ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے برِ عظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی عروق مردہ میں خون زندگی ڈورایا اسی طرح ڈاکٹر نذیر قیصر تحریر و تقریر کے ذریعے اُمید اور جہدِ مسلسل کا پیغام دیتے رہے۔ اُمتِ مسلمہ کے اتحاد اور استحکام کے لیے فکرِ اقبال کا عمیق مطالعہ ان کی تحریروں سے جھلکتا ہے۔ انھیں فکر اقبالؒ سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ انھوں نے نہ صرف فکر اقبال کا مطالعہ کیا بل کہ اُسے عملی جامہ پہنانے کے لیے جدوجہد کی۔ وہ عالمی اقبال فورم کے سرپرست، پاکستان فلاسفیکل کانگرس کے ایگزیکٹو ممبر، اقبال اکیڈمی پاکستان کے تاحیات رکن، پنجاب یونی ورسٹی کے شعبہ فلاسفی کی ایلومینی ایسوسی ایشن کے صدر اور ایک عرصہ تک اقبال اکیڈمی کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال اور ماہرینِ اقبالیات ڈاکٹر نذیر قیصر کی ولولہ انگیز خدمات کو نہ صرف ہدیۂ تحسین پیش کرتے رہے بل کہ اُنھیں دوسروں کے لیے قابلِ تقلید قرار دیتے تھے۔ ڈاکٹر نذیر قیصر نے ان تمام سرگرمیوں کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا جن کا تعلق نسلِ نو کی ذہنی آبیاری، اسلامی تعلیمات کے فروغ سے رہا۔

فکرِ اقبال سے آگاہی، کردار سازی اور استحکام پاکستان کے جذبات بچوں میں منتقل کرنا ایک صدقہ جاریہ تصور کرتے ہوئے انھوں نے تمام عمر اس سعادت سے نباہ کیا۔ انھوں نے بچوں کی ذہنی وفکری صلاحیتوں کے حوالے سے مختلف مقامات پر مقالات پڑھے۔ ڈاکٹر نذیر قیصر بچوں کی نفسیاتی تعلیم کو شخصیت سازی کا سنگ میل قرار دیتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ابتدائی تعلیم کی نشوونما کے لیے قابل تقلید اقدامات کیے۔ مشرق و مغرب کے علوم پر دسترس کی وجہ سے ان کے تحریر کردہ بہت سے مضامین عالمی سطح کے ادبی رسائل و جرائد کی زینت بنے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال ان کی محبوب شخصیت تھے۔ ان کی آٹھ کتب پاکستانی ادب میں بہت مقبول ہیں۔

i Rumi's Impact on Iqbal's Religious thought

ii A Critique of western Psycholgy and Psychotberapy and Iqbal's Approach.

iii Iqbal and Western Philosophers.

iv Iqbal Today.

v Realization of Iqbal's Educational Philosophy in Montessori system.

vi Creative Dimensions of Iqbal's Thought

vii Iqbal - A Philosophical Therapist and beyond

۸۔ فکرِ اقبال کے تحقیقی پہلو

۹۔ اقبال اور ذہنی علاج

ڈاکٹر نذیر قیصر کی دو کتابوں کو اقبال اکیڈمی کے صدارتی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ڈاکٹر نذیر قیصر کی اقبالیاتی کتب پاکستان میں اپنی انفرادیت کی وجہ سے بہت مقبول ہوئیں۔ اقبال اکادمی کے مقاصد کی تکمیل میں ڈاکٹر نذیر قیصر نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ اقبال اکادمی پاکستان نامساعد حالات میں گھری رہی۔ اس قومی ادارہ کو بھنور سے نکالنے کے لیے ڈاکٹر نذیر قیصر ہمہ وقت مصروفِ عمل رہے۔ میری ان سے آخری ملاقات ۱۵؍اکتوبر ۲۰۱۱ء کو اقبال اکادمی کی تقسیم ایوارڈ میں ہوئی۔ وزیر اعظم پاکستان سید یوسف رضا گیلانی اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر نذیر قیصر کے علاوہ مجھے جسٹس جاوید اقبال، شعیب ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، محمد عمر سہیل، ڈاکٹر ایوب صابر اور بہت سے ماہرینِ اقبالیات سے بھی ملنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ان کی شخصیت سراپا محبت تھی۔ اقبال کے بارے میں وہ ہر کتاب کا عمیق نظری سے مطالعہ کرتے تھے۔ انھوں نے فکر اقبال کی مختلف جہتوں

کوتنقیدی کسوٹی پر پرکھا اوران کا موازنہ مختلف دانشوروں سے بھی کرتے رہے۔انھوں نے افکارِ اقبال کا عمیق نظری اور گہرائی سے مطالعہ کیا۔انھوں نے اقبال کے افکار و خیالات اور فلسفیانہ نظریات کا مغربی مفکرین سے موزانہ بھی کیا اور اقبال کی عظمت اور رفعت کے گن گائے۔تقابلی جائزہ کے ضمن میں ان کی چند کتب قابل ذکر ہیں جن میں خاص طور پر

i Rumi's Impact on Iqbal's Religious thought
ii A Critique of western Psycholgy and Psychotberapy and Iqbal's Approach.
iii Iqbal and Western Philosophers.

اہمیت کی حامل ہیں۔انھوں نے مولانا رومی کے نظریات اور اسلامی فکر کو اقبال کے نظریات وا‌ افکار سے مماثل تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔یہاں اقبال کی مولانا رومی سے گہری عقیدت ا ر محبت کو پیش کیا گیا ہے۔مولانا رومی ایسے دانش ور ہیں جن کے نظریات وافکار سے اقبال نے اپنے ذہن کی نشو ونما کی اوران کا حوالہ پیر رومی منصۂ شہود پر آیا۔ڈاکٹر نذیر قیصر نے یہ کتاب لکھ کر ان دونوں عظیم دانش وروں کے خیالاتِ عالیہ سے قارئین کو آگاہ کیا ہے۔مغربی ممالک میں بھی اس کتاب کا خوب خیر مقدم کیا گیا۔اقبال اور رومی کے خیالات ونظریات کو سمجھنے کے حوالے سے یہ کتاب نہایت اہم ہے۔

A Critique of western Psycholgy and Psychotberapy and Iqbal's Approach.

کتاب کا ایران کے معروف دانش ور محمد بگھائی مکان نے فارسی میں ترجمہ کیا۔ڈاکٹر نذیر قیصر کی کتاب کو ایران میں اول انعام سے نوازا گیا۔ڈاکٹر محمد بگھائی مکان نے ڈاکٹر نذیر قیصر کی چار کتب کا فارسی ترجمہ کرکے فارسی ادب کو اقبال کے منفرد خیالات اور نظریات سے بہرہ ور کیا ہے۔

ڈاکٹر نذیر قیصر کی کتاب ''اقبال اور ذہنی علاج'' اس حوالے سے بہت ہی منفرد اور اہم ہے جس میں انھوں نے اقبال کی طرف سے ذہنی علاج کے طریقہ کار پر بحث کی ہے۔نفسیاتی امراض کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ:

> ''سائیکوتھریپی ایسی تکنیک کا نام ہے جو کہ نفسیاتی امراض اور روزمرہ کی نفسیاتی بے ضابطگی کے لیے زیر کار لائی جاتی ہے۔یہ کوئی تصور نیا نہیں اس پر شروع سے ہی مختلف شکلوں میں عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔البتہ اس کی ضرورت جو اس زمانہ میں ہے شاید پہلے ایسی نہ تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ ماڈرن زمانہ نے اگرچہ بے شمار سہولتیں اور آسائشیں دی ہیں لیکن اس کے بدل میں اطمینان قلب، ذہنی سکون اور روحانی مسرت جیسے خزانے چھین لیے ہیں۔''

انگریزی اردو دونوں ہی حصے اہمیت کے حامل ہیں۔ ۱۶ صفحات پر مشتمل انگریزی حصہ میں جن اشعار کا انتخاب کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ اشعار کا انگریزی ترجمہ مصنف کی اقبال شناسی اور ترجمے کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ترجمہ کرتے ہوئے مصنف نے مختصر ہونے کے باوجود ترجمہ کی روح کو زندہ رکھا۔ یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود!

There are as yet many worlds to be Manifcsted
For the womb of Being is not empty .

نہ ہو نومید، نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
امید مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

Do not lose hope: despair is the decline of all knowledge.

زمانہ گلوبل ویلیج بن چکا ہے۔ ہر انسان آسودگی چاہتا ہے۔ نت نئے علاج دریافت ہو رہے ہیں۔ موسیقی سے علاج کرنے کا طریقہ بھی مختلف علاقہ جات میں رائج ہے۔ اخبار میں اس خبر پر بھی نظر پڑی تھی کہ ایک شخص نے موسیقی کے ذریعے بھینس کو دودھ دینے پر راضی کر لیا۔ گھوڑا ڈانس، اونٹ ڈانس اور دوڑ کے لیے بھی موسیقی کارگر ثابت ہوئی لیکن جو ذہنی آسودگی سورۃ رحمٰن کی تلاوت سے انسان کو حاصل ہوئی وہ انمول اور لازوال ہے۔ ''اقبال اور ذہنی علاج'' درحقیقت اقبال کے فلسفہ میں انسانی رویوں کی عکاسی ہے۔ عظمت انسانی، تخلیق انسانی کا ارتقاء، مقصدیت اور قرآنی آیات میں ذہنی کش مکش کا علاج اقبال کی شاعری کے مختلف گوشوں سے تلاش کرنا ایک بہت بڑی اقبال شناسی کی روش ہے۔ ڈاکٹر نذیر قیصر نے پاکستان اور پاکستان سے باہر جو تعلیمی سفر کیے ہیں ان کے تجربات، وسعت مطالعہ اور فکر اقبال سے گہرا شغف اس کتاب کی تخلیق کا باعث ہے۔ اقبال کے تمام پہلوؤں پر لاتعداد کتب زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں لیکن یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد ہے۔ کتاب کا حاصل ڈاکٹر نذیر قیصر نے کچھ یوں نکالا ہے۔

"میرے نزدیک فلسفہ فقر کو اپنانے کی جس قدر آج کے دور میں ضرورت ہے اتنی شاید کبھی نہ تھی ہر وقت دولت اکٹھی کرنے کی دوڑ ہے۔ رشوت ستانی، بلیک مارکیٹنگ کا دور دورہ ہے اور اس افراتفری کے دور میں انسان اپنا ذہنی سکون کھو چکا ہے اور طرح طرح کی ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہو رہا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان ماڈرن ایجادات سے فائدہ نہ اٹھائے یا اس کے پاس روپیہ پیسہ نہ ہو بلکہ یہ کہ خوب جدو جہد کرے مگر اعلیٰ مقصد اور توکل وقناعت کے بغیر نہیں۔"

ڈاکٹر نذیر قیصر، مصور پاکستان ڈاکٹر علامہ اقبال کے خیالات عالیہ سے اپنا ذہنی وفکری مواد کشید کرتے تھے اس لیے ان کی ذات میں پاکستان سے محبت ہمہ وقت موجزن رہتی۔ وہ پاکستانی کی نظریاتی کے سرحدوں کے امین تھے۔ انھوں نے تحریک پاکستان، تشکیل پاکستان، تکمیل پاکستان اور تعمیر پاکستان کے حوالے سے اپنی رشحات قلم سے بہت کچھ لکھا۔ نظریہ پاکستان کے فروغ کے ضمن میں انھیں جہاں موقع ملا انھوں نے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کیا۔ ۱۹۵۰ء سے تادم آخر انھوں نے سرسید کیمرج سکول ۱۴ میکلورڈ روڈ لاہور میں طالبِ علموں اور ان کے والدین کے اذہان کو افکار اقبال کی نمو سے زرخیز رکھا۔ استاد بادشاہ نہیں ہوتا لیکن بادشاہ گر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نذیر قیصر نے لاکھوں طالب علموں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرکے حیات جاوید پالی۔ وہ نظریاتی استاد تھے۔ وقت گواہ ہے کہ جس استاد کے پاس کوئی نظریہ نہیں ہوتا وہ صرف مزدور کہلاتا ہے۔ استاد قومی تشکیل کا بے تاج بادشاہ ہے۔ نذیر قیصر نے بچوں کے اذہان تسخیر کیے۔ ان کے تدریسی تجربات نسلِ نو کے لیے مشعل راہ ہیں۔ تجربہ میرا استاد اور ٹھوکریں میری تعلیم کے مصداق ڈاکٹر نذیر قیصر نے تمام عمر مطالعہ کتب کو زندگی کا لازمی جزو تصور کیا۔ ان کا "کتب مینار" ان کی زندگی کا سرمایہ تھا۔ ان کی خواہش کے مطابق یہ کتابیں نظریۂ پاکستان ٹرسٹ شاہراہ قائداعظم لاہور کی لائبریری کو عطیہ کر دی گئیں۔ منتظمین نظریۂ پاکستان کی لائبریری میں ڈاکٹر نذیر قیصر کا ایک گوشہ قائم کر دیا ہے۔ نذیر قیصر کے ذخیرے سے محققین استفادہ کر رہے ہیں۔ بہت سی پاکستان کے حوالے سے نظریاتی تنظیموں میں ڈاکٹر نذیر قیصر کا نام ایک شناخت رکھتا ہے۔ وہ ۲۴ فروری ۲۰۱۳ء کو ہم سے جسمانی طور پر بچھڑ گئے لیکن ذہنی طور پر وہ آج بھی ہمارے دلوں کے مکیں ہیں۔ ان کی بیٹی شگفتہ ملک، فرزندان ڈاکٹر شہزاد قیصر، شاہ رخ قیصر، ذیشان قیصر، شاہد قیصر اپنے والدِ گرامی ڈاکٹر نذیر قیصر کے مشن کی تکمیل کے لیے ہمہ وقت

مصروف عمل ہیں۔ محترم شاہد قیصر نادم تحریر سر سید کیمرج سکول لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے اپنے والدِ گرامی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے علم و آگاہی کے نگینے بانٹ رہے ہیں۔ ان کے بڑے فرزند ڈاکٹر شہزاد قیصر اپنے والد گرامی کی شخصیت کا پرتو ہیں۔ وہ ۶ مارچ ۱۹۵۰ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ انگریزی، اردو، پنجابی اور سرائیکی زبان پر دسترس رکھتے ہیں۔ بحیثیت فیڈرل سیکرٹری ۵ مارچ ۲۰۱۱ء کو ریٹائر ہوئے۔ انھوں نے بھی ایم اے فلاسفی پنجاب یونیورسٹی سے کیا جبکہ ۱۹۹۴ء میں زکریا یونیورسٹی ملتان سے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انھیں، ان کی گراں قدر خدمات پر ستارۂ امتیاز اور صدارتی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اس کے علاوہ بہت سے ایوارڈز بھی ان کے حصے میں آئے۔ انھیں بھی اپنے والد گرامی کی طرح فکر اقبال سے گہرا لگاؤ ہے اور وہ اس حوالے سے بہت سے سیمیناروں میں مقالات پیش کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر شہزاد قیصر کے تخلیقی سرمایہ میں

Quest for the Eternal
Of Intellect and Reason
The Metaphysics of Khawaja Ghulam Farid
The Message of Diwan-i-Farid
Iqbal and Khawaja Ghulam Farid on Experiencing God
Dimensions of Kh. Farid's Metaphysics
Metaphysics and Tradition
Beyond the Manifest
Understanding Diwan-i-Faid
The Metaphysical and Cultural Perspectives of Khawaja Ghulam Farid's Poetry and Iqbal
Culture and Spirituality: Punjabi Sufi Poetry of Baba Fariduddin Masud Ganj-i-Shakr: As Recorded in Guru Sahib (Rendered into English Prose and Explained in the Light of Tradition)
Husayn's Choice of the Transcendent

اُردو

- کلیئرنس سیل (انشائیے)
- صاف چھپتے بھی نہیں (انشائیے)
- آئینہ بنے بے پیرہن (انشائیے)
- لطف آگاہی (انشائیے)

پنجابی

- دجی اکہ (نظماں)
- آسماناں دے بوہے کھول (کافیاں)
- میں ناہیں سبہ توں (کافیاں)
- گل وچ پایم پریت مہار (کافیاں)
- تلاوت وجود (کافیاں)
- عشق فقر دے سنگ (کافیاں)
- کافیاں (چونواں کلام)

مختلف یونیورسٹیوں اور کالجز میں ان کے پرمغز مقالات کی ستائش کا عمل جاری ہے۔ حکومت نے ڈاکٹر شہزاد قیصر کو اقبال اکادمی پاکستان کی گورننگ باڈی کا نائب صدر منتخب کر کے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا عزم کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ان کی زیرِ سرپرستی فکرِ اقبال کے فروغ کی راہیں ہموار ہوں گی۔ پاکستان کو مصور پاکستان علامہ محمد اقبال اور بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کی امیدوں کے مطابق ایک فلاحی مملکت کا خواب پورا ہو سکے گا۔ ان کی اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال اور ذہنی علاج

پبلشر: محمد سہیل عمر، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، اشاعت: ۲۰۱۲ء، صفحات ۱۰۴، قیمت ۱۵۰ روپے

ooo

نسیم امروہوی

(۱۹۰۸ء۔۱۹۸۷ء)

نسیم امروہوی کا اصل نام سید قائم رضا تھا اور وہ ۱۹۰۸ء کو امروہہ یوپی انڈیا میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے خوب شہرت پائی۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم کے بعد عربی، فارسی، اور اردو کی تعلیم امروہہ میں ہی حاصل کی۔ پہلا مرثیہ ۱۹۲۳ء میں امروہہ کی ایک مجلس میں پڑھا۔ انھوں نے تقریباً ایک سو چالیس کتابیں تصنیف کیں۔ ان کے مراثی دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

نسیم امروہوی اردو زبان و ادب کا ایک معتبر نام ہے۔ نسیم امروہوی سچے اور کھرے خادم اردو تھے جنھوں نے لفظ کی حرمت کا ہمیشہ خیال رکھا۔ وہ صحت لفظی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اعراب، صوتیات، اور گرائمر پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ انھیں اکثر احباب ''چلتی پھرتی لغت'' کہا کرتے تھے۔ جب کوئی نیا لفظ ملتا تو اس کے بارے میں ہفتوں بحث کرتے مختلف دوستوں سے اس کے بارے میں پوچھتے کہ یہ لفظ کہاں سے چلا؟ کہاں اس کی جنم بھومی ہے؟ اور اب ہمارے پاس کس زمانے میں پہنچا اور اب اس کے معانی کیا ہیں؟ اور اس وقت اس کے معانی کیا تھے۔ ایسے سوالوں میں الجھے رہتے۔

''نسیم اللغات'' بھی ایک ایسی جامع لغات ہے، جس سے کسی کو انکار نہیں۔ اردو زبان سے دل چسپی رکھنے والے ''نسیم اللغات'' سے استفادہ کر کے انھیں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ ان کا یہ تاریخی کارنامہ گیارہ جلدوں پر مشتمل ہے جو ان کی ان تھک محنت اور اردو زبان سے لگن کا ثبوت ہے۔

اردو لفظ پر ان کی گرفت کے بارے میں سبھی معترف ہیں لیکن جب جوش ملیح آبادی جیسا

قادرالکلام شاعر کہے کہ ''میں لفظ پر نسیم امروہوی کی علمی گرفت کا معترف رہا ہوں'' تو ماننا پڑے گا۔ نسیم امروہوی سابق مدیر اول لغت اردو بورڈ کراچی رہے ہیں۔ اردو لغت بورڈ میں ان کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔ ان کے کام اور نام کا ایک زمانہ معترف ہے۔ انھوں نے علامہ محمد اقبال کی تصنیفات میں استعمال ہونے والے مشکل الفاظ کی جب فرہنگ تیار کی تو اس کا ملک بھر میں خیر مقدم کیا گیا۔ ''فرہنگ اقبال (فارسی)'' ایک ایسا نایاب تحفہ ہے جس کی مدد سے ہم با آسانی اقبال کی فارسی شاعری کو سمجھ سکتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب ''فرہنگ اقبال (فارسی)'' فارسی کے علاوہ انھوں نے '' فرہنگ اقبال (اردو)'' بھی مرتب کی۔

اقبال کی فارسی شاعری سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مؤلف نے فارسی الفاظ کے نہ صرف اردو معانی تحریر کیے ہیں بل کہ یہ بھی درج کیا ہے کہ فارسی کا یہ لفظ اقبال کے کس شعری مجموعہ میں ہے۔ اس عرق ریزی پر نسیم امروہوی کو جتنا خراجِ عقیدت پیش کیا جائے، اتنا کم ہے۔ اقبال کی فارسی شاعری کے محققین کے لیے یہ ''فرہنگِ اقبال (فارسی)'' انتہائی اہم اور اقبالیاتی کتب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

وارث سرہندی ''فرہنگ اقبال'' کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''فرہنگ اقبال'' ایک مفید معلومات افزاء اور قابلِ قدر کتاب ہے اور اقبالیات میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر پڑھے لکھے بالخصوص کلامِ اقبال کے ہر شیدائی کے کتب خانے میں موجود ہو۔ اس سے کلامِ اقبال کو سمجھنے اور اس کا پس منظر معلوم کرنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ اس سلسلے میں جناب نسیم امروہوی کی سعی و محنت لائق تحسین و تبریک ہے۔''

ان کی لغت اور اقبال کے حوالے سے جو خدمات ہیں وہ نا قابلِ فراموش ہیں۔ ان کی لغت ''نسیم اللغات''، علمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہے۔ نسیم امروہوی ۱۹۸۷ء کو انتقال کر گئے۔

فرہنگِ اقبال (فارسی)

پبلشرز: سید محمد علی انجم رضوی، اظہار سنز اردو بازار لاہور، اشاعت ۱۹۸۹ء، صفحات ۹۲۷، قیمت ۱۹۰۰ روپے

○○○

نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر

(یکم اپریل ۱۹۱۶ء۔۱۳/اپریل ۱۹۹۷ء)

فطرت بعض شخصیات کو گوناں گوں خوبیوں سے سرفراز کر دیتی ہے۔ڈاکٹر نصیر احمد ناصر ایسے خوش بخت انسان تھے جن پر قدرت نے اپنی خاص کرم نوازی فرمائی۔ وہ بیک وقت ممتاز ماہر تعلیم، دانش ور، مؤرخ، سیرت نگار، مفسّر، محقق اور نقاد تھے۔ وہ یکم اپریل ۱۹۱۶ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ جمالیات کے حوالے پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھا۔اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ جامعہ پنجاب کے سابق سیکرٹری رہے۔ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۹ء تک وائس چانسلر رہے۔

ان کی معروف کتب میں ''حسنِ تفسیر۔پیغمبر اعظم و آخر ﷺ'' (۱۹۷۸ء میں کتب سیرت کے عالمی مقابلے میں سوم) ''جمالیات قرآنِ حکیم کی روشنی میں''، ''اقبال اور جمالیات''، ''روداد سفر حجاز''، ''تاریخِ تزکیہ''، ''داستانِ اندلس''، ''آرزوئے حسن''، ''فلسفۂ رسالت''، ''حسنِ انقلاب''، ''تاریخِ جمالیات'' شامل ہیں۔ڈاکٹر نصیر احمد ناصر چوں کہ جمالیات پر خوب دسترس رکھتے تھے۔ انھوں نے اقبال کے ہاں جمالیات کو نہایت عمدہ انداز میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے اپنی نظموں میں شاعری کے جمالیاتی نظام کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔اقبال کی شاعری بحرِ بیکراں ہے۔ جس طرح پانی اپنا راستہ خود بنالیتا ہے، اسی طرح شاعری اپنے موضوعات خود تلاش کر لیتی ہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کا نظریۂ فن، جمالیات سے متصادم نہیں ہے۔نصیر احمد ناصر نے ڈاکٹر علامہ اقبال کی شاعری سے جن جمالیاتی موضوعات کا انتخاب کیا ہے وہ

قابلِ تعریف ہیں۔ کتاب کے چودہ ابواب نصیر احمد ناصر کی تحقیق اور جمالیاتی حس کے غماز ہیں۔ یہ مشکل موضوع اور علامہ اقبال کی شاعری سے ان عناصر کا تلاش کرنا بہت بڑا تحقیقی کام ہے۔ ۱۳ر اپریل ۱۹۹۷ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔

اقبال اور جمالیات

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان۔ لاہور، اشاعت ۱۹۶۴ء، صفحات: ۵۰۲، قیمت ۱۷ روپے ۵۰ پیسے

ooo

نظر حیدر آبادی

(۱۹۱۹ء۔۲۷/اگست ۱۹۶۳)

نظر حیدر آبادی ۱۹۱۹ء کو ضلع بیڑ (حیدر آباد دکن) میں علی اختر حیدر آبادی کے ہاں پیدا ہوئے۔ نظر حیدر آبادی کا اصل نام حامد اختر تھا جب کہ علمی وادبی حلقوں میں نظر حیدر آبادی کے نام سے مشہور تھے۔ نظر حیدر آبادی نے بحیثیت شاعر، ادیب اور محقق شہرت پائی۔ انھوں نے ادب کے زردبان پر قدم اپنے والد گرامی کی شاگردی اختیار کر کے رکھا اور پھر شہرت کی سیڑھیاں چڑھتے چلے گئے۔ نظر نے اپنے والد سے علم عروض اور دیگر علوم کی تعلیم حاصل کی۔ ان کی معروف کتب میں ''خرمن'' (شعری مجموعہ)، ''کارواں''، ''سلک گوہریں'' اور ''اقبال اور حیدر آباد'' شامل ہیں۔

اقبال کی شاعری میں چھپے بلند افکار نے اہلِ دکن کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ علامہ کے کلام نے حیدر آباد پر دوررس اثرات مرتب کیے۔ ان اثرات کا جائزہ نظر حیدر آبادی نے اپنی کتاب ''اقبال اور حیدر آباد'' میں بڑی خوب صورتی سے لیا ہے یہ ایک نیا اور اچھوتا موضوع ہے جس کو ہنوز ناقدینِ اقبال نے نظر انداز کیا تھا۔ یہ کتاب ۱۹۵۸ء میں مرتب کی گئی لیکن اس کی اشاعت ۱۹۶۱ء میں ہوئی۔

کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ''اقبال کے اثرات ادب میں'' اقبال کے حیدر آباد کے ادب پر اثرات کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیتا ہے۔ دوسرا حصہ ''اقبال کے اثرات سیاست میں'' نہایت اہمیت کا حامل ہے، جس میں اقبال کے سیاسی نظریات کی مختلف جہتوں کی روشنی میں حیدر آباد کے سیاسی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اقبال کی شاعری نے حیدر آباد پر جو اثرات مرتب کیے ان کو نہایت عمدگی سے نظر حیدر آبادی نے کتاب میں پیش کیا ہے۔ نظر حیدر آبادی ۲۷/اگست ۱۹۶۳ کو کراچی میں انتقال کر گئے۔

اقبالؒ اور حیدر آباد

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان لاہور، اشاعت ۱۹۶۱ء، صفحات ۲۳۲

نور محمد قادری، سید

(۸ مئی ۱۹۲۸ء۔ ۱۵ نومبر ۱۹۹۶ء)

سید نور محمد قادری ۸ مئی ۱۹۲۸ء چک نمبر ۱۵ شمالی تحصیل پھالیہ میں حافظ سید محمد عبداللہ شاہ قادری کے ہاں پیدا ہوئے۔ حافظ سید محمد عبداللہ شاہ قادری اپنے زمانے کے ممتاز عالم دین اور دانش ور تھے۔ گھر کا ماحول دینی اور مذہبی ہونے کی وجہ سے سید نور محمد قادری کو دینی افکار و نظریات سے اُنسیت کا ہونا کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔

سید نور محمد قادری ممتاز محقق، نقاد، مصنف اور ماہر اقبالیات تھے۔ انھوں نے اقبالیات کے میدان میں خوب نام کمایا ہے۔ ان کی علامہ محمد اقبال کے حوالہ سے تین کتب انھیں ہمیشہ زندہ و جاوید رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ ان میں ''اقبال کا آخری معرکہ''، ''اقبال کے دینی و سیاسی افکار'' اور ''علامہ اقبال اور میلاد شریف'' شامل ہیں۔ تینوں کتب اقبال کے افکار و نظریات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔

ان کی دیگر کتابوں میں ''اعلیٰ حضرت کی سیاسی بصیرت''، ''قطب العارفین حضرت قاضی سلطان محمود'' شامل ہیں۔

ان کی کتاب ''اقبال کا آخری معرکہ'' کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے چھ ابواب میں علامہ اور مولانا حسین احمد کے نظریات اور ایک دوسرے کے خیالات کے جوابات درج ہیں۔ باب ہفتم ''بلی تھیلے سے باہر آ گئی'' نہایت دل چسپ اور اہم ہے جس میں مولانا حسین احمد کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس میں مصنف نے مولانا کے مضمون کے اقتباسات بھی دیے

ہیں جو کہ انھوں نے ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کے نام سے لکھا۔ بعدازاں ڈاکٹر محمد اقبال خالق حقیقی سے جا ملے اور مولوی حسین احمد کو علامہ اقبال کے خلاف گل فشانی کا خوب موقع ملا۔ باب ہشتم ''جواب آں غزل'' میں مولانا حسین احمد کے اس مضمون کے بارے میں مسلم مفکرین کے تاثرات اور جوابی مضامین کا ذکر ہے۔ غرض علامہ اور مولانا کے درمیان یہ معرکہ توجہ طلب اور دلچسپ ہے اور ہمیشہ کی طرح یہاں بھی جیت حق کی ہوئی۔ سید نور محمد قادری کی یہ کتاب ایک ڈھال ہے جو اقبال کے مخالفین کے ہر حملے کا دفاع کرتی ہے۔ سید نور محمد قادری کی طرح ڈاکٹر ایوب نے بھی اپنی کتابوں میں علامہ اقبال کے مخالفین کے منہ توڑ جوابات دیئے ہیں۔ ڈاکٹر ایوب صابر کی کتاب ''اقبال دشمنی'' اس حوالے سے نہایت اہم کتاب ہے۔ سید نور محمد قادری ایک سچے اور کھرے عاشق اقبال ہیں جنھوں نے اقبال کا بھرپور انداز میں دفاع کیا ہے۔

سید نور محمد قادری ۱۵ نومبر ۱۹۹۶ء کو واہ کینٹ میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی تدفین ان کے گاؤں چک نمبر ۱۵ شمالی تحصیل پھالیہ میں کی گئی یعنی پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

ان کی اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال کا آخری معرکہ

پبلشرز: ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، اشاعت: جنوری ۱۹۸۷ء، صفحات: ۱۷۶، قیمت: ۳۰ روپے

ooo

واجد رضوی، سید

(۲۶ دسمبر ۱۹۲۶ء۔ ۲۰ جولائی ۲۰۱۰ء)

بزمِ علم وفن انٹرنیشنل اور بزم علم وفن پاکستان، اسلام آباد میں شاعروں، ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لیے پروفیسر شوکت واسطی کی رہنمائی میں اہم خدمات انجام دیں۔ شوکت واسطی ۳ ستمبر ۲۰۰۹ء کو داغ مفارقت دے گئے لیکن بزم علم وفن کو حیات جاوداں عطا کر گئے۔ سید واجد رضوی ایڈووکیٹ اُن کے دستِ راست تھے۔ وہ ۲۶ دسمبر ۱۹۲۶ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ قانون کی ڈگری عثمانیہ یونی ورسٹی سے حاصل کر کے حیدر آباد دکن میں وکالت شروع کی۔ اُنھیں قائداعظم اور علامہ اقبال سے ملنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ قائداعظم کی آواز پر آزادی کا نعرہ بلند کرنے والوں میں سید واجد رضوی سرفہرست تھے۔ سید واجد رضوی نے دُور دراز علاقوں میں تحریکِ پاکستان کے مقاصد عام کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ پاکستان ہجرت کے بعد قومی خدمت کا یہ جذبہ کم نہ ہوا۔ سید واجد رضوی سے میری کئی یادگار ملاقاتیں ہیں۔ بزم علم وفن اسلام آباد کی تقریبات میں بھی اُن سے ملاقات کا شرف حاصل رہا۔ صدر آزاد کشمیر سردار محمد ابراہیم سے ملاقات کے بعد واپسی پر ایبٹ آباد میں اُن کے گھر پر منعقدہ ایک تقریب میں بھی شرکت اور گفت گو کا اعزاز حاصل ہوا۔ وہ اکثر اپنے دولت کدہ پر علمی و ادبی تقریبات کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ نظریۂ پاکستان اور علامہ اقبال سے ان کی محبّت مثالی رہی۔ سید واجد رضوی اتحادِ ملت کے داعی تھے۔ اُنھوں نے روٹری کلب، بزمِ علم وفن میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ وہ سیدہ ظہیر النساء ایجوکیشن ٹرسٹ کے بانی رکن تھے۔ پان اسلامک ٹرسٹ اور فری میڈیکل اینڈ لیگل ایڈ ٹرسٹ اُن کی بے لوث خدمات کے ادارے ہیں۔ اُنھوں نے پاکستانی موضوعات پر بہت

کچھ لکھا ہے۔ اُن کی اہم ترین کتب میں ''رسولِ اکرم ﷺ میدانِ جنگ میں''، ''زوال ملت ونشاۃِ ثانیہ''، ''احسن طرزِ حکمرانی''، ''پیغمبر رحمت ﷺ''، ''ذوقِ جہاد''، ''نظریۂ پاکستان'' شامل ہیں۔ اگلے وقتوں کی شرافت، دیانت اور انسان دوستی سید واجد رضوی کی شخصیت کے نمایاں اوصاف ہیں۔ اُنھوں نے مشرقی طرزِ زندگی اپنایا اور لوگوں میں ملّی شعور اُجاگر کرنے کے لیے عملی مظاہرہ کیا۔ وہ ائیر مارشل اصغر خان سے عقیدت رکھتے تھے۔ وہ ۲۰ جولائی ۲۰۱۰ء کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔
معروف پبلشر، دانش ور، ادب دوست ملک مقبول نے ادبی شخصیات میں واجد رضوی کے اسلوب کے بارے میں لکھا ہے کہ سید واجد رضوی وکالت، ادب، صحافت اور خدمتِ انسانیت کی وجہ سے اپنی منفرد شخصیت رکھتے تھے۔ عاشقِ رسول ﷺ اور محبِ وطن پاکستانی مجاہد تھے۔ ملک مقبول احمد اپنی کتاب ''۵۰ نامور ادبی شخصیات'' میں اُن کی شخصیت اور خدمات کو یوں ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے: ''سید واجد رضوی پہلی دفعہ لاہور تشریف تو میں نے انھیں حکومت پاکستان کو کوئی بڑا افسر سمجھا۔ میں تعظیماً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تو وہ اس وقت تک کرسی پر نہیں بیٹھے جب تک کہ میں دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ نہیں گیا۔ چند رسمی باتوں کے بعد ہی وہ بولے۔ ''میں ایک نیک مقصد لے کر آپ کے پاس آیا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ تعلیمات نبوی ﷺ اور سیرۃ رسول ﷺ پر میری کتابیں آپ کا ادارہ شائع کرے۔'' سچی بات یہ ہے کہ افسانے اور ناول چھاپ چھاپ کر میرے دل میں بھی آرزو پیدا ہو گئی تھی کہ ادارے کے اشاعتی پروگرام میں مزید تبدیلیاں لائی جائیں۔ واجد رضوی صاحب کی اس تجویز سے پہلے بھی میں چند کتابیں دینی موضوعات پر چھاپ چکا تھا اور ان کی بہت پذیرائی ہوئی تھی۔ میں نے ان کی تجویز کو قبول کرنے میں ذرا سا تامل بھی نہ کیا بل کہ خوشی ہوئی کہ وہ تحریر کا کام صرف خدا اور رسول ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کر رہے تھے۔ سید صاحب دو کتابوں کے مسودے ساتھ لائے تھے۔ میں نے ان سے مسودے لے کر آنکھوں سے لگائے اور ذہن میں ان کی طباعت واشاعت کا فوری پروگرام بنا لیا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے یہ دو کتابیں حضور نبی کریم ﷺ کی عقیدت اور اپنی روح کی سرشاری کے لیے لکھی تھیں۔ اس لیے زمانہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور انھیں دو گولڈ میڈل پیش کیے۔...... انھوں نے ایبٹ آباد میں اتحادِ ملی پاکستان، بزمِ علم وفن اور پاکستان روٹری کلب کے صدر اور ریلاف کلب کے نائب صدر کی خدمات انجام دیں۔ ایبٹ آباد کے خواص اور عوام سب ان کی بے لوث خدمات کی تعریف کرتے تھے۔ انھیں سیدہ ظہیر النساء ایجوکیشن ٹرسٹ کے بانی رکن

ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔اس کے علاوہ انھوں نے پان اسلامک ٹرسٹ میں بھی خدمات انجام دیں۔خدمت خلق کا ایک اور ادارہ انھوں نے ''فری میڈیکل اینڈ لیگل ایڈ ٹرسٹ'' کے نام سے قائم کیا جس کا مقصد نادار لوگوں کی خدمت تھا۔

سید واجد رضوی تحریکِ پاکستان کے مجاہدوں میں سے ایک تھے۔انھیں قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ محمد اقبال سے بہت عقیدت تھی۔قومی اور ملی تقریبات میں بڑے استقلال سے شرکت کرتے ہیں۔انھیں مصور پاکستان ڈاکٹر علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کے سلسلہ میں منعقدہ تقریبات میں شرکت کا جنون رہا۔انھیں کئی بڑی تقریبات میں مقالات پڑھنے اور جوش خطابت کا مظاہرہ کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔سید نذیر نیازی کی کتاب ''دانائے راز'' کے بعد اسی نام سے دوسری کتاب کا منظرِ عام پر آنا عجب بات ہے۔سید واجد رضوی شریف النفس شخصیت کے حامل تھے۔

ان کی اقبال شناسی کا حوالہ ان کے مضامین سے لگایا جاسکتا ہے۔واجد رضوی عاشق رسول ﷺ تھے اور اقبال کے عشقِ رسول ﷺ کی روشنی اپنے قلم سے قرطاس پر بکھیرتے تھے۔سیرت النبی ﷺ کے بارے میں بھی ان کی تحریریں ادبی، علمی اور دینی حلقوں میں مقبول ہیں۔مجاہدانہ طرزِ اسلوب کے حامل ہیں۔ان کی اقبالیاتی کتب انھیں اقبال شناسوں کی صف میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ان کی کتاب دانائے راز کے بارے میں معلومات پیش ہیں۔ان کی اقبالیاتی کتاب کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

دانائے راز

پبلشرز: مقبول اکیڈمی لاہور، طبع اول ۱۹۶۷ء دوم ۱۹۶۹ء سوم ۱۹۸۳ء، صفحات ۲۷۸، قیمت ۲۰۰ روپے

○○○

وحید عشرت، ڈاکٹر

(۱۹۴۲ء۔۲۰۰۹ء)

ڈاکٹر وحید عشرت ماہر اقبالیات، ماہر تعلیم ممتاز نقاد اور محقق کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ وحید عشرت ۱۹۴۲ء کو نارووال میں پیدا ہوئے۔ وہ اقبال اکادمی لاہور کے ڈپٹی ڈائریکٹر بھی رہے۔ پنجاب یونی ورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۴ء کے دوران نوائے وقت لاہور سے وابستہ رہے اور ۲۰۰۶ء تا دمِ آخر اقبال انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ میں بطور ریسرچ سکالر کام کیا۔

ڈاکٹر وحید عشرت کا شمار نہ صرف ممتاز صحافیوں میں ہوتا بلکہ وہ ماہرین اقبال کی صف میں بھی شامل رہے۔ مختلف اخبارات میں صحافتی علمی و ادبی خدمات کے علاوہ اقبال اکادمی کے لیے بھی انھوں نے قابل ستائش خدمات انجام دیں۔ وہ روزنامہ ''صداقت'' اور روزنامہ ''نوائے وقت'' میں خدمات انجام دیتے رہے۔ حالات حاضرہ، علمی و تحقیقی، اور ادبی کالم نویس کی حیثیت سے بھی ان کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ نو آموز لکھاریوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی ان کا خاص وصف رہا۔ بیماری نے انھیں ہم سے جدا کر دیا لیکن وہ ہمارے دلوں سے دور نہیں ہیں۔ فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں پر انھوں نے بہت سا تحقیقی کام کیا ہے۔ وہ ۱۹۷۶ء سے ۱۹۷۸ء تک اقبال اکادمی سے وابستہ رہے۔ وہ پھر دوبارہ ۱۹۸۴ء میں اقبال اکادمی میں تحقیقی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے بارے میں مرتبہ کتب بھی انھیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں۔ ڈاکٹر وحید عشرت کو علامہ محمد اقبال سے اس لیے بھی عقیدت ہے کہ وہ بھی اقبال کی طرح سیال کوٹ میں پیدا ہوئے اور

حصولِ تعلیم کے لیے لاہور آ گئے۔ وحید عشرت کو بھی حصول علم کے لیے لاہور آنا پڑا۔ جس طرح علامہ اقبال نے ایم اے فلسفہ کیا اور بعدازاں فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اسی طرح وحید عشرت نے بھی دونوں ڈگریاں حاصل کیں۔

ان کی کتب درج ذیل ہیں:

''پاکستانی ثقافت کی تشکیل''، ''فلسفہ کیا ہے''، ''علامہ اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم کے نظریات عمرانی'' (مقالہ پی ایچ ڈی، ۱۹۸۴ء) ''اقبال کا نظریۂ پاکستان''، ''نظریہ اور ادب'' اور ''اقبال فلسفیانہ تناظر میں'' (۲۰۰۹ء)۔ انھوں نے خطبات اقبال کا ترجمہ ''تجدید فکریات اسلام'' (۲۰۰۲ء) کے نام سے کیا۔ ڈاکٹر وحید عشرت نے ہر خطبہ سے پہلے اس کی روح پیش کر دی ہے۔ اردو حوالہ جات، تعلیقات اور تفہیم نے ڈاکٹر وحید عشرت کی کاوشوں کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ قبل ازیں خطبات کی تفہیم کے حوالے سے بہت کچھ اسی کتاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کی انفرادیت ڈاکٹر وحید عشرت اور ڈاکٹر عبدالخالق کی باہمی آہنگی اور فن ترجمہ کی عکاس ہے۔ ''تجدید فکریاتِ اسلام'' عصرِ حاضر کے مسائل حل کرنے کی طرف ڈاکٹر علامہ اقبال کے خطبات کی بہترین تفہیم ہے۔ ڈاکٹر وحید عشرت آج اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اُمتِ مسلمہ کے لیے ان کی یہ کتاب نہ صرف رہنمائی کا باعث ہے بل کہ وحید عشرت کو زندہ رکھنے کا ذریعہ بھی ہے۔ ڈاکٹر وحید عشرت ۲۰۰۹ء میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔

ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

فکریاتِ اقبال

پبلشر: سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، اشاعت ۲۰۰۹ء صفحات ۳۶۸، قیمت ۷۵۰ روپے

تجدید فکریاتِ اسلام

علامہ محمد اقبال کے انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ

پبلشر: محمد سہیل عمر، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت ۲۰۰۷ء، صفحات ۲۹۰، قیمت ۲۰۰ روپے

ooo

وحید قریشی، ڈاکٹر

(۱۹۲۵ء۔۲۰۰۹ء)

اُردو اور پنجابی زبان و ادب کے ممتاز نقاد، دانش ور، ماہر اقبالیات اور ماہر تعلیم ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۲۵ء میں میانوالی میں پیدا ہوئے۔ میٹرک اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور سے ۱۹۴۰ء میں کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے فارسی میں آنرز کی ڈگری لینے کے بعد تاریخ میں ایم اے کیا، ۱۹۵۲ء میں فارسی شاعری پر پی ایچ ڈی مکمل کی اور میر حسن کی زندگی اور کام پر اردو میں ڈی لٹ کیا۔ بچپن سے ہی انھیں کتب بینی کا شوق تھا اور زمانہ طالب علمی میں اپنا کتب خانہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ ان کے پاس ایک وسیع لائبریری موجود رہی۔ وہ ۱۹۶۲ء میں پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں لیکچرر تعینات ہوئے۔ پھر اسی کالج میں ۱۹۸۰ء میں پرنسپل کے عہدہ جلیلہ پر براجمان ہوئے۔ انھوں نے صدر شعبہ اردو، ڈین کلیہ علوم اسلامیہ و ادبیات شرقیہ، پنجاب یونی ورسٹی کے طور پر بھی برسوں کام کیا۔ جب پنجاب یونی ورسٹی میں شعبہ پنجابی کا قیام ہوا (۱۹۷۰ء) تو وہ اس کے پہلے انچارج مقرر ہوئے اور کئی سال تک پنجابی تدریس میں شامل رہے۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کے کئی مقالات کی نگرانی کی۔ اس سے قبل پنجابی ادبی بورڈ (رجسٹرڈ) کے صدر بھی بنے۔ اس دور میں عبدی قیصر شاہی کی کتاب ''بازنامہ'' مدون کر کے ۱۹۶۳ء میں شائع کی۔ ڈین کلیہ علوم اسلامیہ و ادبیات شرقیہ سے مجلّہ ''تحقیق'' کا اجراء ۱۹۷۸ء میں کیا۔ اورینٹل کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے اورینٹل کالج میگزین کے مدیر رہے۔ اس میگزین کو معیاری اور مقبول بنانے کے لیے انھوں نے بہت کوشش کی۔ کئی ناقدین کے مضامین بھی حاصل کیے۔ مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین بھی رہے۔ انھوں نے اس حیثیت میں

بہت سے مقالے اور تکنیکی کتب شائع کروائیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۴۰ء کی دہائی کے اواخر میں ادبی اُفق پر اچانک نمودار ہوئے جب انھوں نے "شبلی کی حیاتِ معاشقہ" لکھی اس کتاب میں شبلی نعمانی کو فرائیڈ کی تھیوریز کی روشنی میں اور بطور انسان دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ اس کتاب پر بہت سے ناقدین نے واویلا مچایا، ان میں عطیہ فیضی بھی شامل تھیں۔ وحید قریشی نے اپنی وسیع لائبریری گورنمنٹ کالج لاہور کو عطیہ کردی۔ وحید قریشی ۲۰۰۹ء کو انتقال کر گئے۔

ان کی کتاب "شبلی کی حیات معاشقہ" نے بہت شہرت عطا کی۔ ان کی کتب کی تعداد بہت زیادہ ہے چند ایک یہ ہیں " کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ"، "نذر غالب"، "تحریکِ پاکستان کے ثقافتی عوامل"، "جدیدیت کی تلاش میں"، "میر حسن اور ان کا زمانہ"، "اردو نثر کے میلانات"، "مقالاتِ تحقیق"، "جدیدیت کی تلاش"، "اساسیات اقبال"، "اردو ادب کا ارتقاء"۔ فارسی کتب میں "نامہ عشق"، "ارمغانِ ایران"، "تاریخی کتب میں: ارمغانِ لاہور"، " قائداعظم اور تحریکِ پاکستان" اور " قومیت کی تشکیل" شامل ہیں۔

حکومتِ پاکستان نے انھیں ۱۹۸۴ء میں نیاز فتح پوری ایوارڈ، ۱۹۸۶ء میں طفیل ایوارڈ، ۲۰۰۳ء میں اقبال ایوارڈ اور ۱۹۹۳ء میں صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی دیا۔

ڈاکٹر وحید قریشی قوتِ اشراق کے مالک تھے۔ وہ علم وفضل کی ایک تحریک اور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کی شخصی عظمت اور علم وفضل کی رفعت مسلمہ ہے .... مجھے ان سے بارہا ملنے کا اتفاق ہوا اور ہر مرتبہ ان کی شخصیت کا ایک نیا گوشہ سامنے آیا۔ وہ ہمدرد، ملنسار اور محبّت کرنے والی شخصیت تھے۔ قومی زبان کا فروغ ان کا "پرچم" رہا جسے وہ ہر روز افکارِ اقبال کے سایہ تلے ملی وقومی جذبوں کے ساز پر لہراتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے روز وشب اُردو اور فکرِ اقبال کے فروغ میں ہی گزرتے۔ وہ بیدار دل پیری ہی نہیں بل کہ سدابہار جوان ہیں وہ بے مہری ایام سے بے نیاز و بے منت غیر ہو کر بینائے کو اکب ثابت ہوئے۔ اقبال سے انھیں اتنا ہی عشق ہے، جتنا فرہاد کو شیریں، مجنوں کو لیلیٰ سے تھا۔ وہ دوستوں کے لیے (جگر لالہ میں جس سے ٹھنڈک ہو وہ شبنم) رقیبوں کے لیے (دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں) تھے .... ان کی شخصیت میں اقبال کی غزل کی طرح مٹھاس اور روانی تھی اور گفت گو میں اقبال کے خطوط جیسی گہرائی اور جولانی ان کی باتوں کا انداز اقبال کی مثنوی جیسا تھا۔ وہ ادبی حریفوں کو اقبال کے سیاسی رویوں سے شکست دیتے ہیں۔ اور اقبال کی نثر

کی طرح مقصدیت کے حصول کے لیے پند ونصائح سے کام لیتے ہوئے اپنا اقبال بلند رکھتے۔ وہ میدان علم وادب میں سراب رنگ و بونہیں ہیں بل کہ سر بکف مجاہد تھے وہ ادب کی پٹڑی پر سریع السیر تھے وہ سطوت رفتار دریا تھے۔

ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

منشوراتِ اقبال

پبلشرز: بزم اقبال کلب روڈ لاہور، اشاعت دوم مارچ ۱۹۸۸ء صفحات ۱۳۶ قیمت ۳۵ روپے

منتخب مقالات (اقبال ریویو)

پبلشرز: اقبال اکادمی پاکستان لاہور، اشاعت: مارچ ۱۹۸۳ء، صفحات ۲۱۸، قیمت ۴۵ روپے

اساسیاتِ اقبال

پبلشرز: محمد سہیل عمر، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، اشاعت: طبع اول ۱۹۹۶ء، طبع دوم ۲۰۰۳ء، صفحات ۳۱۲، قیمت ۲۵۰ روپے

اقبال شناسی اورمحور (انتخابِ مضامین)

ناشر: بزم اقبال، ۲ کلب روڈ، لاہور، طبع اول: فروری ۱۹۸۹ء صفحات: ۲۰۴، قیمت: ۲۵ روپے

علامہ اقبال کا تصوّر ریاست اور دوسرے مضامین

ناشر: پروفیسر محمد حنیف شاہد، بزمِ اقبال، لاہور، اشاعت: ۲۰۱۴ء، صفحات: ۱۷۸، قیمت: ۳۰۰ روپے

OOO

وزیر آغا، ڈاکٹر

(۱۹۲۲ء۔۲۰۱۰ء)

برعظیم پاک و ہند کے نامور نقاد، انشائیہ نگار، شاعر اور محقق ڈاکٹر وزیر آغا ۸۸ سال ۳ ماہ اور ۲۰ دن علم و آگہی کی روشنی بکھیرتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ علم و دانش کا یہ آفتاب ۱۸ مئی ۱۹۲۲ء کو طلوع ہوا اور لاکھوں اذہان منور کرتا ہوا ۷ ستمبر ۲۰۱۰ء بمطابق ۲۷، ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ بروز منگل رات تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ انھیں ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں ۸ ستمبر ۲۰۱۰ء، ۲۸ رمضان المبارک بروز بدھ اُن کے آبائی گاؤں وزیر کوٹ ۵۶ جنوبی میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے دادا کا نام حاجی آغا وزیر علی خان تھا، جنھوں نے یہاں زمین خریدی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے والدِ گرامی آغا وسعت علی خان نے اس جنگل کو منگل میں تبدیل کر کے ایک بستی بسائی، جس کا نام وزیر کوٹ رکھا گیا اور آج بھی اسی نام سے قائم دائم ہے۔ آغا وسعت علی خان، دین دار، نیک سیرت اور تصوف سے شغف رکھتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نجی محافل میں بتایا کرتے تھے کہ کبھی کبھی مولانا صلاح الدین احمد اور پروفیسر حمید احمد خاں وہاں پہنچتے اور میرے والد کے پاس بیٹھ کر ان سے تصوف کے مسائل پر استفادہ کرتے۔ آغا وسعت علی خان کے مشاہدے کی وسعت ان کے مطالعہ اور تجربات سے ظاہر ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے ابتدائی تعلیم سرگودھا، سلانوالی اور ساہیوال کے قصباتی مدارس سے حاصل کی۔ انھوں نے ۱۹۳۷ء میں میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۱ سرگودھا سے پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج جھنگ سے ۱۹۳۹ء میں ایف اے کیا۔ انھوں نے کالج بھر میں اول پوزیشن حاصل

کی۔ایف اے کے بعد وہ لاہور تشریف لے آئے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۴۱ء میں بی اے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ بعدازاں اسی تعلیمی ادارہ سے ۱۹۴۳ء میں ایم اے معاشیات کیا۔ سوموار ۱۸/اپریل ۱۹۴۹ء کو وزیر آغا رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے۔ان کی شادی مرزا انور علی کی بیٹی صفیہ آغا سے انجام پائی۔ بارات نے وزیر کوٹ کی گلیوں میں ایک کونے سے دوسرے کونے کا سفر کیا اور دلہن ان کے گھر آ گئی۔اتوار ۵/اکتوبر ۱۹۵۲ء کو مینا (وقار النساء) بیٹی اور ۲۲ نومبر ۱۹۵۶ء کو فرزند سلیم آغا قزلباش پیدا ہوئے۔وقار النساء کی شادی ملک زوار علی سے جنوری ۱۹۷۴ء میں انجام پائی۔گھریلو مصروفیات کے باوجود وزیر آغا نے اپنا تعلیمی اور تخلیقی سفر جاری رکھا اور بفضل تعالیٰ ۱۹۵۶ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بعنوان ''اردو ادب میں طنز و مزاح'' حاصل کی۔ان کے نگران ڈاکٹر عبادت بریلوی تھے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے شاہد احمد دہلوی کے ادبی جریدہ ''ساقی'' میں نصرت آراء نصرت اور نصیر آغا کے فرضی ناموں سے لکھنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ کافی عرصہ جاری رہا۔ مدیر کے تصویر طلب کرنے پر نصرت آراء نصرت کا فرضی نام ڈھیر ہو گیا۔ ۱۹۴۶ء میں ان کی ایک نظم ''دھرتی کی آواز'' کو بے پناہ شہرت ملی۔ قیوم نظر نے ۱۹۴۶ء میں بہترین نظموں کے انتخاب میں ''دھرتی کی آواز'' کو بطور خاص شامل کیا۔ڈاکٹر وزیر آغا نے مولانا صلاح الدین احمد کے معروف ادبی جریدے ''ادبی دنیا'' میں اپنے اصلی نام سے لکھنا شروع کیا۔''ادبی دنیا'' نے ڈاکٹر وزیر آغا کی ادبی دنیا کو چار چاند لگا دیے۔اس جریدے میں شریکِ مدیر کے طور پر مولانا صلاح الدین احمد کے ساتھ کئی برس کام کیا۔مولانا صلاح الدین احمد ۱۴جون ۱۹۶۴ء کو وفات پا گئے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے ۱۹۶۶ء میں عہد ساز ادبی جریدہ ''اوراق'' کا اجراء کیا۔جو ۲۰۰۶ء تک جاری رہا۔ڈاکٹر وزیر آغا برِ عظیم پاک و ہند میں ہی مقبول نہ تھے بل کہ پوری ادبی دنیا میں اپنی ایک خاص پہچان رکھتے تھے۔''اوراق'' کی پیشانی پر ہمیشہ ''مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں'' لکھا رہا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا مولانا صلاح الدین احمد سے والہانہ محبت کا یہ ایک خاص انداز تھا۔ڈاکٹر وزیر آغا نے ''اوراق'' کے ذریعے جدید اردو نظم اور اردو انشائیہ کی تفہیم کا سلسلہ شروع کیا۔انھوں نے ایک نہیں بل کہ دو تین نسلوں کی تربیت کی ہے۔انھوں نے نئے لکھنے والوں کے ساتھ ہمیشہ مخلصانہ رویہ رکھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی شخصیت کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ حوصلہ افزائی کرنے میں وسیع الظرف تھے۔ان

کی تخلیقات کو نہ صرف ''اوراق'' کی زینت بنایا بل کہ ان کی تربیت بھی کی اور یہ سلسلہ تا دمِ مرگ جاری رہا۔ حیرت کی بات ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا ۸۸ سال کی عمر میں بھی نئی نظم لکھ رہے تھے۔ ان کے تخلیقی سوتے ماند نہیں پڑے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا ادبی خزانہ تقریباً ۶۰ تصانیف پر مشتمل ہے۔ دنیا کی تقریباً بارہ زبانوں میں ان کی تخلیقات کے تراجم منظر عام پر آ چکے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے وصال سے جو خلا پیدا ہو چکا ہے ان کی تخلیقات اس خلا کو پر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا قاری کے ذہن میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کا شعری سرمایہ کچھ یوں ہے: ''شام اور سائے (۱۹۶۴ء) دن کا زرد پہاڑ (نظمیں ۱۹۶۹ء) غزلیں (۱۹۷۳ء) نردبان (نظمیں ۱۹۷۹ء) آدھی صدی کے بعد (طویل نظم ۱۹۸۱ء) گھاس میں تتلیاں (غزلیں نظمیں ۱۹۸۵ء) اک کتھا انوکھی (نظمیں، غزلیں ۱۹۹۰ء) یہ آواز کیا ہے (نظمیں، غزلیں ۱۹۹۵ء) عجب اک مسکراہٹ (نظمیں ۱۹۹۸ء) چنا ہم نے پہاڑی راستہ (نظمیں ۱۹۹۹ء) چھج تاریاں دا (پنجابی مجموعہ ۲۰۰۰ء) ہم آنکھیں ہیں (نظمیں ۲۰۰۱ء) واجاں باجھ وچھوڑے (پنجابی شعری مجموعہ ۲۰۰۳ء) دھنک پھیل گئی (نظمیں ۲۰۰۳ء) چٹکی بھر روشنی (نظمیں ۲۰۰۵ء) ہوا تحریر کر مجھ کو (نظمیں ۲۰۰۹ء) کاسۂ شام (نظمیں ۲۰۱۱ء)'' ڈاکٹر وزیر آغا کی فکر و فلسفہ پر اولین کتاب ''مسرت کی تلاش'' ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا ایک نقاد کی حیثیت سے عالمی ادب میں اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کا تنقیدی سرمایہ کچھ یوں ہے۔ ''اردو ادب میں طنز و مزاح (۱۹۵۸ء) نظم جدید کی کروٹیں (۱۹۶۳ء) اردو شاعری کا مزاج (۱۹۶۵ء) تنقید اور احتساب (۱۹۶۸ء) تخلیقی عمل (۱۹۷۰ء) نئے مقالات (۱۹۷۲ء) تنقیدی اور مجلسی تنقید (۱۹۷۶ء) تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں (۱۹۷۷ء) نئے تناظر (۱۹۷۹ء) دائرے اور لکیریں (۱۹۸۶ء) تنقید اور جدید اردو تنقید (۱۹۸۹ء) انشائیہ کے خدوخال (۱۹۹۰ء) ساختیات اور سائنس (۱۹۹۱ء) مجید امجد کی داستان محبّت (۱۹۹۱ء) غالب کا ذوق تماشہ (۱۹۹۷ء) معانی اور تناظر (۱۹۹۸ء) امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر (۲۰۰۶ء) کلچر کے خدوخال (۲۰۰۹ء)''

ڈاکٹر وزیر آغا کی چند کتابوں کے بارے میں کچھ آگاہی بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی غزلوں کی کلیات ''چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل'' ہے، جسے اضافے کے ساتھ اظہار سنز لاہور نے شائع کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی اردو غزل میں نئے استعارے، نئی تراکیب اور علامتوں کا استعمال

ملتا ہے جو اس سے قبل خال خال ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

''شام اور سائے (نظمیں)''، ''دن کا زرد پہاڑ (نظمیں اور غزلیں)''، ''نردبان'' (نظمیں)، گھاس میں تتلیاں (غزلیں اور نظمیں، ''اک کتھا انوکھی (نظمیں و غزلیں)''، ''چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل (کلیاتِ نظم)، ''یہ آواز کیا ہے (نظمیں)، ''عجب اک مسکراہٹ (نظمیں)، ''، ''چنا ہم نے پہاڑی راستہ (نظمیں)''، ''ہم آنکھیں ہیں (نظمیں)''، ''دیکھ دھنک پھیل گئی (نظمیں)''، ''چٹکی بھر روشنی (نظمیں)۔ ان تمام کتابوں میں وزیر آغا کی نظم نگاری کے خدوخال واضح ہوتے ہیں۔ ان کی نظموں کے اندر چھپے ہوئے کوڈز کو تلاش کرتے ہی تمام نظمیں کھلنی شروع ہو جاتی ہیں اور قاری وزیر آغا کی نظموں کے دیار میں داخل ہو جاتا ہے۔ وزیر آغا کی نظمیں بین الاقوامی مسائل کو بھی اجاگر کرتی دکھائی دیتی ہیں اور اندر کے تمام اسرار بھی بیان کر رہی ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے جہاں اردو شاعری کی وہاں انھوں نے اپنی ماں بولی پنجابی کو فراموش نہیں کیا۔ انھوں نے پنجابی زبان وادب کی خدمت بھی کی ہے۔ ان کی دو کتابیں ''چھج تاریاں دا'' اور ''واجاں باجھ وچھوڑے'' شامل ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی رومانوی نظموں کا ایک خوب صورت انتخاب محترمہ نجمہ منصور نے مرتب کیا۔ جس کا نام ''برکھا بھیگے خوابوں کی'' رکھا گیا۔ کتاب میں اُن کی تمام نظموں میں سے رومانوی نظموں کو اکٹھا کر کے شائع کر دیا گیا۔ اسی طرح ان کی نظموں کا ایک انتخاب فیصل ہاشمی نے بھی ''مگر ہم عمر بھر پیدل چلے'' کے عنوان سے کیا ہے۔

''پگ ڈنڈی سے روڈ رولر تک'' وزیر آغا کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ وزیر آغا نے صنف انشائیے کو متعارف کروانے کے سلسلہ میں اپنے معروف ادبی جریدے ''اوراق'' میں افہام و تفہیم کا سلسلہ شروع کیا۔ انشائیہ، ڈاکٹر وزیر آغا کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ان کی انشائیہ نگاری پر پاکستان اور پاکستان سے باہر بہت سا تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ انشائیہ نویسی کے حوالے سے ان کی معروف کتب میں ''خیال پارے''، ''چوری سے یاری تک''، ''دوسرا کنارہ''، ''سمندر اگر میرے اندر گرے''، ''پگ ڈنڈی سے روڈ رولر تک (کلیات) ۱۹۸۵ء ''پگ ڈنڈی'' ۲۰۱۰ء (کلیات) شامل ہیں متفرق کتب میں ''شام دوستاں آباد''، ''شام کی منڈیر سے (خودنوشت)''، تین سفر (احوال سفر)'' شامل ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے تنقید کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ انھوں نے تنقید کے حوالے سے متعدد کتابیں لکھیں جن میں ''اردو ادب میں طنز و مزاح''،

''نظم جدید کی کروٹیں''، ''اردو شاعری کا مزاج''، ''تنقید اور احتساب''، ''نئے مقالات''، ''تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں''، ''نئے تناظر'' ''تخلیقی عمل'' ''تنقید اور مجلسی تنقید''، ''دائرے اور لکیریں''، ''تنقید اور جدید اردو تنقید''، ''انشائیہ کے خدوخال''، ''مجید امجد کی داستان محبت''، ''ساختیات اور سائنس''، ''دستک اس دروازے پر''، ''غالب کا ذوق تماشا''، ''معنی اور تناظر'' شامل ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی اقبال شناسی کے بارے میں راقم الحروف (ہارون الرشید تبسّم) کی ایک نہایت عمدہ کتاب ''ڈاکٹر وزیر اقبال بطور اقبال شناس'' زیور طباعت سے آراستہ ہوگئی ہے۔ کتاب میں ڈاکٹر وزیر آغا کی اقبال شناسی کو موضوع بحث بنایا ہے اور اس سلسلہ میں ڈاکٹر وزیر آغا کے لکھے ہوئے مضامین کو مختلف کتابوں اور رسائل میں سے ڈھونڈ نکالا ہے جو لائبریریوں کی الماریوں میں مقفل پڑے تھے اور شاید آئندہ چند برسوں میں دیمک کی نذر ہو جاتے۔ ان تمام مضامین کو نہ صرف تلاش کیا بلکہ انہیں ایک نہایت خوبصورت کتاب کی صورت میں یکجا کر کے بہت بڑی علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے۔ موضوع ڈاکٹر وزیر آغا بطور اقبال شناس پہلی مرتبہ سامنے آیا ہے۔ جس کے صفحات ۲۸۵ تاریخ اشاعت: ۷ ستمبر ۲۰۱۴ء، یہ کتاب معروف اشاعتی ادارے بک کارنر جہلم نے شائع کی جس کی قیمت ۴۸۰ روپے ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے مختلف رسائل و جرائد میں منتشر اقبالیاتی مضامین اس میں شامل ہیں۔ ان کی اقبالیات کے حوالے سے اہم کتاب کا تعارف یہ ہے۔

ان کی اقبالیاتی کتاب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

"تصوّراتِ عشق وخرد" (اقبال کی نظر میں)

ناشر: اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، اشاعت: طبع اول ۱۹۷۷۔ اشاعت: طبع ثانی ۱۹۸۷ء صفحات: ۲۵۶، قیمت: ۵۰ روپے

ooo

وقار عظیم، پروفیسر، سید
(۱۹۱۰ء۔ ۱۹۷۶ء)

سید وقار عظیم اردو کے ممتاز نقاد، شاعر اور افسانہ نگار تھے۔ ان کے خاندان کا تعلق گنگوہ (یو پی) کے قریب ایک قصبے انبیٹھ سے تھا۔ وقار عظیم الٰہ آباد میں ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے کیوں کہ ان کے والدِ گرامی سید مقبول عظیم بسلسلہ ملازمت پولیس الٰہ آباد میں مقیم تھے۔ ۱۹۱۶ء میں سید مقبول عظیم کا تبادلہ کانپور میں ہو گیا، وہیں سید وقار عظیم نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پہلے ماں سے اکتساب فیض کرتے رہے اور ایک پنڈت سے بھی اکتساب علم کرتے رہے۔ پھر انھیں مقامی سکول میں داخل کرایا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں ان کے والد کا تبادلہ اناؤ ہو گیا تو انھیں بھی اناؤ کا رخ کرنا پڑا۔ اناؤ میں گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل ہوئے۔ یہیں انھیں لکھنے اور پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۳۲ء کو لکھنؤ یونی ورسٹی سے بی اے اور ۱۹۳۴ء میں الٰہ آباد یونی ورسٹی سے ایم اے اردو کی سند حاصل کی۔ قیامِ الٰہ آباد کے دوران ان کی دو معروف کتب منصۂ شہود پر آئیں ''ہمارے افسانے'' اور ''اردو افسانہ نگاری''

نامساعد حالات کی وجہ سے ڈاکٹریٹ کا منصوبہ ادھورا چھوڑ کر ملازمت کے چکروں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ پہلی تقرری ۱۹۳۸ء میں بحیثیت استاد اردو جامعہ ہائی سکول، دہلی میں ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں ''آج کل'' کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ کراچی تشریف لے آئے۔ حکومت پاکستان نے بھی ۱۹۴۸ء میں ''آج کل'' کے انداز کا ماہنامہ ''ماہ نو'' جاری کیا اور اس کی ادارت کے فرائض سید وقار عظیم کے ذمہ لگائے گئے۔

۱۹۵۰ء میں یہاں پنجاب یونی ورسٹی اور ینٹنل کالج میں اردو کی لیکچررشپ مل گئی او رتقریباً ۲۰ برس وہاں پڑھاتے رہے۔ وہ پروفیسر کے عہدتک پہنچے اور ۱۹۶۱ء میں کالج کے پرنسپل تعینات ہوئے۔ ۱۹۷۰ء میں ریٹائرمنٹ لی۔ وہ ''آج کل''، ''ماہ نو'' اور ''نقوش'' کے مدیر رہے۔ سو سے زائد کتب تصنیف کیں۔

معروف نقاد، ماہر تعلیم اور ادیب پروفیسر سید وقار عظیم نے اقبال کے بارے میں اُن کے معاصرین کی ایسی تحریریں اکٹھی کی ہیں، جو انھوں نے اقبال کی زندگی ہی میں لکھی تھیں اور جن پر علامہ نے اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔

''اقبال معاصرین کی نظر میں'' سید وقار عظیم کی کامیاب کاوش ہے جس میں اقبال کی ہمہ جہت شخصیت کے بہت سے پہلوؤں سے پردہ اٹھایا ہے۔

''اقبال شاعر اور فلسفی'' سید وقار عظیم کی کتاب ہے جس میں انھوں نے اسی مسئلے کو موضوع قلم بنایا ہے۔ کتاب ان کے ۱۷ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان تمام مضامین کا مقصد اقبال کو ایک بہترین فلسفی شاعر ثابت کرنا ہے۔ وہ ۱۹۷۶ء میں داغ مفارقت دے گئے۔ اقبالیاتی تحقیق میں ان کا نام ہمیشہ زندہ و جاوید رہے گا۔ ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

اقبال معاصرین کی نظرمیں

ناشر: مجلس ترقی ادب لاہور، اشاعت: طبع اول، دسمبر ۱۹۷۳ء، صفحات: ۵۴۳، قیمت: ۱۸ روپے

اقبال شاعر اور فلسفی

پبلشرز: ناظم اقبال اکادمی لاہور، اشاعت: طبع اول ستمبر ۱۹۶۸ء، طبع دوم ۱۹۷۵ء زیر تبصرہ ۱۹۹۷ء صفحات: ۳۲۸، قیمت: ۱۲۰ روپے

ooo

یوسف حسین خاں، ڈاکٹر

(۱۸۹۱ء۔۱۹۸۱ء)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں حیدر آباد میں ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوئے۔ اردو کے ممتاز نقاد کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ان کے آباء و اجداد کا تعلق قائم گنج، فرخ آباد سے تھا۔ اٹارہ (اتر پردیش) میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی اے کیا، فرانس چلے گئے اور تاریخ میں پیرس سے ڈی لٹ کی سند حاصل کر کے ہندوستان واپس آئے اور جامعہ عثمانیہ میں پہلے تاریخ کے ریڈر اور پھر اسی شعبہ کی صدارت پر فائز ہوئے۔ ایک عرصہ تک یہاں کام کرنے کے بعد مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے وابستہ ہوئے۔ دورانِ ملازمت یوسف حسین خاں کی تمام تر علمی توجہ کا مرکز زبان وادب، شاعری اور تاریخ رہی۔ زبان وادب کے ساتھ ان کا تعلق بڑے مضبوط رہا۔ حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں وہ وہاں کے علمی اور ثقافتی اداروں سے وابستہ رہا۔ ۱۹۷۹ء میں اس کی کتاب ''حافظ اور اقبال'' پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ دیا گیا۔ حکومت ہند نے پدم بھوشن کے خطاب سے سرفراز کیا۔ صنف غزل کی تنقید میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب ''اردو غزل'' کو عالم گیر شہرت نصیب ہوئی۔ ''رُوحِ اقبال'' اقبال کی فکر اور فن کا احاطہ کرتی ہے۔ انھوں نے مومن خان مومن پر بھی علمی اور تحقیقی کام کیا، حسرت کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی مضامین لکھے جو ''حسرت کی شاعری'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ ''یادوں کی دنیا'' کے عنوان سے آپ بیتی لکھی۔ ''فرانسیسی ادب کی تاریخ'' بھی قلم بند کی اور آخری عمر میں غالب کے کلام کا انگلش میں ترجمہ کیا۔

یوسف حسین خاں نے انگلش اردو لغات کے کام میں مولوی عبدالحق کی بھی بہت مدد کی

تھی۔ دارالترجمہ عثمانیہ کے لیے انھوں نے ''تاریخ ہند'' مرتب کی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے ۱۹۳۹ء تک کے زمانے کی ہندوستان کی تاریخ ہے۔ ''مبادی عمرانیات'' نامی کتاب فرانسیسی زبان سے براہِ راست ترجمہ ہے۔ ''غالب اور آہنگ غالب'' بھی ان کی نہایت اہم تصنیف ہے۔ جس میں غالب کے فکر وفن کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یوسف حسین خاں نے مومن خان مومن، حسرت موہانی، علامہ محمد اقبال، اسداللہ خان غالب اور تراجم کا جو کام کیا ہے وہ نا قابلِ فراموش ہے۔ ''حافظ اور اقبال''، میں یوسف حسین خاں نے حافظ اور اقبال کی شاعری کے مشترکہ اور اختلافی عناصر کا بھرپور تجزیہ کر کے ان کا موازنہ بہت مہارت سے پیش کیا ہے۔ یوسف حسین خاں نے بڑی نیک نیتی کے ساتھ دنیائے ادب کے دو عظیم شعراء کرام کو عصر حاضر میں پرکھا ہے۔ علامہ اقبال کی فارسی شاعری سے شناسائی اور حافظ شیرازی کے فارسی کلام کی گہرائی سمجھنے کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی ایک اور اہم کتاب ''رُوحِ اقبال'' ہے جسے پڑھ کر ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور ان کے انداز تنقید پر داد دینے کو بھی جی چاہتا ہے۔ انھوں نے اقبال کے فن پر بھی بات کی ہے اور فکر پر بھی، اگرچہ ان موضوعات پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن یوسف حسین خاں کی یہ تخلیقی تنقید اپنی مثال آپ ہے۔ اقبال کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی ان تمام یونی ورسٹیوں میں اسے پذیرائی حاصل ہے جہاں اردو اور اقبال کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کے درجنوں ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پاکستان اور ہندوستان میں اقبالیاتی تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے ہزاروں محققین اس کتاب سے استفادہ کر رہے ہیں۔ یوسف حسین خاں ۱۹۸۱ء میں ملک راہی عدم ہوئے۔ ان کی اقبالیاتی کتب کا حوالہ درج ذیل ہے۔

حافظ اور اقبال

پبلشرز: غالب اکیڈمی، نظام الدین، نئی دہلی، اشاعت: مئی ۱۹۷۶ء، صفحات ۴۲۲، قیمت ۳۵ روپے

روحِ اقبالؒ

پبلشرز: آئینہ ادب، چوک مینار انارکلی لاہور، اشاعت: ۱۹۸۴ء، صفحات ۴۷۸، قیمت ۵۰ روپے

OOO

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسّم کا اقبالیاتی سرمایہ

۱۔اقبال جو اقبال ہے

۱۹۹۲ء صفحات ۱۲۸، قیمت ۱۰۰ روپے، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور

فکرِ اقبال کے مختلف پہلوؤں پر مضامینِ تبسّم، مشاہیر کی آراء بھی شامل ہیں۔ان میں سے کئی ایک مضامین قومی اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

انتساب۔''باعمل شعراء وادباء کے نام۔۔۔۔۔پیغمبر ایک باعمل شاعر ہوتا ہے۔(اقبال)

۲۔حیاتِ اقبال کا سفر

۱۹۹۲ء صفحات ۲۰۸، قیمت ۶۰ روپے، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور

علامہ اقبال کے تخلیقی سفر کو ماہ و سال کے آئینہ میں پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر وحید قریشی کی خصوصی رائے کتاب میں شامل ہے۔اس تحقیقی کتاب کو بہت پذیرائی ملی۔

۳۔بیت بازی اقبالیات

جنوری ۱۹۹۴ء صفحات ۲۳۲ قیمت ۶۰ روپے، القمر انٹرپرائز، لاہور

ڈاکٹر علامہ اقبال کا کلام حروفِ تہجّی کے اعتبار سے مرتب کیا گیا۔انتساب۔

فطرت کو دکھایا بھی ہے، دیکھا بھی ہے تو نے
آئینہ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

۴۔علامہ اقبال بحیثیت اَدبی نقاد

۱۰ جنوری ۱۹۹۸ء صفحات ۲۲۴ قیمت ۱۸۰ روپے، بزم عمل و فن اسلام آباد

اقبال کے تخلیقی شعور کو بڑے احسن انداز سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس تحقیقی موضوع پر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے ایم فل کی ڈگری عطا کی ہے۔ تحقیق اعتبار سے اقبالیاتی ادب میں یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔ انتساب۔ ''ان لوگوں کے نام جو علامہ اقبال کی طرح انسانوں میں اچھائی تلاش کرتے ہیں۔''

۵۔خزینۂ اقبال

یکم جنوری ۲۰۱۳ء، صفحات ۲۸۸، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، قیمت ۴۰۰ روپے

علامہ محمد اقبال کی تمام تصانیف پر بھرپور انداز تجزیہ اور تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ''خزینہ اقبال'' میں علامہ محمد اقبال کی شاعری، نثر، خطوط، خطبات، اور دیگر نثری تحریریں جو کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں پر مربوط تجریاتی مطالعے شامل ہیں یوں اس کتاب کے مطالعہ سے قاری علامہ اقبال کی تمام کتابوں کی فہرست، اور ان کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ کتاب ایک ایسی لائبریری ہے جس میں اقبال کی تمام کتب کا عکس ملتا ہے۔

۶۔اقبال کے گوہر شہوار

۲۳ مارچ ۲۰۱۳ء، صفحات ۴۴۸، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، قیمت ۶۰۰ روپے

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے فکر وفن پر لکھی گئی ایک سو کتابوں کی فہرست اور ان پر بھرپور تبصرے پیش کیے گئے ہیں۔ مختلف موضوعات پر لکھی گئی کتابوں کا مکمل تعارف اور تبصرے قاری کو خوب آگاہی فراہم کرتے ہیں۔ کتاب ''اقبال کے گوہر شہوار'' منفرد نوعیت کی ہے۔ فکرِ اقبال کے مختلف گوشوں پر اقبال شناسوں کی لکھی گئی۔ ۱۰۰ کتب پر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسّم کے تجزیاتی تبصرے کتاب کی زینت ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے محبِ اقبال اقبالیات کی ۱۰۰ کتب سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ جسٹس جاوید اقبال، ڈاکٹر خورشید رضوی اور محمد سہیل عمر کی آراء بھی کتاب کا حصہ ہیں۔ یہ کتاب اقبالیاتی ادب میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہیں۔

۷۔اقبال اور سرگودھا

صفحات ۴۹۶، محمد ندیم، رانا پرنٹنگ پریس، لاہور، قیمت ۱۰۰۰ روپے

''اقبال اور سرگودھا'' بہت ہی عمدہ اور منفرد نوعیت کی کتاب ہے جو چاروں حصوں میں

منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں تاریخ سرگودھا اور ادبی تاریخ کے بارے میں مضامین رکھے گئے ہیں جبکہ دوسرے حصہ میں مختلف ماہرین اقبالیات کے لیے گوشے مختص کیے گئے ہیں۔ تیسرا حصہ افکار اقبال پر مشتمل ہے جس میں سرگودھا کے اہلِ قلم کے اقبال کے بارے میں اہم مضامین شامل ہیں جبکہ چوتھا اور آخری حصہ سرگودھا کے شعراء کا منظوم خراج تحسین ہے جو انھوں نے اقبال کے حضور پیش کیا ہے۔

۸۔قندیل اقبال

صفحات ۴۸۰، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، قیمت ۷۰۰ روپے

۳۷ مضامین پر مشتمل ''قندیل اقبال'' علامہ محمد اقبال کے ۷۶ ویں برسی ۲۱ راپریل ۲۰۱۴ء کے موقع پر منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور نے شائع کی ہے۔ آس کتاب کے کئی مضامین تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ اہم مضامین میں ''اقبال اور جدید علم الکلام''، ''اقبال اور یورپ کے علوم وفنون''، ''تحریکِ خلافت اور اقبال''، ''اقبال کا تصورِ ملت''، ''انجمن حمایتِ اسلام اور علامہ اقبال''، ''ہنری برگساں کا نظریہ زماں اور افکارِ اقبال''، ''عصر حاضر اور علامہ اقبال''، ''عورت اقبال کی نظر میں''، ''زلزلہ اکتوبر ۲۰۰۵ء کی شاعری کے تناظر میں'' اور ''اقبال شاعر فردا'' شامل ہیں۔ کتاب کے تمام مضامین ہی عمدہ اور معلومات افزا ہیں جو قاری کے اذہان کی کھڑکیاں کھول کر انھیں عمل پر اکساتے ہیں۔ اقبالیاتی ادب میں دونوں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گو ہر فردا''

۹۔ڈاکٹر وزیر آغا بطور اقبال شناس

صفحات: ۲۸۵ تاریخ اشاعت: ۷ ستمبر ۲۰۱۴ء

ناشر: بک کارنر شوروم بالمقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ جہلم پاکستان، قیمت ۴۸۰

''ڈاکٹر وزیر اقبال بطور اقبال شناس'' زیور طباعت سے آراستہ ہوگئی ہے۔ کتاب میں ڈاکٹر وزیر آغا کی اقبال شناسی کو موضوع بحث بنایا ہے اور اس سلسلہ میں ڈاکٹر وزیر آغا کے لکھے ہوئے مضامین کو مختلف کتابوں اور رسائل میں سے ڈھونڈ نکالا ہے جو لائبریریوں کی الماریوں میں مقفّل پڑے تھے اور شاید آئندہ چند برسوں میں دیمک کی نذر ہو جاتے۔ ان تمام مضامین کو نہ صرف تلاش کیا بلکہ

انہیں ایک نہایت خوبصورت کتاب کی صورت میں یکجا کر کے بہت بڑی علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے۔ موضوع ڈاکٹر وزیر آغا بطور اقبال شناس پہلی مرتبہ سامنے آیا ہے۔

۱۰۔ خورشید اقبال

صفحات: ۱۱۵۲، اشاعت ۲۵، ستمبر ۲۰۱۴ء، ناشر: بک کارنر جہلم پاکستان، قیمت ۲۴۰۰

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کے فکر و فن پر لکھی گئی ۳۶۵ کتابوں کا تحقیقی و توضیحی جائزہ ''خورشید اقبال'' میں شامل ہے۔ جائزہ کے لیے علاوہ ۳۶۵ کتابوں کی ابتدائی معلومات اور مکمل فہرست مضامین بھی کتاب کی زینت ہیں۔ اسے ناشر نے اقبالیات کا انسائیکلو پیڈیا قرار دیا ہے۔ اقبال پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

۱۱۔ ڈاکٹر ایوب صابر بطور اقبال شناس

صفحات: ۴۹۶، تاریخ اشاعت ۲۳ مارچ ۲۰۱۵ء، ناشر: بک کارنر جہلم پاکستان، قیمت: ۹۰۰

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسّم نے ڈاکٹر ایوب صابر کو ان کی ۷۵ ویں سالگرہ کے موقع پر زبردست انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ کتاب میں شامل ڈاکٹر ایوب صابر کے منفرد نوعیت کے مضامین اقبال شناسوں اور شعبہ اقبالیات کے محققین کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف ڈاکٹر ایوب صابر کی اقبال شناسی کا ایک آئینہ ہے بلکہ اقبالیاتی محققین کے لیے ذخیرہ تحقیق ہے۔ کتاب بارہ ابواب پر منقسم ہے۔ جن کی تفصیل یوں ہے۔ حیات و خدمات، ایوب صابر شاگردوں کی نظر میں، فکر اقبال پر ایوب صابر کا پہلا مقالہ، اردو زبان و ادب سے متعلق تصانیف کا مختصر تعارف، کتابچے، علامہ اقبال پر تصانیف، اقبال شناسوں کے تبصرے، قوسِ قزح، گفتگو ہے روبرو، یارانِ نکتہ داں، جواب آں غزل۔

۱۲۔ تقاریر اقبال

ناشر: بک کار جہلم اشاعت: ۶ ستمبر ۲۰۱۵ء، صفحات ۲۵۶، قیمت: ۴۸۰ روپے

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسّم کی تحریر کردہ فکرِ اقبال پر مشتمل اقبالیاتی تقاریر جو انھوں نے گاہے گاہے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علموں کے لیے لکھیں، ایک کتاب میں یکجا کر دی گئی ہیں۔ مختلف موضوعات پر مفصّل تقریریں ہر سکول اور کالج کے طالب علموں کی اولین ترجیح ہوتی ہیں۔ اس

نوعیت کی قبل ازیں کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی۔ ان تقریروں کو یکجا ایک کتاب میں پیش کر کے ڈاکٹر تبسم نے ایک بہت عمدہ کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ یہ تقاریر نو آموز مقررین اور مختلف سطح کے اردو مضامین کے لیے سودمند ہیں۔ انتساب: ''ان لفظوں کے نام جنھوں نے مجھے اعجاز نطق بخشا''

۱۳۔ زاہد منیر عامر مفکّر و اقبال شناس

ناشر: مقبول اکیڈمی لاہور اشاعت: ۲/اکتوبر ۲۰۱۶ء، صفحات ۸۰۰، قیمت: ۴۵۰۰ روپے

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا کمال یہ ہے کہ وہ ایسے ہیرے تلاش کرتے ہیں جنھوں نے اردو ادب میں کارہائے نمایاں انجام دیا ہو۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر بھی ایسے ہی نابغہ روزگار ہیں جنھوں نے بطور نقاد اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا، اقبالیات میں بھی لاتعداد تحقیقی مقالات تحریر کیے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے ان کے فکر و فن پر لکھے گئے اہم مقالہ جات کو یکجا کر دیا ہے۔ ۱۱۵ صفحات پر خود ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے زاہد منیر عامر کے کوائف اور دیگر معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ کتاب ڈاکٹر زاہد منیر عامر کی شخصیت اور فن کا مکمل طور پر احاطہ کرتی ہے۔ زاہد منیر عامر کے مختلف گوشوں کو منظر عام پر لاتی ہے۔

انتساب: ''اللہ کریم نے دماغ کو دل سے اونچی جگہ دی ہے۔ عظیم لوگ جذبات کو اپنے دماغ کے تابع رکھتے ہیں۔ کام کرنے کی لگن اور امنگ کا نام جوانی ہے جو نوجوان زاہد منیر عامر کی طرح اس عرصہ کو تعمیری انداز میں گزارتے ہیں ان کا بڑھاپا، ان پر بوجھ نہیں بنتا۔''

۱۴۔ ''ذخیرۂ اقبال''

ناشر: بک کارنر شوروم جہلم اشاعت: ۲۳ مارچ، ۲۰۱۷ء، صفحات: ۵۷، قیمت: ۸۰۰ روپے

''ذخیرۂ اقبال'' ایک ایسی کتاب ہے جس کے مطالعے سے ایک عام قاری حضرت علامہ محمد اقبال کی تمام کتب سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے۔ ''ذخیرۂ اقبال'' میں علامہ محمد اس کتاب کو ششم ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے اور دوسرے باب میں اقبال کی اردو اور فارسی شاعری کے مجموعوں کے علاوہ ان مجموعوں پر لکھی جانے والی کتب پر بھی تبصرے شامل کیے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں اقبال کی نثر کی کتابوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور ان نثری کتب پر لکھی جانے والی مزید کتابوں پر بھی تبصرے شاملِ کتاب ہیں۔ چوتھے باب میں علامہ اقبال کے چند سوانحی تذکروں پر مشتمل ہے۔ باب پنجم میں اقبالیاتی خطوط کی کتب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جب کہ ششم باب میں علامہ اقبال کی مرتب

کردہ نصابی کتب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی یہ کتاب اقبالیاتی کتب کا ایک ایسا خزانہ ہے جس کو ہر لائبریری میں موجود ہونا چاہیے۔ اس کتاب کی مدد سے اقبال کی مختلف کتابوں کے بارے میں معلومات لی جا سکتی ہے۔

انتساب: ☆ اپنی دعاؤں کے نتیجہ کے لیے بے صبری کا مظاہرہ نہ کیجئے اگر اللہ کریم پر یقین ہے تو وقت قبولیت پر بھی ایمان رکھیے۔

☆ رشتے کتاب کی طرح ہوتے ہیں جنھیں جلانے میں چند سیکنڈ لگتے ہیں لیکن لکھنے میں برس بیت جاتے ہیں لہٰذا رشتوں کو لکھتے رہیے اور انھیں جلنے سے بچائیے۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

۱۵۔ کائناتِ اقبال

ناشر: بک کارنر جہلم (نظریۂ پاکستان اکادمی سرگودھا) اشاعت: ۲۳ مارچ ۲۰۱۷ء، صفحات ۲۴۰

قیمت: ۴۸۰ روپے

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے تخلیقی سفر کی داستان کو نہایت سلیقے سے بیان کیا ہے۔ اس سارے تخلیقی سفر کو انھوں نے اقبال کے فرمودات، واقعات اور مکتوبات کے آئینے میں مکمل کیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم نے حضرت علامہ محمد اقبال کی پیدائش سے لے کر ان کی وفات تک کے سفر کو اس کتاب میں مقید کر دیا ہے۔ یہ کتاب حضرت علامہ محمد اقبال کی پیدائش سے وفات تک کی ایسی کہانی ہے جس کو ہر پاکستان کو پڑھنا چاہیے۔ اس میں علامہ کی سوانحی حیات، علامہ محمد اقبال کی زندگی کے ناقابل فراموش واقعات اور اہم فرمودات، مکتوبات جو انھوں نے قائداعظم محمد علی جناح کے نام لکھے درج ہیں۔ اس کے علاوہ علامہ محمد اقبال کے بارے معروضی انداز میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اقبالیات ادب میں یہ کتاب ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

انتساب۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی سحر خیزی کے نام جس نے انھیں حیات جاوید عطا کی۔

☆ حضرت شیخ نور محمد کی بصیرت اور حافظہ امام بی بی کے حسن پرورش کے نام جنھوں نے اپنے فرزند کو رزقِ حلال کی پاکیزگی عطا کی۔ ☆ شمس العلماء سید میر حسن کے نام جنھوں نے بحیثیت استاد اقبال کی علمی و عملی تربیت کی۔

۱۶۔ بیت بازی کلام اقبال

اشاعت: ۲۳ مارچ ۲۰۱۷ء، صفحات ۲۳۲، قیمت: ۳۸۰ روپے، ناشر: بک کارنر جہلم

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے حضرت علامہ محمد اقبال کے اردو کلام کو حروف تہجی کے اعتبار اردو اشعار کا انتخاب کر کے اسے طالبِ علموں کے لیے پیش کر دیا ہے۔ بیت بازی کی لاتعداد کتب مارکیٹ میں موجود ہیں مگر علامہ اقبال کے اشعار پر مشتمل پہلی بیت بازی کی کتاب مرتب کر دینا بہت بڑی علمی و ادبی خدمت ہے۔ معیاری اشعار کو نہایت سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔

انتساب۔ ☆خوب صورت ہے وہ دل جو کسی کے درد کو سمجھے۔ ☆خوب صورت ہے وہ احساس جو کسی درد کا مداوا بنے۔ ☆خوبصورت ہیں وہ ہاتھ جو کسی کو مشکل وقت میں تھام لیں ☆خوب صورت ہے وہ سوچ جو کسی کے لیے اچھا سوچے۔۔

۱۷۔ موضوعاتی کلام اقبال

اشاعت: ۲۳ مارچ ۲۰۱۷ء، صفحات ۴۱۶، قیمت: ۶۰۰ روپے، ناشر: بک کارنر جہلم

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے حضرت علامہ محمد اقبال کے اردو کلام سے موضوعاتی اشعار کو الگ الگ کر کے ترتیب دے دیا ہے۔ مختلف سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تقاریر، مضامین میں موضوع کے لحاظ سے اقبال کے اشعار ڈھونڈنا خاصا دقت طلب کام تھا۔ اس مشکل کام کا ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے نہایت آسان بنا دیا ہے۔ اب کسی کو کسی بھی موضوع کے حوالے سے اشعار ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ اس کتاب کی مدد سے قاری آسانی کے ساتھ اپنے موضوع کے مطابق اشعار تلاش کر سکتا ہے۔ ہارون الرشید تبسم ایک ایسے ادیب ہیں جو طالب علموں کے لیے آسانیاں پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یہ کتاب بھی نہایت اہم اور مفید ثابت ہوگی۔

انتساب۔ ہر انسان کے پاس لفظوں کا ذخیرہ ہوتا ہے لیکن ان کا مناسب استعمال اسے عقل مندی کے درجوں پر پہنچا دیتا ہے۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا اقبال بلند رکھنے میں لفظوں کا جائز استعمال کارفرما ہے۔

ابھی تو چند لفظوں میں سمیٹا ہے تجھے میں نے
ابھی میری کتابوں میں تیری تفسیر باقی ہے

۱۸۔ بہارِ اقبال

ناشر: بک کارنر جہلم (نظریۂ پاکستان اکادمی سرگودھا)

اشاعت: ۲۶ جون ۲۰۱۷ء، صفحات ۳۳۶، قیمت: ۱۰۰۰ روپے

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے اقبال پر لکھی ہوئی ۳۶۵ کتابوں پر تجریاتی مطالعوں پر مشتمل کتاب ''خورشید اقبال'' شائع کی تو ملک کے علمی وادبی حلقوں نے خوب سراہا اسی سلسلے کی یہ تازہ کتاب ''بہارِ اقبال'' کے نام سے منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب میں ''خورشید قبال'' کے بعد کی ۵۰ وصولہ کتب پر تجریاتی مطالعہ لکھ کر اسے کتابی صورت دے دی گئی ہے۔ پروفیسر ہارون الرشید تبسّم کی یہ کتاب بھی اقبالیاتی طالب علموں اور اقبالیاتی محققین کے لیے نہایت اہم اور مفید ثابت ہوگی۔ انھوں نے ۵۰ مختلف کتابوں پر تبصرے اور تجزیاتی مطالعے کر کے قارئین کے لیے اقبال فہمی کو آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

انتساب: ''ان اساتذہ کرام کے نام جو کمرۂ جماعت میں کلام اقبال نسل نو تک منتقل کر رہے ہیں۔

وقت اور حالات کے ساتھ ہر چیز بدل جاتی ہے حتیٰ کہ لوگ بھی، مگر انسانیت اور حسن خیالات نہیں بدلتے۔

۱۹۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بحیثیت اقبال شناس

اشاعت ۲۶ جون ۲۰۱۷ء، صفحات ۲۴۸، قیمت: ۱۰۰۰ روپے، ناشر: مقبول اکیڈمی، لاہور

ممتاز ماہر تعلیم، دانش ور، خادم اردو اور اقبال شناس جناب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا نام اردو ادب میں بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ انھوں نے تدریس اردو میں شہرت دوام حاصل کی ہے۔ ان کی زیر نگرانی ایم اے، ایم فل، اور پی ایچ ڈی کے متعدد مقالات پایۂ تکمیل تک پہنچ چکے ہیں۔ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کے فکر وفلسفہ پر ان کی بہت سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسّم چوں کہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے شاگرد ہیں اس لیے انھوں نے ''ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بحیثیت اقبال شناس'' تحریر کر کے ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کی تقریظ پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول نے تحریر کی ہے۔ ہارون الرشید تبسّم کے علاوہ ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر ایوب صابر، ممتاز عارف، ذوالفقار احسن کے تاثرات بھی کتاب کی زینت ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا

اقبالیاتی سرمایہ تجزیوں اور تبصروں کے ساتھ کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔اقبالیاتی ادب پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب انتہائی کارآمد ہے۔

انتساب۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی مادرِ علمی مرحوم گورنمنٹ کالج سرگودھا (سابق: ڈی مانٹ مورنسی کالج سرگودھا ۱۹۲۹ء۔۲۰۰۲ء) کی یاد میں......جس کی بنیادوں پر سرگودھا یونی ورسٹی قائم کی گئی۔مگر ''ہمارا خون بھی شامل ہے تزئینِ گلستاں میں'' کے مصداق یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد کو اس اعتراف کی توفیق کبھی نہیں ہوئی۔''

۲۰۔نویدِ اقبال

ناشر: بک کارنر جہلم (نظریہ پاکستان اکادمی سرگودھا)

اشاعت: ۱۰راگست ۲۰۱۷ء،صفحات ۴۰۰، قیمت: ۱۰۰۰روپے

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا نام اقبالیاتی ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انھوں نے اقبال کے تقریباً ہر پہلو کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔زیرِ نظر کتاب واقعی اقبال کی خوشبو ہے۔نویدِ لفظ ہی خوشبو میں معطر رہتا ہے۔اقبال کے فکر وفلسفہ پر مختصر لیکن جامع مضامین پر مشتمل یہ کتاب ڈاکٹر تبسم کی تفہیم اقبالیات کے لیے اہمیت رکھتی ہے۔فکرِ اقبال سے ہم آہنگ ۳۸ مضامین یکجا کر کے ڈاکٹر تبسم نے جہانِ اقبال سجایا ہے۔اقبالیاتی تقریر و مضامین میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔یہ کتاب طالب علموں کے لیے ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔کتاب کا ہر مضمون فکرِ اقبال کی خوشبو بکھیر رہا ہے۔

کتاب کا انتساب ملاحظہ ہو:

انتساب:

ڈگریاں درحقیقت تعلیمی اخراجات کی رسیدیں ہیں
ورنہ علم تو وہی ہے جو عمل سے ظاہر ہوتا ہے!
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں، نہ نوری ہے، نہ ناری ہے

زندگی کی تھکن میں وہ لفظ آج کل گم ہو گئے ہیں ﷺ جن لفظوں سے سکون ملتا تھا! یہ لفظ کلامِ اقبال میں تلاش کیجیے!

۲۱۔ ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت اقبال شناس

ناشر: مقبول اکیڈمی لاہور اشاعت: ۱۵ فروری ۲۰۱۸ء صفحات ۲۰۸، قیمت ۹۰۰ روپے

عالمی شہرت یافتہ نقاد، ماہر تعلیم، ماہرِ نفسیات، ماہر ادبیات، ماہرِ اقبالیات اور افسانہ نگار ڈاکٹر سلیم اختر بحیثیت اقبال شناس بسلسلہ ڈاکٹر علامہ اقبال کا ۱۴۰واں جشن ولادت (۱۸۷۷ء تا ۲۰۱۷ء) ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی نہایت شاندار کتاب منظر عام پر آئی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی اقبال شناسی کو سمجھنے اس کتاب اچھی اور کوئی کتاب نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کا ڈاکٹر سلیم اختر کو خراجِ تحسین ہے۔ کتاب میں ڈاکٹر سلیم اختر کا مکمل سوانحی تعارف دیا گیا ہے ان کی کتابوں سے آگاہی فراہم کی گئی ہے پھر ان کی اقبال شناسی کے حوالے کتابوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

انتساب: حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے جس راستے سے دریا پار کیا، فرعون اسی راستے پر غرق ہوا۔ انسان کو راستے نہیں رہبر بچاتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو تحقیق کے لیے وہ راستہ منور کیا ہے جو محققین کے لیے زادِ راہ ثابت ہوگا۔

۲۲۔ چند ہم عصر اقبال شناس

اشاعت: ۲۱ راپریل ۲۰۱۸ء، صفحات ۹۸۴، قیمت ۱۵۰۰ روپے، ناشر: بک کارنر شوروم جہلم

عظیم آدمی پارس کی طرح ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال کے ساتھ منسلک ہونے والے اقبال شناس بھی امر ہو گئے ہیں۔ اس کتاب میں ایسے اقبال شناس شامل ہیں جنھوں نے علامہ محمد اقبال کے فکر و فن پر کتابیں لکھیں ان تمام زندہ شخصیات کا تعارف شامل ہے یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے مطالعہ سے اقبال شناسوں کا سوانحی تعارف اور ادبی کارناموں سے آگاہی فراہم کی گئی ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی یہ نہایت عمدہ اور معلومات سے بھرپور کتاب ''چند ہم عصر اقبال شناس'' بڑی معلومات افزا ہے۔

انتساب: ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کی سحر خیزی کے نام............

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی
جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے، تو رہ جاتی ہے چنگیزی

☆ وقت کو پیدا کرنے والے کو وقت دے کر تو دیکھو وہ تمہارا وقت بدل دے گا۔

☆ جھوٹ کے درختوں پر چڑیاں لوٹ کر نہیں آتیں۔

☆ وقت، اعتبار اور عزت ایسے پرندے ہیں جو اڑ جائیں تو واپس کبھی نہیں آتے۔

☆ جو شخص انتقام کے طریقوں پر غور کرتا ہے اس کے زخم ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔

☆ آدمی اپنے اچھے اخلاق کی وجہ سے ان لوگوں کا مرتبہ پالیتا ہے جو راتوں کو عبادت کرتے ہیں اور دن کو روزے رکھتے ہیں۔

۲۳۔ فکرِ اقبال میں انسانی مسائل کا حل

ناشر: بک کارنر جہلم تاریخ اشاعت: ۲۶ جون ۲۰۱۸ء، صفحات ۲۴۰، قیمت ۶۰۰ روپے

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کی شاعری انسان، انسانیت، خودی اور درپیش مسائل کے گرد گھومتی ہے۔ تہذیب جدید آج جن مسائل میں گھری ہوئی ہے۔ اُن کی عکاسی اقبال ایک عرصہ پہلے کر چکے ہیں۔ طرزِ معاشرت، زندگی، لائحۂ عمل اور کشمکشِ انقلاب کے لیے اقبال کے عمیق افکار انسانیت کے لیے باعثِ رہنمائی رہیں گے۔ ہارون الرشید تبسم نے عصرِ حاضر میں انسانیت کو درپیش مسائل اور اُن کے حل کے بارے میں گیارہ مضامین سپردِ قلم کیے ہیں جو اس کتاب کی زینت ہیں۔ اپنی نوعیت کی یہ منفرد کتاب معاشرے کے سنجیدہ اور دردِ دل رکھنے والے طبقہ کے لیے رہنمائی کا باعث ہے۔

انتساب: ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کے حضور جنھوں نے انسانیت کو قرآن و سنت کا عالم گیر پیغام شعری سانچے میں عطا کیا۔

۲۴۔ ''عہدِ رفتہ کے ممتاز اقبال شناس''

مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۱۴راگست ۲۰۱۸ء، صفحات: ۳۳۶، قیمت: ۱۰۰۰روپے

۱۲۲ عہدِ رفتہ کے ممتاز اقبال شناس، اس کتاب کی زینت ہیں۔ خورشید اقبال میں ۳۶۵ کتابوں پر تبصرہ شامل تھا اس کتاب میں مصنفین، مرتبین اور مؤلفین کے حالات و خدمات پر توجہ دی گئی ہے۔

انتساب:

ندامت کے چراغوں سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
اندھیری رات کے آنسو بات کرتے ہیں

☆ اچھاوقت اُنھی کا ہوتا ہے جو کسی کا برا نہیں سوچتے۔

☆ صدقہ مصیبت کو قریب آنے نہیں دیتا لیکن ہم صدقہ مصیبت آنے کے بعد دیتے ہیں۔

☆ عہدِ رفتہ کے ممتاز اقبال شناسوں کا پیغام نسلِ نو تک پہنچانا ایک صدقہ جاریہ ہے۔

☆ دُعائیں دینے والے سے بڑھ کر کوئی سخی نہیں اور دعائیں سمیٹنے والے سے بڑھ کر کوئی خوش نصیب نہیں۔

۲۵۔ ''اقبالیات بچوں کے لیے''

مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۴راگست ۲۰۱۸ء، صفحات: ۲۰۸، قیمت: ۴۰۰روپے

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ نے بچوں کو بھی فراموش نہیں کیا۔ بچوں کو زندگی کے اعلیٰ اوصاف سکھانے کے لیے اُنھوں نے بہت سی نظمیں کہیں۔ اس کتاب میں اقبالؒ کی وہ اہم ترین نظمیں شامل ہیں جن میں اقبال نے بچوں اور جوانوں کو اہم پیغام دیے ہیں۔

انتساب:

☆ آپ کا اندازِ گفت گو آپ کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ یہ آئینہ تب زیادہ شفاف ہوتا ہے۔ جب آپ کی گفت گو اپنے مخالف کے متعلق ہو۔

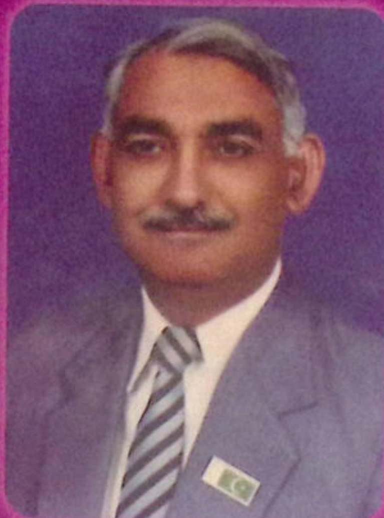
☆ کامیاب لوگ اپنے فیصلوں سے دنیا بدل دیتے ہیں اور کمزور لوگ دنیا کے ڈر سے فیصلے بدل لیتے ہیں۔

☆ بے زبانوں سے بھی ہمدردی کیجیے۔ یہ بغیر لفظوں کے دُعائیں دیتے ہیں۔

☆ دنیا کے ہر میدان میں ہار جیت ہوتی ہے۔ لیکن اخلاق میں کبھی ہار اور تکبّر میں کبھی جیت نہیں ہوتی۔

صبح کے تخت نشیں، شام کو مجرم ٹھہرے
ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا

ooo



پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

ولدیت : محمد ایوب مغل (۱۹۲۹ء۔ ۱۸ مارچ ۱۹۸۲ء)

تاریخ پیدائش : ۱/۲ اکتوبر ۱۹۵۵ء

پتہ رہائش : ۳۱۹ وائی علامہ اقبال کالونی سرگودھا

فون ۰۴۸-۳۷۱۱۷۱۷

میل : drharoonsgd@gmail.com

ریٹائرمنٹ : یکم اکتوبر ۲۰۱۵ء (گریڈ ۲۰)

سابق صدر شعبہ اردو

گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج سرگودہا

ایم فل (اقبالیات: ۱۹۹۳ء)

پی ایچ ڈی (اردو: ۲۰۰۲ء)

کتب : ادبی: ۹۰

نصابی: ۲۷

ذمہ داریاں : صدر: بزم علم و فن سرگودھا

صدر: نظریہ پاکستان اکادمی سرگودھا

صدر: پاکستان ادب اکادمی سرگودھا

چیئرمین: پاکستان لٹریری کونسل

جنرل سیکرٹری: سرگودھا رائٹرز اکیڈمی

ڈپٹی چیف وارڈن: سول ڈیفنس سرگودھا

کمپیئر: ریڈیو پاکستان سرگودھا

خواب : شہادت

اشاعت : ۱۴/ اگست ۲۰۱۸ء

Misaal
PUBLISHERS
misaalpb@gmail.com

9789695814314